MAULANA HABIBUR RAHMAN LUDHYANVI AUR UNKI TAHRIK AHRAR-E-ISLAM :- EK TARIKHI WA TAHQEEQI JAIZA

THESIS

SUBMITED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

In

ISLAMIC THEOLOGY

By

MOHD. IRFAN

Under the Supervision of

Prof. Zainus Sajidin Siddiqi

DEPARTMENT OF THEOLOGY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH
U.P. INDIA

2004

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
اوران کی تحریک احرار اسلام
ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ

تلخیص

مقالہ برائے
پی۔ ایچ۔ ڈی

مقالہ نگار
محمد عرفان

نگران:
پروفیسر زین الساجدین صدیقی

شعبۂ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۴ء

تلخیص

Maulana Azad Library
6236
Acc.

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی پیدائش ۳؍جولائی ۱۸۹۲ء مطابق ۱۱؍صفر ۱۳۱۰ھ کو لدھیانہ (پنجاب) کے محلّہ موچپورہ میں ہوئی، مولانا کا خاندان مجاہدوں کا خاندان رہا ہے، آپ کے جدامجد مولانا عبدالقادرؒ لدھیانوی، دادا مولانا مفتی محمدؒ صاحب اوران کے تینوں بھائی مولانا سیف الرحمٰنؒ، مولانا شیخ محمد عبداللہؒ اور مولانا عبدالعزیزؒ نے ۱۸۵۷ء کے جنگ آزادی میں حصہ لیا، اس لیے آپ کی پرورش و پرداخت بھی اسی انداز سے ہوئی، آپ کے والد محترم مولانا محمد زکریا صاحب علم وفضل میں اپنے زمانہ کے مایہ ناز عالم دین تھے۔ پنجاب کے اکثر وبیشتر علماء فہم حدیث اور فہم قرآن عزیز کے لیے حاضر ہوکر علمی فیض حاصل کیا کرتے تھے۔

مولانا محترم کی اولادوں میں سات صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔(۱) مولانا خلیل الرحمٰن، (۲) مولانا عزیز الرحمٰن (۳) مولانا انیس الرحمٰن (۴) مولانا محمد طیب صاحب (۵) مولانا محمد ازہر صاحب (۶) مولانا سعید الرحمٰن صاحب (۷) مولانا محمد احمد رحمانی صاحب (۸) رقیہ بیگم (۹) زبیدہ بیگم (۱۰) خاتون جنت (۱۱) بلقیس فاطمہ۔

مولانا کی اولادوں پر بھی خاندانی اثرات پوری طرح نمایاں تھے، یہی وجہ ہے کہ صاحبزادوں نے بھی ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ کی صاحبزادیاں بھی اپنے وقت کی عالمہ فاضلہ تھیں۔ آخرالذکر نے پاکستان کے قیام کے بعد وہاں کی سیاست میں حصہ لیا اور ایم پی رہ چکی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے عہد طالب علمی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور مدرسہ حقانی جہاں سے آپ نے اپنی تعلیم شروع کی اور ناظرہ قرآن، اردو فارسی کی کتابیں تیسری جماعت تک پڑھیں۔ یہ تعلیم آپ کے دادا مرحوم مولانا شاہ محمد صاحب کے زیر سرپرستی ہوئی۔

دوسرا دور وہ ہے جب آپ جالندھر کے ایک عربی مدرسہ میں پڑھنے کے لیے گئے، مدرسہ کا نام کتابوں میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ یہاں آپ کے استاذوں میں حافظ محمد صالح، مولانا عبداللہ صاحب گلاؤٹھی والے اور مولانا عبداللہ صاحب کوٹلوی کا نام آتا ہے یہاں آپ نے دو سال تعلیم حاصل کی۔

تیسرا دور جب آپ امرتسر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے۔ اس مدرسہ کا نام بھی کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ یہ مدرسہ شیخ بڈھے کی مسجد فرید چوک میں چلتا تھا۔ یہاں آپ نے ۱۹۱۴ء تک تعلیم حاصل کی۔ یہاں آپ کے استاذوں میں مولانا نور احمد صاحب سیالکوٹی اور ایک نابینا بزرگ بھی تھے جن سے آپ نے علم تجوید حاصل کی۔

چوتھا دور عہد دارالعلوم دیوبند ہے، یہ تقریباً پانچ سال کا زمانہ ہے، جس میں مختلف علوم فنون کی کتابیں پڑھیں۔ اس دور کے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ، علامہ ابراہیمؒ بلیاوی، مولانا سراج احمدؒ، مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر جن شخصیتوں سے آپ زیادہ قریب رہے اور جن کی نظر عنایت آپ کی زندگی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی وہ ہیں فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری، مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

مولانا کا دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے کا واقعہ اور اس کا پس منظر بھی دلچسپ ہے۔ جب امرتسر میں زیر تعلیم تھے، کچھ دنوں کے لیے گھر آئے، یہاں آ کر ترکوں پر انگریز مظالم کی خبریں سنیں تو مولانا بے چین ہو گئے اور انگریزوں کے خلاف کچھ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے، یہاں تک کہ دوستوں اور ساتھیوں سے بھی اپنے جذبات کا اظہار کر بیٹھے، دوستوں نے یہ سنتے ہی ایک اسکول میں جلسہ کرنے کا اعلان کر دیا اور جلسہ کا عنوان رکھا ''آج مولانا حبیب الرحمٰن کا وعظ ہوگا اور ترکوں کی ہمدردی میں بھی تقریریں ہوں گی'' اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ شہر کے ہندو مسلم، امراء و روساء کی بڑی تعداد جمع ہوگئی۔ حکومت کے سی آئی ڈی رپورٹر بھی آ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ترکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالف میں تقریر ہوتی رہی۔ غدر کے بعد لدھیانہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا جلسہ تھا، جس نے ہندوستانی عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چوں کہ لوگوں میں خوف و دہشت سمایا ہوا تھا، حکومت کے خلاف اپنی آواز اٹھانے سے بھی لوگ ڈر محسوس کرتے تھے۔ ان حالات میں مولانا کی تقریر نے لوگوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا، چناں چہ مولانا کے والد کے ایک دوست مولانا کے گھر آئے اور ان کے والد سے کہا۔ آپ کے لڑکے میں دادا پردادا کی پرچھائیاں نظر آ رہی ہیں، ان میں جذبہ شہادت سوار ہے،

پھانسی سے کم ان کو سزا نہ ہوگی۔ اس لیے آپ انہیں مناسب طریقے پر زندگی گذارنے کی تلقین کیجیے۔ حالات ایسے نہیں ہیں کہ اتنی تیزی دکھائی جائے۔

مولانا کے والد نے ان واقعات کو سننے کے بعد اپنے لڑکے سے تو کچھ نہیں کہا البتہ دوسری صبح مولانا کو لے کر ازہر ہند دارالعلوم دیوبند چلے آئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم کی سرپرستی میں داخل کرایا اور تقریر کا سارا واقعہ بھی سنایا۔ مہتمم صاحب نے مولانا سے تو کچھ نہیں کہا البتہ مولانا کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کچھ اس انداز سے کی کہ مولانا موصوف ان کو اپنا پہلا سیاسی استاذ ماننے لگے۔

دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں مولانا کو اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ چند اہم بزرگوں کی سیاسی سرپرستی بھی حاصل رہی۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے روابط مولانا لدھیانوی کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوتے رہے۔ طالب علمی کے آخری دور میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی رفاقت حاصل رہی اور ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف سیاسی اور مذہبی پروگراموں میں شرکت کی، یہ تحریک خلافت کا ابتدائی دور تھا۔ مولانا لدھیانوی کی سیاسی زندگی کا عملی آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ جلیاں والا باغ کا خونی حادثہ کچھ ہی پہلے پیش آیا تھا، اس لیے تمام رہنماؤں نے آپسی اختلافات کو ختم کر دیے اور کچھ وقت کے لیے اپنے فروعی مذہبی اصول اس حد تک نظر انداز کر دیے کہ غیر ملکی سامراج کو اپنی موت دکھائی دینے لگی۔ امرتسر اتحاد کا مرکز بن گیا۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کا احترام کرنے کا عہد کیا۔ آزادی وطن کے لیے باہم اشتراک اس حد تک بڑھا کہ انگریزوں کو اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چناں چہ بلا کسی ہنگامی تحریک کے وائسرائے ہند نے اچانک ایک آرڈی ننس جاری کیا کہ:

> ''جو شخص خلافت، کانگریس اور جمعیۃ علماء کا والنٹیر بنے اس کو چھ ماہ قید اور جو والنٹیر بنائے گا اس کو تین سال قید کی سزا دی جائے گی''

اس تحریک کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمٰن کو والنٹیر بننے اور بنانے کے جرم میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ان کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور تھوڑے دنوں بعد چھ ماہ کی قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔

یہ مولانا کے قید و بند کے زندگی کی ابتدا تھی، اس مرتبہ آپ مختلف جیلوں میں تقریباً چھ ماہ تک رہے۔ جس میں (۱) لدھیانہ جیل (۲) انبالہ جیل (۳) میانوالی جیل (۴) دھرم سالہ جیل (۵) پھر لدھیانہ جیل میں لایا گیا۔ سزا ختم ہونے سے دو روز قبل ایک دوسرے مقدمے کے لیے دفعہ ۱۰۸ر کے تحت وارنٹ دکھلا کر پھر جیل میں رکھ لیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ایک سال کی قید کی سزا کا حکم سنا کر ۲۰ر اگست ۱۹۲۲ء کو مولانا کو پھر دھرم سالہ جیل میں پہونچا دیا گیا جہاں سے ۱۶ر اگست ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے۔

۱۹۲۱ء میں جب پہلی مرتبہ مولانا کو گرفتار کیا گیا اور چھ ماہ قید کے ساتھ ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا بھی سنائی گئی۔ مولانا نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا تو حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا اس وقت مولانا کے گھر میں اہلیہ اور چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا وارنٹ تھا جو آپ کی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو اپنی کارروائی کرنے کی اجازت دے دی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتیٰ کہ روزانہ استعمال کے برتن بھی اٹھا لیے، زنانہ پولیس کے ذریعہ آپ کی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں، اگلے دن صبح کو یہ تمام سامان کوتوالی کے سامنے نیلام کر دیا گیا۔ ۱۶ر اگست ۱۹۲۳ء کو جب آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے اور لدھیانہ پہونچے تو گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آ رہی تھی۔ بارش سے گھر کی چہار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی۔ سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسّی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے، کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دو سال گذار دیے۔ مولانا نے واپسی پر کچھ دوستوں کی مدد سے اپنے گھر کو کچھ حد تک درست کیا تا کہ رہنے کے لائق ہو سکے اور بے پردگی ختم ہو جائے۔

۱۹۲۳ء میں رہائی کے بعد مولانا لدھیانوی کو پنجاب خلافت کمیٹی کا ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ لہذا مولانا بطور ناظم اعلیٰ اپنے کام میں مشغول ہو گئے، لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ پنجاب کے لوگ مولانا آزاد کی رہنمائی کو مانتے تھے، جس پر علی برادران پنجابی رہنماؤں سے ناراض ہو گئے غازی امان اللہ خاں کی حکومت پر بچہ سقہ کی حملہ کی وجہ سے مرکزی خلافت کمیٹی سے اختلافات کی خلیج اور وسیع ہو گئی۔ پنجاب کے تمام خلافتی رہنما غازی امان اللہ خاں کی امداد پر کمر بستہ ہو گئے۔ سینٹرل خلافت کمیٹی کی پالیسی اس بارے میں پنجابی رہنماؤں کے خلاف تھی۔

آپس کے ان اختلاف کے نتیجے میں مرکزی خلافت کمیٹی کے سیکریٹری مولانا محمد عرفان نے ۱۷ر جولائی کو

مولانا لدھیانوی کے پاس ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی کہ پنجاب خلافت کمیٹی کے سارے نظام کو توڑ دیا گیا ہے۔

خط درج ذیل ہے۔

''.....حسب تجویز مرکزی خلافت کمیٹی آپ کی موجودہ خلافت کمیٹی پنجاب کا الحاق مرکزی کمیٹی سے توڑ دیا گیا ہے اور حسب ہدایت مرکزی خلافت کمیٹی پنجاب میں صوبہ کی جدید خلافت کمیٹی قائم ہوگئی ہے۔لھذا آپ سابق پنجاب خلافت کمیٹی کا سارا ریکارڈ جدید خلافت کمیٹی کے حوالے کر کے ان سے رسید لے لیجیے تا کہ جدید خلافت کمیٹی باضابطہ کام کر سکے''

۱۹۲۷ء کے وسط میں لاہور کے ایک ہندو ناشر راج پال نے ایک کتاب شایع کی، جس میں خاتم الانبیاء حضور سرور کائنات ﷺ کے دامن اطہر پر ایسے گندے چھینٹے ڈالے کہ پنجاب کا مسلمان بے قرار ہوگیا۔اس کے خلاف ۴۔۵ جولائی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو لاہور دہلی دروازہ سے باہر ایک اجتماع ہوا جس میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ نے چودھری افضل حق کی صدارت میں تقریریں کیں۔مولانا لدھیانوی نے اپنی تقریر میں خاص طور پر کہا کہ:''یا تو سننے والے کے کان نہ رہیں یا کہنے والے کی زبان نہ رہے'' اِن ہی تقریروں کے اثرات تھے کہ غازی علیم الدین نے راج پال کا قتل کر دیا۔

۱۵/اگست ۱۹۲۷ء کو مولانا لدھیانوی کی تقریر قابل اعتراض سمجھ کر حکومت نے آپ کو گرفتار کر لیا۔عدالت نے ایک سال کے لیے ضمانت طلب کی لیکن مولانا نے ضمانت دینے کے بجائے ایک سال جیل میں رہنا منظور کیا۔جیل میں مولانا کو تنہا رکھا گیا۔اس کے علاوہ بھی بہت ساری پریشانیاں سامنے آئیں۔جیل کے خراب کھانے کی وجہ سے پیچش جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوئے جس سے ہمیشہ کے لیے معدہ کا نظام خراب ہوگیا۔بالآخر ۱۴/اگست ۱۹۲۸/کو مولانا پوری ایک سال کی قید ختم کر کے رہا ہوئے۔یہ آپ کی تیسری گرفتاری تھی۔

گاندھی جی نے جب ۱۲/مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا اور پورے ملک میں لوگوں نے گاندھی جی کی آواز پر اس تحریک میں شمولیت اختیار کی تو پنجاب کا علاقہ اس میں کیوں کر پیچھے رہ سکتا تھا۔اس لیے پورے پنجاب اور خاص طور پر لدھیانہ میں اس تحریک میں شامل ہونے کی تیاریاں ہونے لگی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گاندھی جی نے ۱۲/مارچ کو نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا، لیکن مولانا حبیب الرحمٰن

لدھیانوی نے اس سے دو روز پیشتر لدھیانہ کے ہزاروں عوام کی موجودگی میں دریائے ستلج کے کنارے نمک بنا کر انگریز کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ حکومت کے نزدیک مولانا کا یہ عمل قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ لہٰذا ۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو دفعہ ۱۰۸ر اور دفعہ ۱۲۴ر کے تحت مولانا کو ان کے مکان سے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ۲۷ر مئی ۱۹۳۰ء کو لدھیانہ جیل میں لالہ وڈیا ساگر مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں مولانا نے حسب ذیل بیان دیا:

''میں حکومت انگریز کو ایک ایسی غیر ملکی حکومت سمجھتا ہوں، جس نے اپنی چال بازیوں اور طاقت کے بل پر ہندوستان کو غلام بنائے رکھا۔ میں اپنے لیے اور ہندوستانیوں کے لیے یہ فرض سمجھتا ہوں کہ انگریز گورنمنٹ کو جس ممکن طریق سے بھی ہم نکال کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ اس بارے میں جو سزا بھی ہم کو ملے، ہم اسے بخوشی قبول کریں۔ انگریزی حکومت نے جو نہ صرف غیر ملکی حکومت ہے بلکہ ظالم اور ہندوستانیوں کا خون چوسنے والی حکومت ہے۔ اس لیے حکومت کے مشینری کو ناکام بنانا اور انگریزی مال کا بائیکاٹ کرنا ہر ہندوستان کا اولین فرض ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ سچائی کے اجلے دامن پر برطانوی حاکمیت و طاقت ایک سیاہ داغ ہے اور اس داغ کو دھونا اگر جرم ہے تو میں اقرار جرم کرتا ہوں اور قانونِ عدالت کو اپنی منشا پوری کرنے کی اجازت دیتا ہوں''

مولانا لدھیانوی کا یہ بیان تحریری شکل میں تھا۔ اس بیان کے بعد مولانا کو ایک سال قید کی سزا ہوئی اور انہیں لدھیانہ جیل سے گجرات جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

گجرات جانے کے بعد مولانا کو ڈاکٹر انصاری کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور یہیں سے ڈاکٹر صاحب سے مولانا کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ جیل میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت مولانا مئی ۱۹۳۱ء کو رہا ہوئے۔ یہ مولانا کی چوتھی گرفتاری تھی۔

مجلس احرار اسلام کے قیام ۱۹۲۹ء کے بعد احراری رہنما کانگریس کی طرف سے شروع کردہ تحریک سول نافرمانی میں مشغول ہو گئے اس سے بہ ظاہر مجلس احرار دب گئی لیکن جب ۱۹۳۱ء کے شروع میں احراری رہنما جیلوں سے رہا ہوئے تو انہوں نے از سر نو مجلس احرار کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا اور پہلے صدر کی حیثیت سے مولانا لدھیانوی کا نام پیش ہوا، جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ اس طرح مولانا لدھیانوی مجلس احرار اسلام کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک مولانا لدھیانوی مجلس احرار اسلام کے صدر رہے۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں طویل نظر بندی کی وجہ سے مجلس احرار مولانا لدھیانوی کی صدارت سے محروم ہوگئی۔ اس طرح رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی دس سال تک مجلس احرار کے صدر رہے۔ مولانا کے زمانہ صدارت میں تحریک کشمیر، تحریک کپورتھلہ، تحریک بہاول پور، تحریک قادیان اور تحریک شہید گنج کو مولانا کی فکری اور عملی رہنمائی حاصل رہی۔

مولانا جماعت احرار کو پورے نظم وضبط کے ساتھ چلاتے رہے۔ صوبہ یوپی اور صوبہ سرحد، بہار، بمبئی، اور بنگال تک مجلس احرار کے نظام کو پھیلایا اور منظم کیا۔ اپنے دور صدارت میں ہندوستان کے سیاسی جماعت کے لیڈروں سے سیاسی مسائل پر ہمیشہ ایسی بات چیت کرتے رہے، جس سے جماعت احرار کے وقار میں اضافہ ہو۔

۱۹۳۱ء کے رہائی کے بعد مولانا کو مجلس احرار اسلام کا صدر چن لیا گیا۔ احرار کے صدر بننے کے کچھ دنوں بعد ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو احرار نے کشمیر میں حکومت کشمیر کے خلاف تحریک شروع کردی اور یہی وہ زمانہ تھا جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گاندھی جی اور محمد علی جناح لندن گئے۔

گول میز کانفرنس شروع ہونے سے قبل قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے گاندھی جی کے سامنے اپنے مشہور چودہ نکات رکھے جسے گاندھی جی نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا ''میں اپنی ذاتی حیثیت سے ہر چیز منظور کرنے کو تیار ہوں لیکن کانگریس کی طرف سے کوئی منظوری نہیں دے سکتا''۔

ان حالات کے پیش نظر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے تحریک کشمیر کے دوران مجلس احرار کے تیسرے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے ۱۲ر نومبر کو پریس کو حسب ذیل بیان دیا۔

> ''یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے چودہ مطالبات منظور نہیں کیے جائیں گے۔ کیوں کہ حکومت ہند۔ ہندو اور کانگریس سے خائف ہے..... انگریز سمجھتا ہے کہ ہندو ہمارے نظام حکومت کو درہم برہم کردے گا..... اور مسلمانوں کی نسبت انگریز کے دل میں یقین پیدا ہوگیا ہے کہ ان میں کوئی ایسی سرفروش جماعت نہیں جو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے انگریزی نظام حکومت سے ٹکر لے ..... یہ خبر اخبارات میں آچکی ہے کہ وائسرائے نے گورنمنٹ برطانیہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی پرواہ کیے بغیر ہندو لیڈروں سے صلح کرلے..... بنابریں میں ہندوستانوں کے مسلمان کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ حالات

پر بہادری اور دیانت داری سے غور کریں.....''

چوں کہ تحریک کشمیر کا آغاز ہو چکا تھا اور اس کے فوراً بعد مولانا کا یہ بیان اخبارات میں شایع ہوا۔ انہی وجوہات کی بنا پر مولانا کو ۱۲/نومبر ۱۹۳۱ء کے دن دفعہ ۱۴۱-۱۴۳- اور ۱۰۸/ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا کے دفتر (مجلس احرار اسلام کا صدر دفتر) کی تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں کر کے دفتر کو مقفل کر دیا۔

اس مرتبہ مولانا کو نیو سنٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا تھا۔ مولانا کے قیدی ساتھیوں میں اس وقت ہندوستان کی چند مایہ ناز شخصیات تھیں۔ جن میں مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب نکودری، شیخ حسام الدین امرتسری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر جمعیۃ علماء ہند) اور مولانا احمد سعید دہلوی (ناظم جمعیۃ علماء ہند) وغیرہ تھے۔ اس مرتبہ مولانا ۲۲/فروری ۱۹۳۳ء کو رہا ہوئے۔ یہ مولانا کی پانچویں گرفتاری تھی۔

۲۶/اپریل ۱۹۳۶ء تاریخ برصغیر میں مسلمانان ہند کے لیے نایاب دن تھا۔ جب قائداعظم محمد علی جناح کی دعوت پر ہندوستان کے سیاسی جماعتوں کے تقریباً سبھی رہنما ۲۶/اپریل کو امپریل ہوٹل دہلی میں ان سے ملے۔ مولانا لدھیانوی جب محمد علی جناح سے ملاقات کے لیے گئے تو مختلف حالات پر گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران قائداعظم نے مولانا کو مسلم لیگ میں آنے کی دعوت دی۔ قائداعظم سے مولانا کی اس ملاقات کا تذکرہ عزیز الرحمٰن جامعی اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں:

''اسی دوران میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب سے گفتگو شروع کی اور اس گفتگو میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو خاص طور سے مدعو کیا گیا۔ مسٹر جناح دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اسی ہوٹل میں سر فیروز خان نون بھی تھے۔ صبح کو ۹ بجے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جناح صاحب سے گفتگو کرنے کے لیے گئے تو مسٹر جناح نے بڑی کوشش کی کہ احرار کسی طرح مسلم لیگ میں آ جائیں۔ مسٹر جناح نے مولانا حبیب الرحمٰن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ مجھ سے مل جائیں تو میں ان سرکار پرستوں کو سزا دے سکتا ہوں۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ میدان عمل میں ٹھہر نہ سکیں گے اور ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ سیاست میں کسی پر سولہ آنہ یقین کرنا نہ صرف نادانی ہے، بلکہ سیاسی عدم تدبر کا ثبوت ہے''

۱۹۳۸ء کا سال تھا کہ ایک مرتبہ پھر مولانا کو گرفتار کیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ مولانا نے عوام میں تشدد آمیز تقریریں کی ہیں۔ عدالت میں مولانا نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید کی اور اس کا مدلل جواب دیا۔

دوسری جنگ عظیم سے قبل حکومت ہند برطانیہ کی امداد کے لیے آرمی بل پاس کیا۔ جس میں دوسری شقوں کے علاوہ ایک شق یہ بھی تھی کہ جو بھی فوج میں بھرتی کی مخالفت کرے اسے مجرم سمجھ کر دو سال کی سزا تجویز کی جائے۔ اس آرمی بل کی موافقت کرنے والوں میں جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما شامل تھے، وہیں مولانا لدھیانوی نے اس کی پرزور مخالفت کی اور پورے پنجاب میں ہنگامی دورے کیے۔ مولانا کے ساتھ احرار کارکن بھی اس عمل میں شریک تھے۔ حکومت پنجاب کی اطلاع کے مطابق تقریباً ۲۸۰ رجلسے منعقد کیے گیے۔ حکومت پنجاب (یونینسٹ گورنمنٹ) نے حکومت ہند کے پاس یہ اطلاع دی کہ مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کی جماعت مجلس احرار اس آرمی بل کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔

آرمی بل کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مولانا نے جو رُخ اختیار کیا، اس سے سرکاری حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں یکم نومبر کو مولانا کو لدھیانہ سے ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا نے مجلس احرار کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور سول نافرمانی کے سلسلے میں ہندوستان بھر کے عظیم رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں جن میں سبھاش چندر بوس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آخر میں مولانا آزاد سے گفتگو میں یہ بات طے پائی کہ یکم جنوری ۱۹۴۱ء تک مولانا آزاد اور گاندھی جی احرار سول نافرمانی کے حق میں اعلان کردیں گے۔ اس اعلان کے بعد گاندھی جی کے پروگرام کے مطابق احرار رضا کار سول نافرمانی کریں گے۔

تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ساتھ مشورہ کے بعد حکومت ہند نے سوچا کہ اگر گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستانی مسلمانوں نے سول نافرمانی شروع کردی تو اس تحریک کو سنبھالنا ناممکن ہوجائے گا اس لیے فوری طور پر اس کے خلاف عملی قدم اٹھایا اور مولانا آزاد کو الہ آباد میں ۱۴ر دسمبر کو اور رفیع احمد قدوائی کو لکھنؤ سے گرفتار کیا۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو مولانا لدھیانوی، مولانا عبیداللہ سندی، چودھری افضل اور ڈاکٹر عبدالقوی لقمان سے بات چیت میں مشغول تھے کہ پولیس کی ایک لاری آئی اور نظر بندی قانون کے تحت مولانا کو گرفتار کرکے منٹگمری جیل میں قید تنہائی میں بند کردیا۔

مولانا کی یہ نظر بندی مسلسل پانچ سال تک رہی۔ اس دوران مختلف پریشانیاں سامنے آئیں۔ گورنمنٹ نے مولانا

کے ساتھ اس مدت اسیری میں جس طرح کے ناروا سلوک کیے اور جس طرح کی پابندیوں اور سختیوں میں مولانا کو رکھا یہ حکومت ہند کے ظالمانہ فعل کا ایک بین ثبوت ہے۔ مولانا کے ساتھ یہ امتیازی سلوک انتقامی جذبے کے تحت حکومت پنجاب کر رہی تھی۔

مولانا لدھیانوی کا خاندان ان کی بے میعاد نظر بندی سے سخت پریشان تھا۔ مولانا بیمار تھے اور بیماری ہی کے باعث دھرم سالہ جیل میں رکھے گئے تھے۔ ان دونوں مولانا کے گھریلو حالات بھی کچھ بہتر نہ تھے۔ ہر طرف سے کوششیں کی جارہی تھیں کہ مولانا کو رہا کر دیا جائے۔ لیکن سی آئی ڈی کی تیار کردہ رپورٹ کی بنا پر رہائی مانع رہی۔ احرار پر مولانا مظہر علی کا قبضہ تھا جن کے دل میں مولانا کی طرف سے گرہ پڑی ہوئی تھی۔ مولانا کے گھر والوں کا الزام تھا کہ مولانا کی نظر بندی میں طوالت کے ذمہ دار مولانا مظہر علی ہیں اور مولانا مظہر علی کہتا تھا کہ مولانا کی طویل نظر بندی کے ذمہ داران گھر والے ہیں، دوسرے وہ احرار کی وجہ سے نظر بند نہیں ہوئے، بلکہ ان کی نظر بندی مولانا آزاد کی وجہ سے ہے۔

اس طرح کے آپسی اختلافات نے مولانا کی نظر بندی کو مزید طویل کر دیا۔ بالآخر مولانا کے والد محترم مولانا محمد زکریا صاحب نے اپنے پوتے مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کو ایک دستی خط دے کر مولانا آزاد کے پاس بھیجا جو اس وقت شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے وہاں موجود تھے۔ مولانا آزاد نے خضر حیات صاحب سے گفتگو کی نتیجتاً ان کی رہائی کے احکام صادر ہو گئے۔

مولانا لدھیانوی نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گذار دیا اور جب آخری مرتبہ ۱۹۴۵ء میں رہا ہو کر آئے تو ہندوستان آزادی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ پاکستان کا قیام بھی ناگزیر ہو چکا تھا۔ مولانا کسی صورت بھی ہندوستان کی تقسیم پر تیار نہیں تھے، ان کا ماننا تھا کہ اگر ہندوستان کا بٹوارہ ہوتا ہے تو یہاں کے مسلمان ہر طرح سے کمزور ہو جائیں گے، خاص طور پر پنجاب کا علاقہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ آزادی کے بعد ہونے والے واقعات نے مولانا کے نظریات کی تصدیق کر دی۔

بلاشبہ مولانا ہندوستان کے بلند ترین سیاسی قائدین میں تھے، جو بھی پہلی مرتبہ آپ سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

کرپس جب پہلی دفعہ ہندوستان آیا تو مولانا سے ملاقات ہوئی اور ہندوستان کی سیاست پر تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی۔ لیکن جب رخصت ہونے لگا تو اسی نے کہا: آپ مجھے ایک مرتبہ پھر ملیے گا.....اور پھر بعض صحافی حضرات کو ملاقات میں بتایا کہ: مجھے مولانا کی گفتگو نے نہایت متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک میں جن ذہین ہندوستانی

سیاست دانوں سے ملا ہوں ان میں مولانا ایک سر برآوردہ سیاست داں ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی پہلی نمائندہ کانفرنس میں ایک ہزار ڈیلی گیٹوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ ''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے جس طرح ملک کی سیاست کا تجزیہ کیا اور رہنمائی کی ہے اس کے بعد کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ میں کوئی بات آپ لوگوں سے کہوں۔ میری خواہش ہے کہ تمام ڈیلی گیٹ حضرات مولانا حبیب الرحمٰن کی رہنمائی پر غور کریں اور جو تجویز انہوں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں، ان کی تائید کی جائے''۔ مولانا آزاد جیسے انانیت پسند انسان کا یہ اعتراف تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں، جس شخص نے کبھی گاندھی جی کے افکار کو قبول نہ کیا ہو اور جو اپنے افکار کی تجلّی میں کوہ طور کا درجہ رکھتا ہو، اسی کا کسی مجلس میں اس طرح اعتراف اور اقرار مولانا حبیب الرحمٰن کے فکری رہنمائی کو ایک ایسا درجہ عطا کرتا ہے جو ہندوستان میں کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا۔

مولانا لدھیانوی کا اپنے معاصرین میں جن لوگوں سے تعلق تھا، ان احباب ورفقاء میں اس عہد کی تمام اہم روحانی، علمی، دینی، ادبی، سیاسی، فکری شخصیات شامل ہیں، جو مولانا کی عظیم شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

مولانا کی زندگی ہمہ جہت تھی۔ علمی و دینی کارناموں کے علاوہ سیاسی و ملی میدانوں کے شہسوار بھی رہے۔ ہندوستان کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے نقوش و تاثرات اور سیاسی رجحانات سے عالمی سیاست پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

مولانا لدھیانوی ان چند خوش نصیب لوگوں میں تھے جنہیں علامہ انور شاہ بے پناہ عزیز رکھتے تھے۔ علامہ، مولانا سے ان کے گھر، ان کی اولاد اور ان کے خاندان سے اس طرح مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور اپنے خاندان سے۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی علامہ انور شاہ لدھیانہ تشریف لے جاتے تو آپ کا قیام رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے گھر پر ہوتا۔ علامہ مولانا کے ان اساتذہ میں سے تھے جن سے مولانا کے فکر و عمل کو ایک نئی جہت ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا بھی اپنی شاگردی کا پورے طور پر تا زندگی حق ادا کرتے رہے۔ خانوادۂ انوری سے مولانا کو غیر معمولی شغف تھا۔ ان کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے، پنجاب کے متعدد سفروں میں مولانا کو علامہ کے ساتھ رہنے کا شرف بھی حاصل رہا۔

مولانا لدھیانوی اور مفتی کفایت اللہ نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے دوران قید و بند کی صعوبتیں بھی ساتھ ساتھ برداشت کیں۔ مفتی صاحب رئیس الاحرا کے اخلاق و کردار سے بہت متاثر تھے اور انہیں دوست کے درجے میں رکھتے تھے،

جب کہ رئیس الاحرار مفتی صاحب کی ایک بڑے بزرگ کی حیثیت سے عزت کرتے تھے۔

ہندوستان کے ان چند علماء اور سیاسی رہنماؤں میں مولانا آزاد بھی ہیں جن سے مولانا لدھیانوی کے خصوصی تعلقات رہے ہیں۔ باوجودیکہ مولانا آزاد کے مزاج سے ہم آہنگی ایک مشکل امر تھا۔ مولانا آزاد سے خط وکتابت، سیاسی جلسوں، اصلاحی اور ملی کاموں میں مولانا کے ساتھ شرکت اس بات کا بین ثبوت ہے۔

رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی کے مولانا احمد سعید سے روابط روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ خلافت تحریک سے لے کر ۱۹۴۷ء تک دونوں بزرگوں نے مختلف موقعوں پر ایک ساتھ مل کر قوم کی رہنمائی کی ہے اور ایک ساتھ جد جہد آزادی میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ دونوں بزرگوں کے خطوط سے آپسی تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ مولانا لدھیانوی نے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ جدو جہد آزادی کے دوران قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ساتھ ساتھ کام کیا۔ اسی طرح مولانا معین الدین اجمیری جب تحریک کشمیر کے دوران مجلس احرار کے ڈکٹیٹر مقرر ہوئے تو ان سے بھی تعلقات بہت گہرے ہوگئے اور قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی سے مولانا کے تعلقات کی نوعیت شخصی نہیں بلکہ خاندانی نوعیت کا تھا، جو ہمیشہ قائم رہا۔

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے مولانا کو مخلصانہ محبت تھی اور حاضر و غائب خیر خواہی فرماتے تھے''

جدو جہد آزادی کے دوران مسلم رہنماؤں کے علاوہ بہت سے غیر مسلم رہنماؤں سے بھی مولانا کے تعلقات تھے جن میں گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

گاندھی جی سے مولانا کی ملاقات آزادی سے قبل اور بعد کی ملکی اور ملّی مسائل کے تحت ہوتی رہی۔ کبھی کبھی ملاقات کے دوران مذہبی گفتگو بھی ہوتی تھی اور مولانا اسلامی تعلیمات کو قرآن وسنت کی روشنی میں گاندھی جی کے سامنے پیش کرتے، جسے گاندھی جی یکسو ہو کر سنا کرتے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو سے مولانا کے تعلقات آزادئ ہند کے بعد مزید گہرے ہوگئے تھے۔ جب بھی ملکی اور ملّی مسائل درپیش ہوتے، بلا تکلف پنڈت جی مولانا کو بلا بھیجتے اور صلاح ومشورہ لیا کرتے۔

مولانا لدھیانوی کی دینی، اصلاحی اور ملّی خدمات بھی ہندوستان کی علمی وسیاسی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ جدو جہد آزادی کے دوران اسلام کے خلاف جو سازشیں ہوئیں، ان کا بڑی سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آپ کے زمانے کا سب

سے اہم مسئلہ قادیانت کا فتنہ تھا، جس کے ذریعہ انگریز اور دوسرے مخالفین اسلام، اسلام کے مستحکم نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے فتنۂ قادیانیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور قادیانیوں کی سازش سے عوام کو آگاہ کرایا۔

مجلس احرار کی تحریک کشمیر کی ابتدا سے قبل کشمیری مسلمانوں کے جو حالات ہوئے اور مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے جس طرح کشمیر کمیٹی کے ذریعہ ہندوستان کے بااثر حضرات کو اپنی کمیٹی کا ممبر نامزد کیا، اس سے مولانا لدھیانوی نے محسوس کیا کہ اس طرح کشمیری مسلمانوں کے ایمان ضائع ہونے کا خطرہ ہے، چنانچہ آپ نے بمبئی جا کر مولانا ابوالکلام آزاد سے کشمیری مسلمانوں کے مسئلے اور کشمیر کمیٹی کے فکر و عمل کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ اس گفتگو کا ہی نتیجہ تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے کشمیری مسلمان کے ایمان کو بچانے اور انہیں ان کے حقوق دلوانے کے لیے بمبئی سے واپسی پر مجلس احرار کے کارکن سے آپسی صلاح و مشورہ کرتے ہوئے، مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے تحریک کشمیر کا آغاز کر دیا۔ مولانا کی بروقت کوشش ہی کا نتیجہ تھا کہ کشمیر کے لاکھوں مسلمان قادیانی ہونے سے بچ گئے۔ حالاں کے اس تحریک کی وجہ سے مولانا کو قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔

مولانا اپنی پوری زندگی قادیانیت کے خلاف جدو جہد میں لگے رہے، جب بھی ضرورت ہوئی قادیانی سازش کو عوام کے سامنے بے نقاب کرتے رہے۔ مولانا نے ذاتی طور پر بھی قادیانی پروپیگنڈہ سے لوگوں کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ اور مجلس احرار کے اہم ارکان کو بھی اس کام پر مامور کیا کہ قادیان جا کر وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کی جائے اور ان کے مذہب کی حفاظت کی جائے۔

۱۹۲۷ء کے وسط میں لاہور کے ایک ہندو ناشر ''راج پال'' نے ایک کتاب ''رنگیلا رسول'' نام سے شایع کی، جس میں حضورؐ کے دامن اطہر پر ایسے گندے چھینٹے ڈالے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کا دل بے قرار ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے پنجاب میں اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور سخت تقریریں کیں، جس کی بنا پر حکومت انگریز نے آپ کو مجرم ٹھہرایا اور ۱۰ر جولائی کو زیر دفعہ ۱۰۷ کے تحت لدھیانہ سے گرفتار کیے گئے۔

آزاد ہندوستان میں جب فرقہ پرستی غیر مسلموں کے ذہنوں پر اثر انداز ہو رہی تھی اور مسجد کے بلند و بالا میناروں سے اذان کی آواز بھی فرقہ پرستوں کو ناگوار گذرتی تھی، تو مولانا نے ان ناگوار جذبات کو ایک عجیب انداز میں ختم کرنے کا

بیڑا اٹھایا۔ اذان کا ہندی ترجمہ اور اس کے ساتھ مختصر تشریح کرا کر شایع کیا۔ خاص اشاعت غیر مسلم حلقوں میں کی گئی۔ مولانا کی اس کوشش سے غیر مسلم حلقوں پر کافی اثر ہوا۔

۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان ہجرت کر جانے کا ایک ایسا وسیع اور طاقت ور رجحان بلکہ نشہ سب پر چھا گیا جس کو تھامنا اور مسلمانوں کو اس ملک میں مقیم رہنے پر آمادہ کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسے حالات میں جہاں ہندوستان کا دوسرا علاقہ متاثر ہوا، وہیں مشرقی پنجاب خصوصاً لدھیانہ بھی اس کی زد میں آ گیا۔

تقریباً یہی حالات پورے مشرقی پنجاب کے تھے، ۱۹۴۷ء سے قبل جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اب یا تو پاکستان چلے گئے یا پھر جو رہ گئے وہ مرتد ہو گئے، مسجدیں سکھوں اور ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئیں اور وقف کی جائدادوں پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔ ایسے حالات میں اگر پنجاب کے مسلمانوں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو یقیناً پورا مشرقی پنجاب کافر و مرتد ہو کر رہ جاتا اور پنجاب سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جاتا۔

چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے دہلی میں رہتے ہوئے اس کی طرف توجہ فرمائی اور اس کے لیے باقاعدہ طور پر ''انجمن حمایت اسلام'' کے نام سے ایک کمیٹی بنائی، جس کے تحت خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت، مساجد کو واگذار کرانا، مسلمانوں کو دوبارہ پنجاب میں اس کی حیثیت دلوانا اور آراضئ وقف کو غیر مسلموں کے قبضے سے لینا اہم مقصد بتایا گیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۹۵۵ء میں سفر حج کیا، آپ کے ساتھ اس سفر میں مولانا قاضی زین العابدین سجّاد میرٹھیؒ، مولانا وحید الزماں کیرانویؒ اور ان کے علاوہ بھی کچھ افراد تھے۔ چوں کہ آپ ہندوستان میں ہمیشہ امت مسلمہ کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور یہ آپ کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا، اس لیے آپ نے سفر حج کے دوران وہاں کے حالات کا بھی جائزہ لیا۔ مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور جدہ کے قیام کے دوران بلاد عربیہ کے بہت سے سیاست داں، اخبار نویس اور علماء آپ سے ملنے تشریف لائے، آپ بھی وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے، ان حضرات سے عرب کے حالات اور وہاں کے مسائل پر مولانا کی گفتگو ہوئی اور بڑی دردمندی اور بے قراری کے ساتھ عرب ملکوں کے حالات کے خطرناک نتائج سے ان کو آگاہ کیا۔

''جو لوگ مولانا سے ملاقات کے لیے آتے تھے، مولانا تین امور کی طرف ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ

منعطف کراتے تھے۔(۱) اتحاد ممالک عربیہ (۲) ملک میں صنعتی اداروں کا قیام اور مغربی مصنوعات سے احتراز (۳) جدید وقدیم علوم کے تعلیمی اداروں کا اجراء''۔

ہندوستان کی آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا جب دہلی میں مقیم ہوگئے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تو علمی ودینی مجالس کی طرف رغبت مزید بڑھ گئی۔ روزانہ صبح کو ان کے یہاں حضار مجلس کے سامنے ایک علمی نشست ہوتی، جس میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پڑھے جاتے اور مولانا تفسیری نکات اہتمام سے بیان فرماتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ سے انہیں عشق تھا اور اس پاکیزہ والہامی ترجمہ کے مسلسل مطالعہ سے اس کی گہرائی وگیرائی پر مکمل واقفیت رکھتے، عام مجلسوں میں بھی آیات قرآنی اور حضرت شاہ صاحب کے افادات کو جاذب انداز میں پیش فرماتے، فہم قرآن میں علامہ شبیر احمد عثمانی کو بے مثل قرار دیتے تھے اور ان کے فوائد القرآن کا اکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشادات پر بھی عبور تھا اور جابجا ان کا افادہ فرماتے، جس سے حاضرین کے علم میں مزید اضافہ ہوتا۔

مولانا کے تعلقات بہت وسیع تھے، اس لیے مراسلت کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا، وہ خطوط کے جواب پابندی اور مستعدی سے دیا کرتے تھے، اکثر وبیشتر خطوط بہت طویل ہوا کرتے اور خط لکھنے میں پہل بھی کیا کرتے تھے۔ بزرگوں، استاذوں، دوستوں، معاصروں، دینی وسیاسی رہنماؤں اور اپنے عزیزوں کو برابر خط وکتابت کے ذریعہ اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور ان سے خیریت طلب کرتے۔ کسی کو صلاح ومشورہ، کہیں کسی کو ملک وملت کی فلاح وبہبودگی سے متعلق اور کہیں خانگی وعائلی زندگی جیسے اہم مسائل سے متعلق گفتگو کرتے۔ ان میں بیش تر خطوط ضائع ہوگئے جو بچے وہ کتابوں کی زینت ہے۔

مولانا کے وہ خطوط جو زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا آزاد، پنڈت نہرو، گاندھی اور لیاقت علی خان کے خطوط ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی سے خاص طور پر پاکستان کا قیام، مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شمولیت اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر گفتگو ہوئی ہے۔

گاندھی جی سے خط وکتابت کے دوران بھی پاکستان کا قیام اور محمد علی جناح کی قیادت کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ مولانا آزاد سے خط وکتابت میں ہندوستان میں پیش آمدہ مسائل اور خاص طور پر پنجاب کے حالات شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ کانگریس کی پالیسی پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔

پنڈت نہرو کو مولانا نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں ایک طرف مولانا کا سیاسی کردار، حالات حاضرہ پر گہری واقفیت اور دینی علوم سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف کانگریس کا رویہ کانگریسی مسلمانوں کے تئیں کس طرح کا تھا اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کی کانگریس کے لیے بارہا قربانیوں کے باوجود جس طرح سے ہنگامہ آرائی کی جارہی تھی کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس ہنگامہ کے پیچھے کیا اسباب ہیں، اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ پھر پنڈت نہرو کی طرف سے لگائے گئے الزامات جو مجلس احرار کے سلسلے میں ہے، اس کے بھی جواب دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی کانگریس کے تئیں اپنا نظریہ بھی پنڈت جی پر واضح کرتے ہیں۔

خان لیاقت علی خاں جب پاکستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو مولانا نے خان صاحب سے ملاقات کیا اور ایک دستی خط جو ہندو پاک کے تعلقات کو مستحکم بنانے میں مددگار ثابت ہوسکتی تھی بھیجا، جس سے مولانا کی سیاسی اہمیت اور قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد مولانا مکمل طور پر دہلی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، سیاست سے کنارہ کش ہوکر دینی اصلاحی اور ملّی خدمات میں ہمیشہ لگے رہے، آخری دس سالوں میں مولانا اکثر وبیشتر مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ آخر کار ۲؍ستمبر ۱۹۵۶ء کو یہ آفتاب حریت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ ان کے انتقال سے ملک کو بھاری نقصان پہنچا۔ ان کا وجود ملت کا قیمتی سرمایہ تھا، جو مذہبیت اور دینداری کے ساتھ ملکی اور قومی خدمت، ایثار اور قربانی کی تاریخ بھی رکھتا ہے۔

مولانا لدھیانوی کی وفات پر ملک وملت کے بیشتر افراد نے خون کے آنسو ٹپکائے۔ جن میں سیاسی مبصرین بھی ہیں، ادیب وشعراء کے علاوہ محدثین وفقہاء کی ایک لمبی جماعت بھی، نیز اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی اخبارات ورسائل میں اپنے دلی احساس وجذبات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا جدوجہد آزادی میں اپنی خدمات کے باعث قوم پرست حلقے میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مولانا کی موت پر ہر طرف اظہار رنج وملال کیا جارہا تھا۔

مولانا لدھیانوی نے جس پلیٹ فارم سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں نمایاں کارنامہ انجام دیا وہ مجلس احرار ہے۔

مجلس احرار کے قیام کی وجہ بیان کرتے ہوئے جانباز مرزا اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

''آخر یہ ہوا کہ ۲۸؍دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس نے لاہور دریائے راوی کے کنارے اپنے سالانہ

اجلاس میں سکھوں کی ناراضگی کا بہانہ تراش کر نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کے سپرد کر کے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزرویشن پاس کرایا۔ نہرو رپورٹ کے خاتمے سے ان مسلمانوں کو بے حد صدمہ ہوا جنہوں نے ملت اسلامیہ کی ناراضگی کے باوجود صرف آزادیٔ وطن کے لیے نہرو رپورٹ پر دستخط کئے تھے۔ لیکن کانگریس رہنماؤں نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کرتے وقت ان سے مشورہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا اور ایسی بے اعتنائی کا ثبوت دیا کہ بہی خواہان وطن کو کانگریس کی اس بے وفائی پر دلی رنج ہوا۔ اسی لمحے ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے اپنی الگ تنظیم کا وجود شدت سے محسوس کرتے ہوئے ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے اسی پنڈال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر مجلس احرار کا قیام عمل میں لایا گیا''

لہذا مجلس احرار اسلام کے اغراض و مقاصد بھی کچھ اس طرح تجویز کیے گئے:

الف: پرامن ذرائع سے ہندوستان کے لیے آزادی حاصل کرنا۔

ب: سیاسیات ہند میں مسلمانوں کی صحیح سیاسی راہ نمائی کرنا۔

ج: مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشش کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ ذرائع رکھے:

الف: تمام ہندوستان میں مجالس احرار قائم کرنا۔

ب: ہر جگہ جیش مجلس احرار اسلام منظم کرنا۔

ج: مزدوروں اور کاشتکاروں کو اقتصادی اصول پر منظم کرنا۔

د: دیسی صنعتوں کو ترقی کے لیے اور سودیشی اشیاء کی ترویج کے لیے کوشش کرنا۔

ہ: قیام مجلس احرار کے لیے سرمایہ فراہم کرنا اور دیگر ایسے وسائل اختیار کرنا جو وقتاً فوقتاً ضروری خیال کیے جائیں۔

اغراض و مقاصد کے متعلق ڈاکٹر پی۔ این۔ چوپڑا تحریر فرماتے ہیں:

''مجلس احرار کے اغراض و مقاصد میں ہندوستان کی آزادی، دوسری سیاسی تنظیموں سے اشتراک، مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی پسماندگی کو دور کرنے کی سعی اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرنا شامل تھے''

مجلس احرار کے ذریعہ جو اہم کارنامے انجام دیے گئے ان میں سب سے اہم تحریک کشمیر اور تحریک قادیانیت ہے۔ تحریک کشمیر میں مجلس احرار کی قربانیوں کی وجہ سے مسلمانوں کو باعمل اقوام میں سربلند کرنے کا موقع حاصل ہو گیا اور ان کو حق حاصل ہو گیا کہ باعمل اور ایثار پیشہ اقوام کے سامنے بلند آہنگی سے کچھ کہہ سکیں۔

مجلس احرار کی طرف سے تحریک کشمیر میں حصہ لینے سے کشمیری مسلمانوں کو جو فائدہ ہوا وہ یہ ہے:

۱۔ وہ کشمیری کاشتکار جس کے پاس زمین تھی لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا (کیونکہ ریاست کی تمام اراضی مہاراجہ کی ملکیت تھی) تحریک احرار کے بعد کسان اس کا مالک بن گیا، اور ریاست کے مالکانہ حقوق فتح ہو گئے، اب ذمہ دار صرف مالیہ ادا کرتا ہے۔

۲۔ پچاس فیصد لگان تحریک کے بعد صرف پانچ فیصد رہ گیا۔

۳۔ تقریر و تحریر اور جماعت بنانے کی اجازت مل گئی۔

۴۔ اخبار نکالنے اور آزادئ رائے پر کوئی پابندی نہیں رہی۔

۵۔ آزاد اسمبلی کا وجود تسلیم کر لیا گیا

مجلس احرار اسلام نے عظیم الشان حق حریت ادا کیا اور کشمیری تحریک کو آزادی کے قریب پہونچا دیا اور اس تحریک میں جان ڈال دی، تقریباً چونتیس ہزار احرار رضا کار جیل خانے آباد کر بیٹھے، ستائیس شہید ہوئے۔

مجلس احرار نے فرقہ قادیانیت کے متعلق وہ واضح اور دوٹوک پالیسی اختیار کی جو آج تک کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت اختیار نہیں کر پائی۔ قادیانیوں کا پنجاب، بلوچستان اور بتدریج پاکستان میں قادیانی اسٹیٹ قائم کرنے کا منصوبہ جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا گیا، قادیانیوں کے عزائم مشئومہ سے امت مسلمہ کو باخبر رکھا۔ حکومت اور اعیان حکومت کو ان کی سرگرمیوں سے مطلع کیا اور مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کروایا، جس کے تحت اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں وافر مقدار میں رسالہ و پوسٹر شایع کروایا۔ ختم نبوت کے متعلق جو خدمات احرار نے انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کا پردہ چاک کر کے اور ایک زبردست تحریک شروع کر کے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ احرار ہی کا حصہ ہے۔

ہندوستانی عوام خاص طور پر قادیان میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات اور ان کے لیے تبلیغ اسلام کی ضرورت و

اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجلس احرار نے شعبہ تبلیغ کا قیام عمل میں لایا اور اس کے ضمن میں تین شعبے قائم کیے۔

(۱) شعبہ تبلیغ (۲) شعبۂ اصلاح تنظیم (۳) شعبہ خدام خلق

یہ شعبہ جات ملازم پیشہ مسلمانوں کی اس بنیادی کمزوری کو بھانپتے ہوئے عمل میں لایا گیا کہ غیر سیاسی لوگ مجلس احرار کے اس شعبہ میں کام کریں، جس سے ان کی سرکاری ذمہ داریاں بھی زخمی نہ ہوں اور دین کا کام بھی ہوتا رہے۔

اس شعبہ کے اغراض و مقاصد یہ طے پائے:

(۱) ہندوستان میں اور بیرون ہند میں اسلام کے مقدس اصولوں کی اشاعت کرنا

(۲) مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا جذبہ صادق پیدا کرنا اور مبلغین اسلام کی ایک سرگرم کارکن تیار کرنا

(۳) فتنہ قادیان کے تباہ کن اثرات سے تعلیم اسلامی کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں کو ان کے دجل سے بچانا

(۴) خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا

(۵) یہ شعبہ خالص دینی اور مذہبی ہوگا۔ سیاسیات ملکی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

جب ۳۱ رمئی ۱۹۳۵ء کو بلوچستان کے ایک شہر کوئٹہ میں زبردست زلزلہ آیا جس میں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں شہر اور دیہاتوں کے نقشے بدل گئے۔ مجلس احرار نے ایسے موقع پر شعبۂ خدام خلق کے تحت لاہور دہلی دروازہ سے باہر کوئٹہ ریلیف کیمپ قائم کر دیا۔ ڈاکٹروں اور کمپونڈروں کی ایک کثیر تعداد پوری تیاری کے ساتھ کوئٹہ روانہ کی گئی۔ ساتھ میں رضا کاروں کی بھرتی کا اعلان بھی کیا گیا جو کوئٹہ سے آنے والے زخمیوں کی دیکھ بھال میں ہاتھ بٹا سکیں اور مصیبت زدگان کی امداد کے لیے ریلیف فنڈ بھی جاری کیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی خدمات ہیں جو احرار کی طرف سے کیے گئے ہیں، ابتدا میں احرار کو کافی مقبولیت حاصل رہی لیکن دھیرے دھیرے مقبولیت میں کمی آتی گئی اس کمی کی وجوہات بھی ہیں مثلاً:

۱۔ ان کی اکثریت خطیبوں اور واعظوں پر مشتمل تھی، جو اپنی سحر بیانی اور خطابت کے زور سے وقتی طور پر حاضرین کو اپنا ہم نوا بنا سکتی تھی، مگر کوئی ٹھوس کام کر کے دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

۲۔ احرار میدان کے شہسوار ضرور تھے، مگر میز کے کھلاڑی نہیں تھے، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے اسرار و رموز میدانوں میں لڑ کر سمجھ میں نہیں آتے بلکہ ان کے لیے گول میز ہی موزوں جگہ ہو سکتی ہے۔ بیسویں صدی کا یہ خاصا

ہے کہ اس میں کوئی اہم مسئلہ میدانوں میں حل نہیں ہوا، بلکہ ہر مسئلہ میز کے اردگرد بیٹھ کر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔

۳۔ان کے پاس اسٹیج تھا پریس نہیں تھا، زبان تھی قلم نہیں تھا، وہ ان اسباب و وسائل سے محروم تھے جن پر زمانہ کی سیاسی تنظیموں اور قومی قیادتوں کے عروج اقبال یا نتائج و آثار کا انحصار تھا۔

۴۔یہ جماعت اپنے قیام کے ابتدائی پانچ سال کے اندر ہی اندر انگریز کی مکارانہ سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی، چوں کہ مولوی تھے اس لیے مسجد ہی ان کے زوال کا باعث بنی، حالاں کہ ان کے موقف کی صحت کا شاہ کار مسجد شہید گنج کا وہ پہرے دار ہے جو آج بھی سنگین کی نوک پہرہ دے رہا ہے۔مگر مکار اسے کہا جاتا ہے جو سچ کو جھوٹ ثابت کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

۵۔ان میں ایسی کوئی مرکزی شخصیت نہ تھی جس سے تمام ہندوستان کے مسلمان متاثر ہوں، وہ ان بادلوں کی طرح تھے جو صحراؤں پر برستے ہوئے نکل جاتے ہیں۔سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا لدھیانوی احرار کی زبان تھے، عام احرار انہیں دونوں سے متاثر تھے، لیکن امیر شریعت اور رئیس الاحرار کہلانے کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی کی طرح شیخ الاسلام نہ تھے کہ ملک کے طول و عرض میں ان کے شاگرد علماء ہوتے، ذہناً اتنے متبحر نہ تھے کہ مولانا آزاد کی طرح عوام میں اپنا مقام پیدا کر لیتے، قائداعظم نہ تھے کہ قوم انہی کی ہو کے رہ جاتی، گاندھی، نہرو کی طرح بچنے کا سوال ہی نہ تھا۔

ان احوال و آثار کے باوجود احرار نے اعمال و افکار کی ایک ایسی ترنگ اور امنگ پیدا کی جس نے پنجاب کی شہری زندگی کو ایک نیا ذوق عطا کیا اور وہ صوبہ جو محض انگریزوں کا خوشہ چین ہو کر رہ گیا تھا ان کے استعمار کا نکتہ چین ہو گیا۔احرار نے اپنی خامیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن کی جھلک آج بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔

مجلس احرار کی جو انفرادی خصوصیت تھی وہ اس طرح ہے کہ:

۱۔احرار نے پنجاب کی استعماری روایت کے برعکس ایک ایسی روایت پیدا کی جس کا مقصد غیر ملکی غلامی کے خلاف جدوجہد کی روح پیدا کرنا تھا اور وہ روح ایک محدود جماعت ہی میں سہی لیکن پیدا ہو گئی۔

۲۔احرار نے مسلمانوں میں آزادی کی لگن عام کی جس سے مسلمان نوجوانوں میں ایک فعال عنصر پیدا ہو گیا، جس نے خطابت و سیاست کے میدانوں میں نام پیدا کیا اور تحریک آزادی میں اپنا فرض ادا کیا۔

۳۔احرار کو میدان میں آنے کے بعد غریب لوگوں کو پہلی مرتبہ حوصلہ ہوا کہ سیاست ''گھوڑوں کی ریس'' کا نام نہیں ہے کہ بڑے بڑے لوگ ہی اسے دفع الوقتی یا فارغ لمحات گذارنے کا ایک مشغلہ سمجھیں، بلکہ سیاست کے دروازے ہر غریب کے لیے کھلے ہیں اور وہ حتی المقدور قومی معاملات میں بہتر سے بہتر خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ عالمی سیاست میں درمیانی طبقہ اور غریب آدمی نے تاریخ ساز کردار پیش کیا ہے۔ مجلس احرار نے پنجاب کے جیالے رضا کاروں، سرحد کے پٹھانوں، یوپی اور دہلی کے دانش وروں اور بنگال کے جذباتی مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے درمیانی طبقہ کے لیے ترقی کے دروازے کھول دے اور انہیں احساس کمتری سے نجات دلا کر دانش وروں، عالموں اور رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

۴۔جس باب میں تاریخ اسلام ان کی شکر گذار ہوگی وہ قادیانیت کا تعاقب اور اس کی سرکوبی ہے، احرار نے اسی جماعت غدار کا جس بے جگر سے مقابلہ کیا کہ اس کے نتائج اسلام اور مسلمان دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئے مثلاً:

الف۔قادیانیت لفظاً و معناً بے نقاب ہوگئی، مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اس کا وجود ان کی وحدت اور اسلام کی مرکزیت کے لیے مہلک و مضر ہے۔

ب۔قادیانیت کا تبلیغی دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا، عامۃ المسلمین اس کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

ج۔قادیانیت کا مذہبی وجود اپنے سیاسی خدوخال سمیت آشکار ہوگیا، جس سے اسلام مصئون اور مسلمان محفوظ ہوگئے۔

غرض مجلس احرار اسلام کے کارنامے بہت عظیم ہیں ان کے اندر خامیاں بھی تھیں لیکن ان کے کارنامے زیادہ اہم تھے۔ احرار کی کمزوریاں انسانوں کی کمزوریاں تھیں، ان کمزوریوں سے انسان کبھی خالی نہیں رہ سکتا، لیکن احرار کی خوبیاں قدرت کا انعام تھیں۔دنیا نے ان کے بارے میں سبھی کچھ کہا ہے، لیکن تاریخ ان کے بارے میں ابھی صحیح تجزیہ نہیں کر سکی۔ہار جانا کوئی شئے نہیں، اصل شے لڑ جانا ہے۔ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں تک استبداد وارتداد سے لڑ جانے کا سوال ہے کوئی سی جماعت اس تاب وتوانائی کے انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔

کسی بھی شخصیت یا عنوان پر تحقیق کے دوران اس کے مأخذ اور مراجع کا مرحلہ بڑا اہم ہوتا ہے میرے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش آیا اور میں نے ہندوستان کے مشہور علماء و محققین سے رہنمائی حاصل کی اور حتی الامکان مأخذ و مراجع تک پہونچنے

کی کوشش کی ،اس سلسلہ میں عزیز الرحمٰن جامعی کی کتاب ''رئیس الاحرار در حدیث دیگراں'' اور ''رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی'' مولانا محمد احمد رحمانی کی کتاب ''مضامین رئیس الاحرار'' جانباز مرزا کی کتاب ''کاروان احرار'' شورش کاشمیری کی کتاب ''بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل'' اور نیشنل آرکائیوز دہلی میں موجود سی آئی ڈی کی خفیہ رپورٹ کی فائلوں سے استفادہ کیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی
اوران کی تحریک احرار اسلام
ایک تاریخی و تحقیقی جائزہ

مقالہ برائے
پی۔ ایچ۔ ڈی

مقالہ نگار
محمد عرفان

نگران:
پروفیسر زین الساجدین صدیقی

شعبۂ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۴ء

THESIS

انتساب

والد اور والدہ کے نام

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

T6236

فہرست

مقدمہ ۱

حالاتِ زندگی

نام ۱۴
لقب ۱۴
پیدائش ۱۴
وطن ۱۴
حلیہ ۱۵
تربیت ۱۵
خاندان ۱۵
نسب ۱۷
جدامجد ۱۷
مولانا عبدالقادر لدھیانوی تاریخ کے آئینے میں ۱۸
سفر آخرت ۲۰
مولانا کی سیاسی اہمیت مؤرخین کی نظر میں ۲۱
حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلقات ۲۲
شاہ عبدالقادر کی اولاد ۲۳
والد محترم ۲۷

اولاد واخلاف ۲۸
رفیقۂ حیات ۳۲
تعلیم ۳۵
عقد مسنون ۳۶
دیوبند میں داخلہ ۳۷
دارالعلوم کا تعلیمی ماحول ۳۸
اساتذہ ۳۹
مولانا حبیب الرحمٰن کی سرپرستی ۴۰
حضرت شاہ صاحب کی سرپرستی ۴۰
حضرت شاہ صاحب کے درس میں ۴۱
حضرت شاہ صاحب سے گھریلو ربط ۴۱
شیخین سے محبت ۴۳
اساتذہ سے محبت ۴۴
درس گاہیں جہاں تعلیم حاصل کیں ۴۵
بیعت وانتساب ۴۵
خصوصی تعلق ۴۷
بزرگوں سے عقیدت ۴۸
تصوف کیا ہے؟ ۵۰
وفات ۵۱
مرض کی شروعات ۵۲
آپریشن ۵۳
ذمہ داریوں سے سبکدوشی ۵۴
سفر آخرت ۵۵

نماز جنازہ ۵۶
قطعہ تاریخ ۵۸
مرثیہ ۵۹
اخبارات ورسائل ۶۱
تعزیتی خطوط ۶۶

دینی اصلاحی اور ملی خدمات

خطابت ۷۰
تحریک کشمیر ۷۴
قادیانیت کے خلاف سرگرمی ۷۵
تحریک شاتم رسول ۷۷
علمی نشست ۷۸
غیر مسلم حلقوں میں تبلیغ ۷۹
جامع مسجد لدھیانہ کا سنگ بنیاد ۸۰
انجمن حمایت اسلام کا قیام ۸۱
سفر حج اور عربوں کو اصلاحی مشورے ۸۳
۱۔اتحاد ممالک عربیہ ۸۴
۲۔صنعتی اداروں کا قیام ۸۴
۳۔جدید وقدیم علوم کے تعلیمی اداروں کا اجراء ۸۵

معاصر علماء و رفقاء

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیر ۸۸
رئیس الاحرار اور علامہ کشمیری ۸۹

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ ۹۰
رئیس الاحرار اور مفتی صاحب ۹۱
مولانا ابوالکلام آزاد ۹۲
رئیس الاحرار اور مولانا آزاد ۹۳
سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی ۹۴
رئیس الاحرار اور سحبان الہند ۹۵
مولانا حفظ الرحمٰن (مجاہت ملت) ۹۵
رئیس الاحرار اور مجاہد ملت ۹۷
مولانا معین الدین اجمیری ۹۷
رئیس الاحرار اور مولانا اجمیری ۹۹
چودھری افضل حق ۹۹
چودھری افضل حق اور مولانا لدھیانوی ۱۰۱
مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی ۱۰۱
رئیس الاحرار اور قاضی صاحب ۱۰۴
حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب ۱۰۵
رئیس الاحرار اور قاری صاحب ۱۰۶
مہاتما گاندھی ۱۰۷
رئیس الاحرار اور گاندھی جی ۱۰۸
جواہر لال نہرو ۱۱۰
رئیس الاحرار اور نہرو ۱۱۱
مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۱۲
رئیس الاحرار اور مولانا بخاری ۱۱۳
وحیدِ عصر مولانا وحید الزماں کیرانوی ۱۱۳

رئیس الاحرار اور مولانا کیرانوی ۱۱۵
مولانا معاصر علماء اور سیاسی رہنماؤں کی نظر میں ۱۱۷

سیاسی خدمات

آزادی سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی حالت ۱۲۷
ذہنی کشمکش ۱۳۱
سیاسی زندگی کی ابتدا ۱۳۳
سول نافرمانی ۱۳۳
پہلی گرفتاری ۱۳۴
لدھیانہ جیل میں ۱۳۵
انبالہ جیل میں ۱۳۵
میانوالی جیل میں ۱۳۶
دھرم سالہ جیل میں ۱۳۶
پھر لدھیانہ جیل میں ۱۳۷
دوسری گرفتاری ۱۳۷
گھر کی نیلامی ۱۳۷
پنجاب خلافت کمیٹی ۱۳۸
باغیانہ مضامین کی اشاعت ۱۴۰
دربار کا بائکاٹ ۱۴۱
تیسری گرفتاری ۱۴۱
پنڈت موتی لال نہرو سے روابط ۱۴۲
یوم آزادی ۱۴۲
چوتھی گرفتاری ۱۴۵

گاندھی اروِن پیکٹ اور مولانا کی رہائی ۱۴۶
مجلس احرار اسلام کی صدارت ۱۴۷
جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی ۱۴۸
پانچویں گرفتاری ۱۴۸
مسجد شہید گنج کا معاملہ ۱۵۱
مولانا کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت ۱۵۲
ایک نئی شق کا اضافہ ۱۵۳
چھٹی گرفتاری ۱۵۵
آرمی بل کی مخالفت ۱۵۹
ساتویں گرفتاری ۱۶۰
سول نافرمانی کے لیے ہندوستان کی عظیم رہنماؤں سے ملاقات ۱۶۱
آخری گرفتاری ۱۶۳
استعفیٰ ۱۶۸

مولانا حبیب الرحمٰن اپنے مکاتیب کی روشنی میں

مولانا شبیر احمد عثمانی کے مکتوبات ۱۷۴
مولانا لدھیانوی کے جوابات ۱۷۷
مولانا لدھیانوی اور گاندھی جی کے درمیان خط و کتابت ۱۷۹
مولانا لدھیانوی کا جواب ۱۷۹
مولانا آزاد کے نام خطوط ۱۸۰
پنڈت نہرو اور مولانا حبیب الرحمٰن کے درمیان خط و کتابت ۱۸۲
مولانا لدھیانوی کا خط نواب زادہ لیاقت علی خان کے نام ۱۸۵

مجلس احرار اسلام ہندمقاصد اور خدمات

مجلس احرار کا قیام ۱۹۰

احرار کا نظریہ ۱۹۲

اغراض ومقاصد ۱۹۳

نمک ستیہ گرہ اور سول نافرمانی ۱۹۴

کانگریس سے علیحدگی ۱۹۷

احرار کانفرنس ۱۹۸

تحریک کشمیر ۲۰۳

پس منظر ۲۰۴

تحریک کشمیر میں احرار کی شمولیت ۲۰۵

کشمیر کی طرف پہلا وفد ۲۰۸

دوسرا وفد ۲۰۹

سول نافرمانی ۲۱۰

تحریک کا اختتام ۲۲۰

تحریک کے نتائج ۲۲۲

روزنامہ احرار ۲۲۴

صدر احرار کا مشورہ ۲۲۵

روزنامہ احرار کی ضمانت ضبطی ۲۲۶

تحریک قادیانیت اور احرار کی خدمات ۲۲۹

مرزا غلام احمد ۲۳۰

مرزا کے اخلاق اوصاف ۲۳۰

صحت اور شکایتیں ۲۰۳

نکاح اور اولادیں ۲۳۱

وفات ۲۳۱

مرزا غلام احمد نئی دعوت عزیمت کے ساتھ ۲۳۲

مرزا اپنے تحریر کے آئینے میں ۲۳۳

ختم نبوت اور علماء اسلام ۲۳۵

مجلس احرار کی خدمات ۲۳۶

احرار کانفرنس ۲۳۸

احرار کو دعوت مباہلہ ۲۴۰

مجلس احرار کا مطالبہ ۲۴۱

شعبہ تبلیغ کا قیام ۲۴۱

مسلمانوں کا قبرستان ۲۴۲

اچھوت تبلیغ کانفرنس ۲۴۳

کوئٹہ زلزلہ ۲۴۴

احرار ریلیف کیمپ ۲۴۵

وائسرائے کا اعتراف ۲۴۶

مسجد شہید گنج ۲۴۷

مسجد کی تاریخی حیثیت ۲۴۸

مسجد کی شہادت ۲۴۹

احرار کا موقف ۲۵۱

احرار کی وضاحت ۲۵۲

نتیجہ ۲۵۵

آرمی بل کی مخالفت ۲۵۵

تجزیہ ۲۶۰

مصادر و مراجع ۲۷۱

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

مقدّمہ

الحمد للہ ربّ العٰلمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعینؔ :

امّا بعد!

اسلام اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کا نام ہے اسی مقصد کے تحت اللہ نے مختلف زمانوں میں نبی بھیجے اور آخری نبی محمد عربی ﷺ کو بھیجا گیا۔

قرآن اسلام کی تعلیمات کی بنیاد اور اسلام کا دستور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی تشریح فرمائی اور عملی نمونہ پیش کیا۔ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"[۱] اس طرح قرآن کے احکام اور سنتِ رسول کے ذریعہ مکمل ضابطۂ حیات کی تشکیل ہوئی اور "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول"[۲] کے مطابق اس کو ہر علم بردار توحید کے لیے چراغ راہ بنایا گیا۔ قرآن اللہ کا آخری پیغام ہے اور محمد عربی ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ اسلام کا یہ ضابطۂ حیات قیامت تک کے لیے ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد اسلام کا پیغام دوسروں تک پہونچانے کے لیے علماء کرام کو ذمہ داری سونپی گئی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے بلغو عنی ولو آیۃ [۳] اور علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل۔[۴]

چناں چہ علماء کی فضیلت میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درھماً ..... [۵]

ان فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب .....[۶]

---

[۱] قرآن

[۲] قرآن

[۳] مشکوٰۃ شریف

[۴] بخاری، انبیاء، ص:۵۰

[۵] ابوداؤد، کتاب العلم، ج ۲، ص:۵۱۳

[۶] ایضاً۔ ص:۵۱۳

چنانچہ حضورﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ نے اور پھر تابعین نے بحسن وخوبی اس فریضہ کو انجام دیا۔ خلافت راشدہ کے بعد خلافت بنوامیہ اور خلافت بنوعباسیہ کا عہد علومِ اسلامیہ کی تدوین وترویج کا زرّیں عہد ہے، جس میں محدثین اور فقہاء کرام کے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا مہر منور فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تو اس نے ایک صدی کے اندر تمام متمدن دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ یہاں تک کہ مہر منور کا عکس ہندوستان پر بھی پڑا۔ ہندوستان میں اسلام کی روشنی سب سے پہلے بحری راستہ سے جنوبی ہند اور سندھ میں آئی اور چند ہی سالوں میں علاقہ سندھ میں اسلامی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے علماء ومحدثین درس وتدریس اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہوگئے، جس کی تفصیل قاضی اطہر مبارک پوری کی کتاب رجال السند والھند اور خلافت امویہ اور ہندوستان میں پیش کی ہے۔ چناں چہ سندھ کے پہلے عرب اور مسلم حکمراں محمد بن قاسم کے ساتھ جو علماء اور محدثین ہندوستان آئے ان میں محدث موسیٰ بن یعقوب ثقفی قابل ذکر ہیں۔ محمد بن قاسم کے بعد عرب حکمرانوں کے دور میں ابومعشر سندھی (ف ۲۳۱ھ)، ان کے فرزند ابوعبدالملک (ف ۱۴۴ھ) اور ابونصر سندھی بڑے محدث اور اپنے فن کے امام گذرے ہیں۔ [۱]

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی کے دوسرے دور کا آغاز شاہان غزنویہ سے ہوا۔ ۳۶۹ھ کے قریب امیر سبکتگین اور اس کے بعد اس کا فرزند محمود غزنوی (م ۳۸۸ھ) میں تخت نشیں ہوا۔ اس کی حکومت کم وبیش دوسو سال رہی اور موجودہ پاکستان کے بیش تر حصے اس کے زیر نگیں رہے۔ اس کے دور میں بہت سے علماء وفضلاء یہاں موجود تھے۔ عوفی نے اپنے تذکرے لباب الالباب میں ایک خاص باب فضلاء غزنیں ولاھور پر لکھا ہے۔ [۲]

اس عہد کے علماء ومشائخ میں شیخ محمد اسمٰعیل (م ۴۴۸ھ)، حضرت داتا گنج بخش (م ۴۶۵ھ) قابل ذکر ہیں۔

سلطان معزالدین غوری کی فتوحات سے ہندوستان میں مسلمانوں کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اسی دور میں برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت کی باقاعدہ بنیاد پڑی۔ قطب الدین ایبک ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ ہوا۔ مگر اس کے دور میں علمی سرگرمیاں محدود رہیں۔ پھر بھی بہاء الدین اوشی (م ۶۰۷ھ)، جمال الدین محمد اور

---

[۱] تاریخ سندھ/ابوظفر ندوی/معارف اعظم گڑھ/ص: ۳۸۵-۳۶۰

[۲] لباب الالباب۔ مرتبہ سعید نفیسی۔ طبع ایران۔ ۱۳۳۳ھ/ص: ۵۵-۳۹

حمید الدین وغیرہ فضلاء وشعراء ان کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش کے زمانے میں علماء، فضلاء اور صوفیا ومشائخ کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں قاضی حمید الدین ناگوری (م۱۲۷۴ء)، قاضی منہاج سراج (م۶۶۸ھ)، مولانا جمال الدین بسطامی، خواجہ بختیار کاکی، (م۶۳۲ھ) شیخ جلال الدین تبریزی اور قاضی قطب الدین جیسے صوفیا ومشائخ نے اسلام کی ترویج واشاعت کا کام کیا۔[۱]

شمش الدین کے بعد رکن الدین، ناصر الدین محمود اور غیاث الدین یکے بعد دیگرے حکمراں بنے۔ اسی زمانے میں برہان الدین محمود (م۶۸۷ھ) قاضی رکن الدین سامانوی، علامہ کمال الدین زاہد (م۶۸۴ھ)، اور فخر الدین ناقلہ وغیرہ علماء کرام تھے۔[۲]

جلال الدین خلجی، پھر علاء الدین خلجی تخت دہلی کا مالک ہوا، یہ دور علائی دور کے نام سے مشہور ہوا۔ اس دور کے متعلق شیخ نور الدین دہلوی لکھتے ہیں:

''اہل فضل وکمال کے گروہ جتنے اس عہد میں جمع ہوگئے تھے کسی عہد میں نہیں ہوئے تھے، بلکہ نہ آئندہ ہوں گے''[۳]

ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں صرف دہلی میں چھیالیس علماء کے نام تحریر کیے ہیں۔[۴]

امیر خسرو (م۷۲۵ھ) حسن سنجری (م۷۳۶ھ) اور حضرت نظام الدین اولیاء (۶۳۴ تا ۷۲۵ھ) عہد علائی کی زندہ جاوید ہستیاں ہیں۔ اس کے بعد غیاث الدین تغلق کا دور آتا ہے۔..... ابن بطوطہ، ضیاء الدین برنی وغیرہ اسی زمانے کے ہیں پھر تغلق خاندان کا آخری فرمارروا فیروز شاہ تغلق کا دور آیا اس کے انتقال کے بعد دہلی کا اقتدار کمزور ہوگیا۔

پھر خاندان سادات اور خاندان لودھی کا دور آیا۔ اس عہد میں بھی علماء وفضلا نے ہندوستان میں تبلیغ دین کا کام کیا۔ شیخ جمالی اسی عہد کے مشہور ومعروف علماء وصوفیا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

---

۱ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات/خلیق احمد نظامی/ندوۃ المصنفین دہلی/۱۹۵۸ء/ص:۱۲۴-۱۰۹

۲ بزم مملوکیہ/سید صباح الدین عبدالرحمٰن/دار المصنفین اعظم گڑھ/۱۹۵۴ھ/ص:۲۳۰

۳ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات/ص:۲۷-۲۲۶

۴ تاریخ فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی۔ کلکتہ۔ ۱۸۶۰/ص:۵۴-۳۵۳

بابر مغلیہ عہد کا پہلا حکمراں تھا۔ اس کے عہد کے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''شاہان مغلیہ میں بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا..... وہ خواجہ عبدالقدیر احراری کا مرید تھا اور علم معقول و منقول میں خراسان کے شیخ الاسلام سیف الدین احمد، علم کلام میں ملا شیخ حسن اور حدیث میں میر جمال الدین محدث کا قدرداں تھا''۔ (اس کے زمانے میں علماء کی قدردانی کی جاتی تھی) [۱]

بابر کے بعد ہمایوں تخت نشیں ہوا۔ علم نجوم کے ساتھ ساتھ دیگر علوم پر بھی اس کو دسترس تھی۔ محمد بن اشرف الحسینی اور شیخ حسین اسی زمانے کے علماء ہیں۔ [۲]

ہمایوں کے بعد اکبر مغلیہ سلطنت کا تیسرا بادشاہ ہوا، جس نے ہندوستان میں ایک لمبے عرصے تک حکومت کی۔ اس کے عہد میں جہاں ملک کو وسعت حاصل ہوئی وہیں علوم وفنون کو بھی ترقی ملی۔ ملا عبدالنبی (م ۹۹۱ھ)، مخدوم جون پوری، ابوالفضل، فیضی (م ۱۰۰۴ھ) اور ملا مبارک اسی زمانے کے علماء ہیں۔

اکبر نے دین الٰہی کے ذریعہ جو گمراہی پھیلائی تھی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۹۷۱ تا ۱۰۳۴ھ) نے نہایت عزم وہمت اور تدبیر کے ساتھ اس کا سدباب کیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر کرتے ہیں:

''سرہند کی طرف سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی۔ راستہ صاف کرو راستے کا چلنے والا آتا ہے۔ ایک فاروقی مجدد فاروقی شان سے ظاہر ہوا، یہ احمد سرہندی تھے۔ جہانگیر کے طوق سلاسل نے بڑھ کر ان کے قدم لیے اور وہ شاہی قیدی کی حیثیت میں اسیر زنداں ہوئے۔ اس یوسف زندانی نے بھی یوسف کنعانی کی طرح ''ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار'' کا نعرہ لگایا۔ اس نعرے نے لوگوں کو جگا دیا..... سرہند کے اس فاروقی مجدد کی آواز نے دہلی کے ایک اور فاروقی خاندان کو گرما دیا۔ یہ شاہ عبدالرحیم دہلوی (م ۱۱۳۱ھ) تھے، جو عالمگیر کے معاصر تھے، ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ تا ۱۱۷۶ھ) ہوئے جن کو ملت نے حکیم الامت کا خطاب دیا۔ یہ اس دوسرے دور کے مجدد ہوئے۔ اس دور میں جن کو ملا ان سے ملا اور جس نے پایا ان سے پایا''۔ [۳]

خلاصہ یہ کہ شیخ احمد سرہندی نے دین الٰہی کی تردید کی اور لوگوں کو صحیح اسلام کی تعلیم سے روشناس

---

[۱] ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلق پر ایک نظر/صباح الدین عبدالرحمٰن/معارف اعظم گڑھ/۱۹۶۴ء۔ ص: ۲۲

[۲] منتخب التواریخ۔ ج ۱/ص: ۴۷۱

[۳] سیرت سید احمد شہید/ابوالحسن علی ندوی/ج ۱/مجلس نشریات اسلام کراچی/۱۹۸۷ء/ص: ۳۷

کرایا۔ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ نے لوگوں میں دینی بیداری پیدا کی اور ہندوستانی عوام کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آگاہ کیا اور اسلامی نظام حیات کو جدید طرز کے مدلل انداز میں پیش کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا زوال ہوگیا ،مگر ان کی جدوجہد سے برصغیر میں علماء اسلام کی ایک بڑی تعداد نے قرآن وحدیث کی تعلیم کو اپنا مقصد اصلی بنایا اور اس کی ترویج و اشاعت میں خود کو وقف کردیا ، جن میں ان کے صاحبزادگان شاہ عبد العزیز ، (۱۱۵۹تا۱۱۳۹ھ) شاہ عبدالقادر،شاہ رفیع الدین (م۱۲۴۹ھ) اور پھر شاہ محمد اسحاق (۱۱۹۲تا۱۲۶۲ھ) اور سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کی خدمات ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ واشاعت اور اصلاحی جدوجہد کا زرّیں باب ہے۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد دہلی کا مرکز کمزور پڑ گیا اور صوبہ جات میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا جو تاج وتخت حاصل کرنے کے واسطے آپس ہی میں لڑنے لگے۔اس افراتفری سے سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں اور راجپوتوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔اسی کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی جو ہندوستان میں بنگال کے راستہ سے تجارت کی حیثیت سے داخل ہوئی تھی ، وہ اپنے پاؤں پھیلانے شروع کردیے،جس کا پہلا افسوس ناک سانحہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں ظاہر ہوا۔ یہاں سراج الدولہ کی فوجیں کمپنی کی مٹھی بھر فوج کے مقابلہ میں شکست سے دوچار ہوگئیں ۔اسی دور میں کمپنی کے افراد نے بنگال میں جو مظالم ڈھائے اور جس طرح انہیں لوٹا کھسوٹا وہ ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے ۔ پھر بتدریج کمپنی کی حکومت کا دائرہ بڑھتا گیا۔اکثر امراء اور نواب اپنی آپسی چپقلش کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے مصالحت پر مجبور ہوئے ۔ اب انگریزوں کی کوشش یہ رہی کہ یہاں کے باشندوں میں اتحاد و اتفاق پیدا نہ ہونے دیا جائے جس کے لیے فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی ، پورا ملک مختلف حصوں میں تقسیم ہوکر رہ گیا۔باوجود اس کے ایک زمانے تک سلطان ٹیپو (والئی میسور) انگریزوں سے نبرد آزمائی کرتے رہے ،مگر اپنے لوگوں کی غداری کی وجہ سے ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کے ہاتھ یہ کہتے ہوئے ''گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے''شہید ہوگئے ۔ پلاسی کے بعد انگریزوں کی یہ دوسری اہم فتح تھی ۔اب انگریزوں کو پورا موقع مل گیا اور کہنے لگا کہ اب ہندوستان ہمارا ہے۔اکثر صوبوں میں انگریزی حکومت ہونے کے بعد دہلی میں مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، جہاں ۱۸۰۳ء میں لاڈلیک کی قیادت میں انگریزی فوج دہلی میں

فاتحانہ داخل ہوئی، ساتھ ہی وہ بادشاہ دہلی کے اختیارات دن بہ دن کم کرتے چلے گئے، جس کی وجہ سے بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار بن کر رہ گیا۔ ۱۸۳۷ء میں آخر کار مغل تاج دار باشاہ بہادر شاہ کے زمانے میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ مغل خاندان کو قلعہ سے باہر نکال دیا جائے اور شاہ کے لقب کو بھی چھین لیے جائیں۔ اس کے بعد دہلی واطراف دہلی میں وحشت و بربریت کی کوئی نوع ایسی باقی نہیں چھوڑی جو ہندوستانیوں پر آزمایا نہ گیا ہو۔ نام نہاد تہذیب وتمدن کے دعویدار انگریزوں نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا وہ انسانیت کے نام پر دھبہ ہے۔ ایسی عجیب وغریب سزائیں دی جاتی کے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بے گناہ ہندوستانی عوام (مسلمان) کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نذر آتش کیا جاتا۔ مرد عورت بوڑھے بچوں کو بھی اندھا دھند پھانسیاں دی جاتی رہیں۔ ان انگریزوں کا کہنا تھا کہ جب یہاں کے باشندے دور دراز کے صوبوں یا علاقوں میں جائیں گے تو لوگوں سے اپنے شہر کی بربادی کا ذکر کریں گے اور بتائیں گے کہ دہلی کی گلیاں اور بازار میں ہر طرف نعشیں بکھریں پڑی ہیں اور اس کے خوبصورت اور عالی شان محل مٹی کے تودے بن کر رہ گئے ہیں۔ دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز ہے کہ بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا اور ان کو سماجی، معاشی معاشرتی ہر لحاظ سے تباہ و برباد کیا جانے لگا، ان کے عقیدہ وعمل اور اخلاق و مذہب کی عمارتوں کو منہدم کرنے کے واسطے در پردہ عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کر دی اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے راہیں ہموار کیں۔ مسلمانوں اور قرآن پر رکیک حملے کیے اور مسلمانوں کی بہت سی مذہبی مسائل کو تبدیل کرنے کے غرض سے ایکٹ (قوانین) پاس کیے۔ پرانے طرز کے مدارس وخانقاہوں کو بند کر کے نئے نئے اسکول وکالج کھولے گئے، تاکہ ہندوستانیوں کو عیسائی مذہب بنانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے اور عیسی مسیح کی تعلیم کا علم ہر جگہ اور ہر مقام پر لہرانے لگے۔

اس پر آشوب زمانہ میں علماء کرام میدان میں اترے اور انہوں نے قوم کو انگریز کے اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تحریک چلائی۔ اسی مقصد سے شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں خاص طور پر علماء نے ہندوستان کو دارالحرب تصور کرتے ہوئے بیرون حکمرانوں سے جہاد ایک قومی ضرورت ہی نہیں بلکہ مذہبی فریضہ سمجھ کر شروع کر دیا۔ ان کے بعد سید

احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید (۱۱۹۳تا۱۲۴۶ھ) اور ان کے رفقائے کار مولانا عبد القادر لدھیانوی، قاضی احمد اللہ شہید، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی وغیرہ نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ان علماء کی کوششوں سے ہی ہندوستانی عوام میں سیاسی شعور اور جذبہ حریت جاگ اٹھا اور ایسا شعلہ بھڑک اٹھا جسے دبانا بظاہر انگریزوں کے بس میں نہ تھا۔

یہ مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ایک طرف عیسائی مشنریوں نے مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تہذیب پر بھی شدید حملے کیے اور اس بات کی کوشش کی کہ ان کو کسی طرح عیسائی بنا دیا جائے۔ دوسری جانب ان کو سماجی اور اقتصادی اور تعلیمی میدان میں انتہائی پس ماندہ بنانے کی کوشش کی۔ان حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کو میدان کارزار میں جہاد کے ذریعہ کھوئی ہوئی حکومت اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب اور تہذیب وثقافت کی حفاظت کے لیے اور مسلمانوں کو قرآن وسنت کی طرف راغب کر کے اسلام کی تعلیم سے آگاہ کرنے کے لیے شدید جدوجہد کرنی پڑی۔اس جدوجہد کے قائد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی تھے۔شاہ ولی اللہ کی تحریک کے نتیجہ میں ہی پورے ملک میں دینی بیداری اور مسلمانوں میں جذبۂ حریت پیدا کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔اور پورے ملک میں اس نہج پر دینی مدارس قائم ہوئے اور ان مدارس دینیہ کی تعلیم وتربیت سے علماء کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جنہوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات سے نوازا، عیسائی مشنریز کو منہ توڑ جواب دیا اور مسلمانوں میں خود اعتمادی اور عزم وحوصلہ پیدا کر کے ان کے دلوں سے برطانوی حکومت کا ڈر اور خوف وہراس دور کیا، انہیں سیاسی اعتبار سے اس لائق بننے میں مدد دی جس سے وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصّہ لے کر مسلمانوں کے ملی وقار کو بلند کر سکیں۔

اس عہد میں ملک کو جدوجہد کی سخت آزمائش سے گذرنا پڑا جس میں مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور زبردست قربانیاں دے کر ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرایا۔اس طرح علماء اسلام نے ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔آزادی کے بعد مسلمانوں کو پھر ایک سخت آزمائش سے گذرنا پڑا، ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور وہ مسلمان جنہوں نے ہندوستان کو ہی اپنا وطن بنانے کا فیصلہ کیا، مسلم دشمن طاقتوں نے ان پر ظلم اور تشدد کے پہاڑ توڑ دیے اور ان کے مذہب وتہذیب کو شدید طور پر مجروح کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں کو ان حالات

کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسی عہد میں مسلمانان ہند کو مسیحی مشن، شدھی تحریک اور قادیانیت سے بھی سخت مقابلہ کرنا پڑا۔

اس مقصد کی تکمیل میں متعدد مسلم دینی وملی جماعتوں، اداروں اور ان جماعت سے وابستہ شخصیات نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ملک وملت کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے، مسلم جماعتوں میں جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام ہند، انجمن حمایت اسلام اور جمعیۃ اہل حدیث۔ اداروں میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ شخصیات میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا آزادؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ قابل ذکر ہیں، جو اس عہد کی تاریخ اور تاریخ ساز ہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے معمار ہیں۔

مجلس احرار اسلام ہند اور اس کے پہلے صدر رئیس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ مولانا موصوف اور مجلس احرار نے نہ صرف یہ کہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں غیر معمولی خدمات انجام دی، بلکہ ردّ مسیحیت، ردّ قادیانیت اور شدھی تحریک کا نہایت جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی صحیح دینی، مذہبی اور سیاسی راہ نمائی کی، خاص طور پر جب ملک آزاد ہوا اور ہندوستان کے مسلمان شدید مصائب وآلام میں مبتلا ہوئے، مولانا لدھیانوی نے ہندوستان کے مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے اور ہندوستان میں ان کو عزت ووقار کا مقام دلانے کے لیے شاندار کارنامے انجام دیے۔ مجلس احرار اور مولانا لدھیانوی کی خدمات ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی تاریخ کا اہم حصّہ ہے۔

اگست ۱۹۹۷ء میں آزادئ ہند کی پچاسویں تقریب پورے ملک میں شان وشوکت سے منائی گئی، لیکن پروگراموں میں دانستہ طور پر مسلم علماء کے ناقابل تردید مجاہدانہ کردار کو قطعاً نظر انداز کردیا گیا اور آج جب کہ ہندوستان کی آزادی کو ستاون سال پورے ہونے کو ہیں، ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں سے بتدریج امتیاز برتا جارہا ہے۔ احسان فراموشی کی اس سے بدترین مثال کیا ہوگی کہ آزادی کے لیے فضا جنہوں نے ہموار کی اور مردہ دلوں میں روح جنہوں نے پھونکی اور برطانوی استعمار کے مقابلہ میں جنہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ آج انہی علماء کی مخلصانہ خدمات کو ملکی تاریخ سے حرف غلط کی طرح

مٹادیا گیا اور وہ مسافر جو اس کفن بردوش قافلہ میں سرِ راہ آ کر شامل ہو گئے تھے، ان کو قافلہ کی قیادت کا تاج پہنا دیا گیا۔

اس لیے ضرورت ہے کہ ہم اپنے عظیم شخصیات کو، جنہوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنا خون بہایا اور مذہب وثقافت کی تحفظ کے لیے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کیں۔ ہم ان کی خدمات کا جائزہ لیں اور نئی نسلوں کو روشناس کرائیں۔

اس لیے شعبۂ دینیات سنّی نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور تحریک احرار پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے کی ذمہ داری احقر کے سپرد کی۔

کسی تحقیقی مقالہ کے لیے سب سے اہم کام مأخذ اور اس سے متعلقہ دستاویزات کا حاصل کرنا ہے، اس سلسلے میں پنجاب کی متعدد لائبریریاں، دہلی کی نیشنل آرکائیوز، محمودیہ لائبریری (جمعیۃ علماء ہند دہلی)، آزاد بھون دہلی، دہلی پبلک لائبریری، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، خدا بخش لائبریری (پٹنہ) اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا لدھیانوی کے خاندان سے متعلق حضرات، خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانوی، مولانا محمد عثمان رحمانی لدھیانوی، مولانا عبداللہ لدھیانوی، جناب زکریا صاحب اور اہلیہ جناب بلال صاحب مرحوم وغیرہ سے بہت سی وہ معلومات حاصل ہوئیں جو ہمارے مقالہ کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے

(۱) حالات زندگی:

حالات زندگی کے تحت اسلاف واخلاف کا مختصر تعارف بیان کرنے کے بعد مولانا کی پیدائش، تعلیم وتربیت، اساتذہ، بیعت وسلوک اور وفات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ اس کے تناظر میں مولانا کی شخصیت نمایاں طور پر مترشح ہو سکے۔

(۲) دینی اصلاحی اور ملّی خدمات:

اس عنوان کے تحت مولانا کی دینی، اصلاحی اور ملی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا کی خطابت،

تحریک کشمیر میں مولانا کی خدمات: قادیانیت کے خلاف سرگرمی، تحریک شاتم رسولؐ، مولانا کی علمی اور ادبی سرگرمیاں، غیر مسلم حلقوں میں مولانا کی تبلیغ اور ۱۹۴۷ء کے متاثر زدہ لوگوں کے لیے انجمن حمایت اسلام کا قیام جیسے اہم سیاسی، سماجی اور دینی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

(۳) معاصر علماء ورفقاء، مولانا معاصر علماء اور سیاسی رہنماؤں کی نظر میں:

اس عنوان کے تحت مولانا کے معاصر رفقاء کے درمیان روابط و تعلقات منجملہ اور چیزوں کے ان حضرات کا مختصر سوانحی خاکہ اور خدمات کے علاوہ مولانا لدھیانوی کی شخصیت معاصر علماء اور سیاسی رہنماؤں کی نظر میں کیا تھی، ان سب کو اجمالاً بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) سیاسی خدمات:

اس باب کے تحت ہندوستان کے سیاسی حالات، مولانا کی سیاسی و دینی خدمات، ان کے ذاتی تجربات، ان کا جذبۂ حریت، انگریز دشمنی اور وطن دوستی کے علاوہ مولانا کے قید و بند کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے مولانا کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور قائدانہ صلاحیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۵) مولانا لدھیانوی اپنے مکاتیب کی روشنی میں:

اس باب میں مولانا لدھیانوی کے خطوط پیش کیے گئے ہیں جو انہوں نے متعدد اکابر ملت و مشاہیر کے نام تحریر کیے ہیں۔ جن میں خانگی و عائلی زندگی، معاصرانہ چھیڑ چھاڑ (نوک جھونک) دینی حرارت، علمی سنجیدگی و متانت سیاسی و ملی چاشنی موجود ہے تو دوسری طرف مولانا کا منفرد طرز نگارش اور انشا پردازی کا رنگ و آہنگ نیز رعایت لفظی کا اہتمام پوری طرح جلوہ گر ہے۔

(۶) مجلس احرار اسلام ہند مقاصد اور خدمات:

یہ مقالہ کا اہم اور آخری حصہ ہے جس میں غدر کے بعد مسلمانوں کے سیاسی حالات اور مجلس احرار کے قیام کی اہمیت و ضرورت اور ملک گیر سطح پر جدوجہد آزادی کے لیے مجلس احرار اور اس کی قربانیوں کا

خاکہ پیش کیا گیا ہے نیز مجلس احرار اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب رہی اور اس کے ناکامی کی کیا وجوہات تھیں، اس کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

اللہ رب العزت کا بے پناہ احسان وکرم ہے کہ اس نے مجھے اس مقالہ کو تکمیل تک پہنچانے کی توفیق بخشی۔

کسی یونیورسٹی کے علمی شعبہ میں تحقیقی وعلمی کام کے لیے نگراں ورہنما کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جب کوئی طالب علم پی ایچ۔ڈی میں داخلہ لے کر ریسرچ کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ تحقیق کے بنیادی اصولوں اور اس کے تقاضوں سے نابلد ہوتا ہے، بلکہ وہ اس سے بھی ناواقف ہوتا ہے کہ اپنے مقالہ کے لیے مواد کہاں سے حاصل کرے اور اس مقصد کے لیے مطالعہ کا آغاز کس طرح کرے اور کن مصادر و مآخذ کی طرف رجوع کرے اور اپنے مقالہ کو علمی ومستند بنانے کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کرے۔ نگراں کا علمی تحقیق کے میدان میں تجربہ اور علمی مزاج اور فکری رجحان مقالہ کی تشکیل وتحریر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ میرے لیے یہ امر باعث سعادت ہے کہ مجھے اپنے اس مقالہ کی تکمیل کے سلسلہ میں پروفیسر قاضی زین الساجدین صدیقی (ڈین وصدر شعبۂ دینیات) کی زیرنگرانی کام کرنے کا موقع ملا، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ علمی مقالہ نگاری کے بنیادی اصول، تحقیق ومطالعہ اور مآخذ ومراجع کے سلسلے میں رہنمائی کی بلکہ اس کی تکمیل کے لیے ہر قسم کی مشکلات ودشواریوں کو دور کرنے میں اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود ہر ممکن تعاون کرتے رہے اور ان سے ہمیشہ ایک والد کی سی سرپرستی حاصل رہی۔ میں اس سلسلے میں اپنے شفیق استاذ کا بے حد ممنون ہوں اور اظہار تشکر اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ'' اس علمی راہنمائی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ استاذ محترم ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فرزند اور ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، آپ نے دیوبند کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اہم اداروں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ساتھ ہی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے خاندان سے آپ کو قربت حاصل رہی ہے۔

اسی طرح شعبہ دینیات کے اساتذہ کرام (ڈاکٹر نسیم منصور، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، ڈاکٹر مفتی زاہد علی خان، ڈاکٹر توقیر عالم، ڈاکٹر محمد سلیم، ڈاکٹر عبد الخالق، ڈاکٹر محمد حبیب اللہ، ڈاکٹر احسان اللہ فہد) کا

میں بے حد ممنون مشکور ہوں جنہوں نے ہمت افزائی کی اور اس مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں میری مخلصانہ مدد فرمائی۔

میں نے مولانا لدھیانویؒ کی زندگی کے حالات کی تحقیق کے سلسلے میں ان کے اعزاء اور اہل خاندان سے بھی رابطہ قائم کیا، ان حضرات میں مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانوی، مولانا محمد عثمان رحمانی لدھیانوی، مولانا عبداللہ لدھیانوی، جناب زکریا صاحب اور اہلیہ جناب بلال صاحب مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنہوں نے اہم معلومات سے نوازا، میں ان کا بے حد شکر گذار ہوں۔

میرے لیے یہ بات بھی باعث فخر ہے کہ عہد حاضر کی عظیم علمی و دینی شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ وقاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا عبدالحنان صاحب (مہتمم جامعہ اسلامیہ قاسمیہ بالاساتھ، سیتامڑھی)، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) مفتی ظفیر الدین مفتاحی (مفتی دارالعلوم دیوبند)، مولانا سالم قاسمی (مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند) مولانا انظر شاہ کشمیری مسعودی (شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند)، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا بدرالدین الحافظ قاسمی، پروفیسر محمد زبیر فاروقی اور ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے احقر کے استفسار کے جواب میں اپنی ذرّیں ہدایات وراہنمائی کے ذریعہ اس مقالہ کو وقعت وعزت سے نوازا۔

میں اپنے مشفق احباب ..... کا حد درجہ ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مقالہ کو تکمیل تک پہنچانے میں میری ہر طرح کی معاونت کی۔

اللہ پاک کا شکر واحسان ہے کہ والدین کی شفقتیں اور نیک دعائیں ہر وقت میرے شاملِ حال رہیں۔ خدا ان کو اور تمام محسنین ومخلصین کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ آمین

وماتوفیقی الاّ باللہ

محمد عرفان

باب اول

حالات زندگی

نام:

آپ کا نام حبیب الرحمٰن تھا۔ یہ نام آپ کے دادا مولانا مفتی محمد صاحب نے تجویز کیا تھا۔

لقب:

مولانا حبیب الرحمٰن ہندوستان کی جنگ آزادی کے عظیم مجاہدوں کی جماعت ''مجلس احرار اسلام ہند'' کے بانی، صدر اول اور تا زندگی تنظیم کے روح رواں تھے، اس لیے آپ ''رئیس الاحرار'' کے لقب سے معروف ہوئے۔

پیدائش:

آپ کی ولادت ۳ر جولائی ۱۸۹۲ء، مطابق ۱۱ر صفر ۱۳۱۰ھ کو لدھیانہ (پنجاب) کے محلّہ موچپورہ میں ہوئی۔ دادا محترم مولانا مفتی محمد صاحب کی عمر اس وقت ۶۵ سال کے قریب تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن اپنے والد کی پہلی اولاد تھے، اسی لیے دادا دادی دونوں کو بے حد خوشی ہوئی اور پورے خاندان کی طرف سے مبارک باد کے پیغام آنے لگے۔

وطن:

آپ کے جد امجد مولانا عبدالقادر صاحب اپنے پورے خاندان کے ساتھ پنجاب کے مشہور شہر لدھیانہ آ گئے تھے اور ان کے بعد ان کی اولاد نے وہیں مکمل طور پر سکونت اختیار کر لی تھی، آپ اپنی پیدائش ۱۸۹۲ء سے ۱۹۴۷ء تک (۵۵ سال) لدھیانہ میں ہی سکونت پذیر رہے، اس کے بعد حالات کے ناسازگار

ہونے کی وجہ سے آپ دہلی میں قیام پذیر ہوگئے، تاہم آپ کا اصل وطن لدھیانہ ہی ہے۔

حلیہ:

مولانا دراز قامت، دراز ریش، بارونق چہرہ، چال میں تمکنت اور حجازی عبا پہنتے تھے۔

تربیت:

مولانا کا خاندان چوں کہ ہمیشہ سے مجاہدین کا خاندان رہا ہے۔آپ کے دادا محترم مولانا مفتی محمد صاحب ابھی باحیات تھے اس لیے مولانا کی ابتداء ہی سے اسلامی تعلیمات کے مطابق تربیت کی گئی۔ اور جیسے ہی مولانا اپنی عمر کے چھٹی یا ساتویں منزل پر پہونچے تو دادا محترم مولانا کو اسلام کی محبت اور انگریز دشمنی کی تعلیم دینے لگے۔اور مولانا کے سامنے ان ہی موضوعات پر چھوٹی چھوٹی تقریریں کرتے اور اس کو بار بار دہراتے پھر مولانا کو گود میں لے کر کہتے ''بیٹا جو کچھ میں نے تم کو سنایا ہے اس کو دہراؤ'' اور جب مولانا ان کی باتیں دہرانے لگتے تو آنکھیں بند کر کے دادا محترم ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔اس طرح شروع ہی سے مولانا کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اسلام کی محبت خوب اچھی طرح ذہن نشیں کرادی اور اس کے ساتھ ہی انگریز دشمن سے بھی مولانا کو شناسا کرایا گیا۔دادی صاحبہ بھی شب بیدار اور صالح نسبت خاتون تھیں۔انہوں نے پورے لگن کے ساتھ مولانا کی تربیت کی اور تعلیم کا بندوبست کیا۔

خاندان:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے خاندان کا تعلق عربی النسل ان مجاہدین سے ہے، جو محمد بن قاسم کے ساتھ ملتان آئے تھے، اور پھر انہوں نے ہندوستان میں مکمل طور پر رہائش اختیار کر لی تھی [1]

چوں کہ ہندوستان میں اس خاندان کے افراد ایک مجاہد کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے، لہٰذا اس عربی النسل مجاہدین سے جو نسل ہندوستان میں چلی ہے اس نسل اور خاندان کے بہت سے افراد بعد کے

---

[1] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۵

وقت میں بھی اپنے کارناموں کی وجہ سے مجاہد وقت کہلائے۔

محمد بن قاسم کی آمد سے ۱۸۳۶ء تک مولانا کے خاندان کے سلسلہ میں تاریخی مآخذ خاموش ہیں۔ہاں!۱۸۳۶ء سے پھر آپ کے جدامجد مولانا عبدالقادر لدھیانوی کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مولانا مرحوم کے خاندان کی لدھیانہ میں آمد سے متعلق مولانا عزیزالرحمٰن جامعی اپنی کتاب ''رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں تحریر کرتے ہیں:

''۱۸۳۶ء میں شاہ زمان الملک امیر کابل اور شاہ شجاع الملک اپنے وزیر فتح علی خان سے شکست کھا کر انگریزی افواج کی مدد سے اپنے خاندان کے ساتھ لدھیانہ میں مقیم ہوئے، یہ خاندان پانچ سو نفر پر مشتمل تھا، حکومت انگریزی کی طرف سے اس خاندان کی پچیس لاکھ روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی، فتح علی خان نے شاہ زمان الملک کو آنکھوں سے معذور کر دیا تھا۔سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد شاہ زمان الملک لدھیانہ پہونچ کر اس تلاش میں مصروف ہوگئے کہ وہ کسی مرشد کامل کے ہاتھ پر بیعت کریں، اسی تلاش و جستجو میں شاہ زمان الملک کو امام العارفین مولانا عبدالقادر صاحب کا پتہ چلا۔شاہ زمان الملک اپنے خادموں کو لے کر موضع بلیّہ وال (جو لدھیانہ سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے) تشریف لے گئے۔مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی، ہفتہ عشرہ حضرت کی خدمت میں رہ کر گاؤں کی زندگی کی طرح معمولی قسم کا کھانا کھایا۔شہر واپس ہونے سے پہلے شاہ زمان نے بصد احترام شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ: ''لدھیانہ کے تمام لوگوں کی اور خود میری یہ آرزو ہے کہ آپ لدھیانہ میں قیام فرمائیں تاکہ لوگ آپ کے فیض علمی اور فیض روحانی سے فائدہ اٹھائیں''، شاہ زمان نے ایسے عاجزانہ طریقہ سے درخواست کی جو منظور کر لی گئی'' [۱]

لدھیانہ پہونچ کر شاہ عبدالقادر لدھیانوی نے شہر کے ایک محلّہ ''موجپورہ'' میں ایک پھوس کا مکان اور کچی مسجد بنائی، جو آج بھی ''مسجد دومنزلی'' کے نام سے محلّہ موجپورہ میں موجود ہے۔اس طرح سے یہ

---

[۱] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیزالرحمٰن جامعی، ص:۱۲۔۱۱

خاندان لدھیانہ شہر میں داخل ہوکر آباد ہوا، اور یہیں سے لدھیانہ شہر کی سیاسی زندگی کا دور شروع ہوا۔ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے دینی فیضان کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی جدوجہد نے لدھیانہ کو پنجاب کا سیاسی دل ودماغ بنادیا۔ پنجاب کی سیاست کے تمام سرچشمے اسی شہر سے جاری ہوئے۔ سیاسی فکروعمل، دینی علوم و فنون اور روحانی فیض کا جو سلسلہ ۱۸۳۶ء سے شروع ہوا وہ ۱۹۴۷ء تک برابر جاری رہا اس پورے ایک سو گیارہ برس میں لدھیانہ کے سیاسی اور انقلابی تحریکوں کے اثرات ہندوستان کے علاوہ باہر ممالک پر بھی پڑے۔

نسب:

مولانا کے نسب کا سلسلہ صرف چھ پشتوں تک ہی تاریخی دستاویز میں دستیاب ہے، جو اس طرح ہے۔

حبیب الرحمٰن بن محمد زکریا بن شاہ محمد بن شاہ عبدالقادر بن عبدالوارث بن خلیفہ جان محمد [۱]

جدامجد: (مولانا عبدالقادر لدھیانوی)

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پردادا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر بن مولانا عبدالوارث ہیں۔ مولانا عبدالقادر کے والد محترم حضرت مولانا عبدالوارث صاحب نہایت ذہین اور لائق عالم دین تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم، حفظ قرآن اور درس نظامیہ کے تمام علوم وفنون جالندھر میں اپنے والد مولانا جان محمد سے حاصل کیے۔ تحصیلِ علم کے بعد مولانا موصوف کی شادی مولانا محمد عبداللہ دانگوی کی صاحبزادی سے ہوئی، مولانا محمد عبداللہ دانگوی مولانا شاہ لطف اللہ صاحب کے خلیفہ تھے۔ مولانا شاہ لطف اللہ صاحب مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ تھے۔ [۲]

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کی پرورش اور ابتدائی تعلیم ان کے نانا مولانا عبداللہ دانگوی کی زیرِ عاطفت ہوئی۔ جب ذرا ہوش مند ہوئے تو مولانا عبداللہ صاحب جیراجپوری کرنالوی کی خدمت میں تحصیلِ علم کے لیے بھیجا گیا، جہاں انہوں نے نہ صرف علوم وفنون، حدیث وفقہ میں پوری دسترس حاصل کی بلکہ اپنے استاد سے بیعت ہوئے اور پھر خلافت بھی حاصل کی۔ مولانا موصوف فراغت کے بعد ۱۷۹۶ء میں

---

[۱] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۸۴

[۲] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۳۹۔۴۰

دہلی پہونچے اور کچھ عرصہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ یہاں حضرت سید احمد شہیدؒ آپ کے ہم درس تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پیلی بھیت کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز کیے گئے اور یہیں سے مولانا کے علم وفضل کی شہرت ہوئی، طلبا کثیر تعداد میں مولانا کے درس میں شریک ہوتے رہے۔

پیلی بھیت کے قیام کے بعد مولانا نجیب آباد تشریف لے گئے۔ ایک مسجد میں قیام کیا اور فقہ اسلامی کی مشہور کتاب ''درّ مختار'' کا قلمی نسخہ تیار کیا، اس کے بعد ۱۸۲۵ء میں مولانا اپنے وطن ولی آباد لوٹ آئے اور درس وتدریس اور ارشاد وہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔

مولانا عبدالقادر لدھیانوی تاریخ کے آئینے میں:

تاریخ میں مولانا عبدالقادر لدھیانوی ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ مولانا نے عوام کی اصلاح نفس کے ساتھ ساتھ انگریزی فوج کے خلاف جو محاذ آرائیاں کیں، ان کے اس عمل کو ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں جتنا بلند مقام دیا جائے کم ہے، ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مولانا موصوف مسلسل انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں لگے رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق مولانا محمد احمد رحمانی اپنی کتاب مضامین رئیس الاحرار میں لکھتے ہیں:

> ''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے جدامجد حضرت شا عبدالقادر صاحبؒ پنجاب میں تنہا بزرگ تھے، جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی سامراج کے خلاف لدھیانہ میں فتویٰ دیا اور انگریزی حکمرانوں سے باقاعدہ جنگ کر کے لدھیانہ شہر میں متوازی گورنمنٹ قائم کی۔ تحریک آزادی میں اپنے خاندان اور چار لائق فرزندوں کے ساتھ حصہ لیا، پنجاب کی تمام انقلابی فوجیں آپ کی زیر کمان تھیں۔ آپ کے بڑے فرزند مولانا سیف الرحمٰن نے (لدھیانہ) جیل توڑ کر سیاسی قیدیوں کو رہائی دلائی اور آپ کے حکم سے شہر پر قومی پرچم لہرا دیا گیا۔ پنجاب کی افواج اور مجاہدین کو لے کر آپ دہلی تشریف لے گئے اور دہلی کے مجاہدین وقومی افواج کے

ساتھ شامل ہوکر آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا''[1]

پنجاب سے لے کر دہلی تک جہاں بھی انگریزی فوج سے ٹکراؤ ہوا، ہر جگہ آپ فاتح رہے، مگر سوئے قسمت کہ دہلی میں جنگ کے دوران کامیابی نہ مل سکی۔ واضح رہے کہ اسی دوران اپ کے گھر کے جملہ افراد اس جنگ میں شریک رہے۔[2]

قومی افواج کی شکست اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد آپ دہلی سے نکل کر موضع ستلانہ[3] ریاست پٹیالہ کے جنگلات میں پہونچے، ان جنگلات سے راجپوت آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو اپنے خاندان میں لے آئے، اس گاؤں کے تمام افردان پڑھ اور غیر سیاسی تھے، لیکن دیانت دار، جری اور بہادر تھے۔ جب انگریزی حکومت کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانوی اور ان کا پورا خاندان ''ستلانہ'' میں موجود ہے تو پولیس اور فوج نے اس گاؤں کا محاصرہ کرلیا اور گاؤں کے باشندوں سے پوچھ تاچھ شروع کی، تمام گاؤں کے لوگوں نے یک زبان ہوکر حکومت کو یہ لکھ کر دے دیا کہ: ''لدھیانہ کے مولویوں میں سے کوئی آدمی ہمارے گاؤں میں نکل آئے تو حکومت ہمیں جو سزا چاہے دے سکتی ہے'' اس کے باوجود بھی گھروں کی تلاشی لی گئی، لیکن کہیں بھی ان لوگوں کا پتہ نہ چلا۔ چوں کہ راجپوت عورتوں نے مولانا اور ان کے خاندان والوں کو گندم کے ایسے تہ خانہ میں چھپا دیا تھا، جس کا راستہ سوائے ان عورتوں کے اور کسی کو معلوم نہ تھا۔

تقریباً تین سال تک اس بستی میں قیام رہا اور وہاں کے لوگوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے رہے، سارا گاؤں چند ہی دنوں میں مولانا کے دست حق پرست پر بیعت ہوگیا، جس سے لوگوں کے اندر ایمانی جذبہ پیدا ہوگیا، تمام رسم ورواج ختم کرکے سارا کا سارا گاؤں جوش وخروش کے ساتھ قرآنی تعلیم اور اس پر عمل کرنے میں مشغول ہوگیا۔

---

[1] مضامین رئیس الاحرار، محمد احمد رحمانی، ص:۱۱

[2] اس دوران آپ کا قیام دہلی فتح پوری کی جامع مسجد میں تھا، وہیں آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوا اور اسی مسجد کے صحن میں مدفون ہوئیں

[3] اصل نام ''ست رانا'' یعنی سچے راجپوتوں کا گھر

سفرِ آخرت:

جب انگریزی حکومت کی پالیسی میں تبدیلی آئی اور ۱۸۵۷ء کے ظلم وجبر، سفاکی و بے رحمی پر انگریزی حکومت کو افسوس ہوا اور عام معافی کے اعلان کے ذریعہ ہندوستانیوں کے تالیفِ قلوب کی کوششیں شروع ہوئیں، تو ۱۸۶۰ء میں یہ قافلہ راجپوتوں کی اس بابرکت بستی سے لدھیانہ کی طرف روانہ ہوا۔ گاؤں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر رخت سفر درست کرنے کے لیے قیام کیا، یہاں منشاء ایزدی کا اس طرح ظہور ہوا کہ مولانا شاہ عبدالقادر، جن کے فیض روحانی سے دلوں کی اجڑی ہوئی بستیاں آباد ہوئی تھیں، جن کے رشد وہدایت نے بے آب وگیاہ زمین میں روحانی گلستاں قائم کیا تھا کہ وہ اسی گلستاں میں ابدی آرام فرمائیں۔ چنانچہ پہلی ہی منزل پر شب کو بیمار ہو کر صبح کو انتقال فرما گئے، ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' اسی مقام پر آپ کی تجہیز وتکفین عمل میں آئی۔ اس جگہ کے متعلق رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کچھ اس طرح ذکر فرماتے ہیں:

> ''ایک عام بات ہے کہ جس بزرگ کے لوگ مرید ہوں، اس کی قبر عام طور پر پکی ہو جاتی ہے، اور اس پر ہنگامہ آرائیاں شروع ہو جاتی ہیں، لوگ نذر ونیاز چڑھانے اور مرادیں مانگنے لگتے ہیں۔ میں جب ۱۹۳۹ء میں قبر دیکھنے گیا تو ایک عام مسلمان جیسی بھی قبر نہ تھی اور کسی قسم کی آمد ورفت بھی وہاں نہ تھی، لیکن گاؤں میں ان کے اثر کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہی گاؤں والوں نے سنا کہ مولانا عبدالقادر کے پوتے آئے ہیں، تو گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، تمام گاؤں کے لوگ جوق در جوق میرے گرد جمع ہو گئے اور گاؤں کے لوگوں نے مجھ سے کہا: ''آپ کے دادا ہی کی برکتیں پورے گاؤں میں پھیلی ہوئی ہیں، اور انہیں برکتوں سے آج تک ہم لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں''۔ میں نے یہ واقعہ جب اپنے پیرومرشد مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم کو بتایا جو اس وقت اہل اللہ میں قطب عالم کا درجہ رکھتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ: ''معلوم ہوتا ہے کہ صاحب قبر کی نسبتِ توحید بہت مضبوط تھی۔ یہ اسی نسبت توحید کے روحانی تصرف کا نتیجہ ہے کہ قبر کی طرف متوجہ نہ ہوئے''۔ [1]

---

[1] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۶۳۔۶۲

مولانا کی سیاسی اہمیت مؤرخین کی نظر میں:

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے دینی فیضان کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی جدوجہد نے لدھیانہ کو پنجاب کا سیاسی دل ودماغ بنادیا۔ پنجاب کی سیاست کے تمام سرچشمے اسی شہر سے جاری ہوئے۔ فکر ونظر اور عمل کے میدان میں مولانا عبدالقادر صاحب کا ایک خاص درجہ رہا ہے، جسے ہندوستان کے مؤرخین نے تاریخ کے صفحات میں نمایاں اور شاندار جگہ دی ہے۔

۱۔ مسٹر ساورکر جنہوں نے سب سے پہلے ۱۸۵۷ء کی جنگ ازادی کی تاریخ انگریزی زبان میں لکھی، جس میں انہیں ۲۵ سال قید وبند کے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ اپنی کتاب ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' میں لکھتے ہیں:

> ''شہر میں ایک بااثر مولوی تھے، جو ہمیشہ وہاں کے لوگوں کو فرنگی طوق غلامی کو اتار پھینکنے اور سوراج قائم کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے اس مولوی کی تقریروں کا یہ اثر تھا کہ یہ شہر پنجاب کی انقلابی پارٹیوں کا ایک مضبوط مرکز بن گیا تھا۔ جب فرنگیوں پر اور غلامی کی زنجیروں پر ضرب آخر لگانے کا وقت آیا، تو سارا شہر مولوی صاحب کے اشارے پر بیدار ہوگیا۔ شہر میں ایک خاص جذبہ جوش رقابت تھا کہ ان فوجیوں کا بیش ازبیش ساتھ کون دے کر فرنگیوں کے ٹھکانے اور بالخصوص ان غداروں کی نشان دہی کرے، جو اپنے آقاؤں کی سرپرستی پر گھمنڈ کیا کرتے تھے''[۱]

۲۔ دوسرے مؤرخ پنڈت سندرلال اپنی کتاب ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' جو کہ انگریزی دور حکومت میں ضبط کی گئی تھی۔ اس میں لکھتے ہیں:

> ''جالندھر اور پھلور کی فاتح فوجیں دوپہر کے وقت لدھیانہ شہر میں داخل ہوئیں، لدھیانہ کا شہر پنجاب میں جنگ آزادی کا ایک خاص مرکز تھا۔ شہر میں اس دن بڑا جوش وخروش تھا۔ جیل خانہ توڑ دیا گیا تھا۔ سرکاری خزانہ پر قبضہ کرلیا گیا تھا۔ ۱۱رجون ۱۸۵۷ء کا دن تھا، جالندھر، لدھیانہ اور پھلور کی فوجیں مل کر جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے دہلی کی طرف روانہ ہوگئیں'' [۲]

---

[۱] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مسٹر ساورکر، ص: ۱۵۵

[۲] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، پنڈت سندرلال، ص: ۱۲۳

۳۔تیسرے مؤرخ خورشید مصطفٰے رضوی امروہوی اپنی کتاب ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء'' میں لدھیانہ کی قومی اور انقلابی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مولانا عبدالقادر نے شہری عوام کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ان کے دلوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔چنانچہ دوبار ہنگامہ ہوتے ہوتے بچا،ڈپٹی کمشنر نے شہریوں سے ہتھیار چھین لیے،لیکن مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر دہلی روانہ ہوگئے'' [۱]

۴۔ممتاز مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی،جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں پروفیسر تھے،وہ اپنی کتاب ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ'' میں لدھیانہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالقادر بن مولانا عبدالوارث لدھیانہ کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے مع اپنے بیٹوں کے جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا'' [۲]

حضرت سید احمد شہید سے تعلقات:

ہندوستانی مسلمانوں کے اندر تبلیغ جہاد کے سلسلے میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی اسکیم کے مطابق مختلف علاقوں اور صوبوں کا دورہ کیا جہاں لوگوں کو ہم مزاج بنایا اور ملک کی حفاظت کی غرض سے لوگوں کو جہاد کی اہمیت سے آگاہ کیا۔سید احمد شہیدؒ سے تعلقات کے متعلق محترم عزیز الرحمٰن جامعی اپنی کتاب ''رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی'' میں لکھتے ہیں:

''حضرت امام العارفین شاہ عبدالقادر صاحب لدھیانوی کے حضرت سید احمد شہیدؒ سے گہرے تعلقات تھے۔دوران تعلیم بھی سید صاحب کے ساتھ رہے،اس کے بعد تبلیغ جہاد کی کوششوں میں بھی حضرت امام العارفین سید صاحب کی اسکیم کے مطابق کچھ دنوں راجستھان میں کام کرتے رہے،اور نجیب آباد میں بھی رہے۔۱۸۳۶ء میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ نے سرحد جانے کی اسکیم کے مطابق تین خطوط لکھے،جو حضرت مولانا شاہ محمد صاحب نے

---

[۱] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء،خورشید مصطفی رضوی،مکتبہ برہان دہلی،۱۹۵۹ء،ص:۲۲۶

[۲] ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ،خلیق احمد نظامی،الجمعیۃ پریس دہلی،۱۹۵۸ء،ص:۱۹۷

شائع بھی کیے، یہ خطوط مولانا مفتی نعیم صاحب (جو حضرت مولانا عبداللہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں) کے پاس اب تک پاکستان میں موجود ہیں'' [۱]

شاہ عبدالقادرؒ کی اولاد:

امام العارفین حضرت مولانا شاہ عبدالقادر لدھیانوی کے چار فرزند تھے۔(۱) سیف الرحمٰن (۲) شاہ محمد (۳) شاہ محمد عبداللہ (۴) عبدالعزیز۔ان حضرات نے اپنے والد بزرگوار کی وراثت میں علم، حق گوئی، بہادری، فکر و تدبر اور خودداری کو پایا تھا۔تاریخ کی کتابوں میں ان حضرات کے علمی، سیاسی اور مذہبی کارنامے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ان کے اسماء گرامی اس طرح ہیں:

۱۔حضرت مولانا سیف الرحمٰنؒ:

یہ بڑے صاحب زادے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کابل (افغانستان) چلے گئے اور وہیں انہوں نے سکونت اختیار کرلی۔ وہاں انہوں نے دوسری شادی بھی کی اور دو بچے ان کے یہاں پیدا ہوئے لڑکے کا نام محمد اسحاق اور لڑکی کا نام فاطمہ رکھا۔لدھیانہ میں پہلی بیوی سے دو بچے تھے، لڑکے کا نام محمد آفاق اور لڑکی کا نام فاطمہ تھا۔رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن اپنی تحریری یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

''مولانا سیف الرحمٰن چھ فٹ کے فوجی جوان تھے، ان کو پوری فوجی ٹریننگ حاصل تھی، لدھیانہ سے قومی افواج کی دہلی روانگی کے وقت مولانا سیف الرحمٰن کو قومی افواج نے متفقہ طور پر اپنا فوجی کمانڈر بنایا تھا۔مولانا سیف الرحمٰن کی شجاعت اور ذہانت کے قصے اب تک ہمارے خاندان میں مشہور ہیں'' [۲]

کابل (افغانستان) میں مولانا سیف الرحمٰن کے خاندان کا تذکرہ کرتے ہوئے فتوائے تکفیر کے مصنف لکھتے ہیں:

''میری خواہش کافی عرصہ سے تھی کہ ہمارے خاندان کے بزرگ مولانا سیف الرحمٰن لدھیانوی

---

[۱] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۱۶۔۱۵

[۲] مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو سنٹرل جیل منٹگمری میں اپنے خاندانی حالات پر کچھ یادداشتیں قلمبند کی تھیں جو بیس اوراق پر مشتمل ہے۔

مرحوم کی اولاد کا کچھ پتہ چلنا چاہیے۔ افغانستان کی جنگ میں جو لوگ شریک ہوئے ان سے کئی دفعہ اس سلسلہ میں تحقیق کرتا رہا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، اچانک گزشتہ دنوں ۲۵ر جون ۱۹۹۶ء کو میں مرشدی و مولائی حضرت سید انور حسین نفیس شاہ صاحب مدظلہ کی خدمت میں بعد از نماز ظہر بیٹھا تھا، ان کے پاس ایک صاحب جو کہ افغانستان کی جنگ میں شریک رہے موجود تھے، مولانا سیف الرحمٰن کا اچانک تذکرہ شروع ہوگیا، تو ان صاحب نے بتایا کہ افغانستان کے سابق صدر صبغت اللہ مجددی کے علاقے شور بازار میں ایک گھرانہ قیام پذیر تھا، سنا تھا کہ ملا سیف الرحمٰن ہندی کی اولاد ہے، جو کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے رشتہ دار تھے، اب وہ علاقہ جنگ کی وجہ سے تباہ ہو چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب تک ہمارے خاندان کا سلسلہ نسب افغانستان میں چل رہا ہے'' [1]

۲۔ مولانا شاہ محمد:

آپ ایک جیّد عالم، مجاہد آزادی اور علم و عمل کے پیکر تھے۔ آزادیٔ وطن کے لیے مولانا محترم کی قربانیاں بے شمار ہیں۔ آپ ۱۸۵۷ء میں والد محترم کے ساتھ دہلی گئے پھر وہاں سے ستلانہ گئے۔ ۱۸۵۷ء کی اس تگ و دو کے بعد آپ سہارن پور، دیوبند ہوتے ہوئے کان پور تشریف لے گئے اور یہیں کچھ دنوں تک عربی کتابوں کی تصحیح کا کام ایک مطبع میں کرتے رہے اور طلبہ کو پڑھاتے بھی رہے۔ یہاں تقریباً ایک سال قیام فرمانے کے بعد پٹنہ (عظیم آباد) تشریف لے گئے، وہاں دریائے گنگا کے کنارے ایک مسجد میں قیام کیا، یہاں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے والد محترم حافظ ضیاء الدین صاحب نے مولانا شاہ محمد صاحب کو پورا قرآن زبانی سنایا۔ ۱۸۶۱ء میں آپ واپس لدھیانہ تشریف لائے اور مدرسہ عربیہ اللہ والا قائم کیا جہاں پنجاب کے طلباء کے علاوہ مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری بھی مولانا شاہ محمد صاحب سے علوم دینیہ حاصل کرنے کے لیے تشریف لائے اور حدیث وفقہ اور فنون کی بیشتر کتابیں ان دونوں بزرگوں نے مولانا شاہ محمد صاحب سے پڑھیں۔

مولانا کی زندگی کے دو کارنامے بہت اہم ہیں:

---

[1] سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، کتب خانہ اختری سہارن پور یوپی، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۶۷

الف۔۱۸۸۸ء میں جب تحریک آزادی بالکل کمزور ہوگئی۔انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانا مشکل ہورہا تھا، ہندوستان کی عوامی پارٹی کانگریس کا ابتدائی دور تھا اور بعض مسلم جماعتوں کی طرف سے کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جارہا تھا۔ایسے وقت میں آپ نے مسلمانوں کے لیے کانگریس میں شمولیت کے حق میں فتویٰ جاری کیا، جسے فتاویٰ ''نصرت الابرار'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس کے بعد کانگریس کو اور ہندوستانی عوام کو انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانے میں زبردست تقویت ملی اور پھر آپ کے فتوی کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے مختلف علماء کرام کے فتوے کانگریس کے حق میں جاری ہوئے۔ایسے نازک حالات میں مولانا موصوف نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جماعت کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کا فتوی دے کر نہ صرف ہندوستان کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا بلکہ عالم اسلام کی محافظت اور آزادی کے لیے تاریخی رہنمائی کی۔

ب۔مولانا کا دوسرا اہم کارنامہ یہ ہے کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور ہندوستان خاص کر پنجاب میں اس کے مکروفریب نے اپنا جال پھیلانا شروع کردیا، تو سب سے پہلے مولانا شاہ محمد صاحب اور ان کے بھائیوں نے مرزا کے صحیح خدوخال کو پہچانا اور تکفیر کا فتوی دیا۔اس وقت اکثر علماء نے اس کی تکفیر کو تسلیم نہیں کیا، لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کردیا کہ مولانا شاہ محمد اور ان کے بھائیوں کی طرف سے دیا گیا فتوی بالکل صحیح تھا۔

حضرت مولانا شاہ محمد صاحب نے پچیس تیس سے زائد کتابیں اور رسالے فرقہ ہائے باطلہ کی تردید میں لکھے اور شائع کیے۔ان کی مشہور کتابیں ''فتاوی قادریہ'' ''نصرۃ الابرار'' ''تنبیہ الغافلین'' ''تقدیس الرحمٰن عن الکذب والنقصان'' ''انتظام المساجد'' ''دلیل القوی'' وغیرہ ہیں۔[۱] اس کے علاوہ آپ نے کتب احادیث (موطا امام محمد اور شرح معانی الآثار طحاوی) پر حواشی لکھے۔آپ کا انتقال ۱۹۰۳ء میں ۱۳ رمضان المبارک کو لدھیانہ میں ہوا۔[۱]

۳۔مولانا شاہ محمد عبداللہ:

آپ کے تیسرے فرزند ہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ نے حصہ لیا۔بڑے درجہ کے عالم،

---

[۱] مضامین رئیس الاحرار، محمد احمد رحمانی، ص:۱۶

فقیہ اور اونچے درجے کے اولیاء میں تھے۔ ہزاروں لوگ آپ سے بیعت ہوئے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۰ء تک ستلانہ میں رہے اس کے بعد لدھیانہ آ گئے اور کچھ ہی دنوں بعد سہارن پور چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ کبھی کبھی لدھیانہ بھی آتے رہے۔

مولانا کے متعلق عزیز الرحمٰن جامعی اپنی کتاب رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں تحریر کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی لدھیانہ آیا اور اس نے اپنے مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تو مولانا شاہ محمد عبداللہ صاحب مرزا غلام احمد قادیانی کی قیام گاہ پر گئے اور مرزا کو دیکھتے ہی فرمایا یہ شخص کافر اور مرتد ہے، اس کی بیعت مت کرو، یہ اپنے آپ کو مجدد نہیں بلکہ نبی اور پیغمبر ثابت کرنا چاہتا ہے۔ مرزا کی مجلس میں اس طرح اعلان حق پر بڑا شور ہوا کہ بلا کسی دلیل کے مولانا شاہ محمد عبداللہ نے مرزا کو کافر و مرتد قرار دیا ہے۔ اس وقت مرزا کی کتاب براہین احمدیہ چھپ چکی تھی، مولانا موصوف کے بھائی مولانا شاہ محمد صاحب نے رات بھر میں اس کتاب کا مطالعہ کیا اور صبح کو مرزا کی تحریروں کی بنیاد پر مکمل فتویٰ لکھ کر شائع کر دیا کہ ان تحریروں کی بنیاد پر مرزا کافر و مرتد ہے''[1]

مولانا موصوف کا انتقال سہارن پور میں ہوا اور وہیں میاں شاہ عبدالرحیم (مجاہد آزادی ۱۸۵۷ء) کی قبر کے پاس مدفون ہوئے جو سہارن پور انبالہ سرساوا روڈ پر ریل کے پھاٹک سے تقریباً چار فرلانگ پر بائیں جانب واقع ہے۔

۴۔ مولانا عبدالعزیز صاحب:

آپ بڑے پایہ کے خطیب اور واعظ تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ ازادی میں والد محترم کے ساتھ شریک رہے۔ ۱۸۶۰ء میں ستلانہ سے واپسی پر لدھیانہ ہی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے اور وہیں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آپ سے بیعت ہوئے، ۶۳ رسال کی عمر پائی۔ آپ رشتہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے خسر بھی ہیں۔ آپ کی صاحبزادی شفاعت النساء بیگم مولانا

---

[1] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۹۱

حبیب الرحمٰن صاحب سے منسوب ہوئیں۔آپ کا انتقال لدھیانہ میں ۱۹۰۳ء میں شروع رمضان المبارک میں ہوا۔

والد محترم:

مولانا حبیب الرحمٰن کے والد ماجد حضرت مولانا زکریا صاحبؒ ملک کے مشہور اور جید علماء میں گنے جاتے ہیں۔مولانا موصوف کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی،لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مولانا کان پور تشریف لے گئے اور وہاں مولانا احمد حسن صاحب کے پاس درس نظامیہ کی پوری کتابیں پڑھیں۔مولانا محمد طیب لدھیانوی نے آپ کے استاد کا نام مولانا عبداللہ صاحب دیندار جو اپنی نوعمری میں مشرف باسلام ہوئے تحریر کیا ہے۔[۱] مولانا کے ہم سبق ساتھیوں میں حسرت موہانی اور قاری عبدالرحمٰن الہ آبادی کا نام آتا ہے۔ان دونوں بزرگ سے آپ کے ہمیشہ گہرے مراسم رہے۔مولانا حسرت موہانی نے اپنا ایک دیوان مولانا حافظ محمد زکریا صاحب کے نام سے موسوم کیا ہے،قاری عبدالرحمٰن اکثر لدھیانہ تشریف لاتے اور مولانا کے گھر قیام فرماتے۔[۲]

مولانا کی ذہانت،علمیت،حافظہ،تقوی،وطہارت اور فہم کی شہرت تھی۔حافظہ کا یہ عالم تھا کہ مکمل قرآن کریم کو تین ماہ میں حفظ کرلیا۔پنجاب کے اکثر وبیشتر علماء مشکل مسائل،فہم حدیث اور فہم قرآن عزیز کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ سے علمی فیض حاصل کیا کرتے تھے۔اگرچہ آپ نے باقاعدہ کسی جگہ درس نہیں دیا لیکن بہت دور دور سے علم دین حاصل کرنے والے آکر آپ کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کرتے۔

مولانا موصوف کے علم وفضل سے متعلق مولانا انور شاہ کشمیری نے ایک مرتبہ آپ سے فرمایا:

''مولانا اگر آپ درس وتدریس کے لیے بیٹھ جاتے تو علماء کی جماعت کو آپ کی علمی تحقیقات اور مذہبی شخصیت سے فیضان ہوتا اور وہ مقام ایک دارالعلوم بن جاتا''[۳]

مولانا موصوف اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے درمیان گہرا تعلق تھا۔حضرت شاہ صاحب ان

---

[۱] مولانا حبیب الرحمٰن،محمد طیب لدھیانوی،مخطوطہ،ص:۱۶۴

[۲] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۹۱۔۹۰

[۳] مضامین رئیس الاحرار،محمد احمد رحمانی،ص:۱۰

کی کسی بات کو رد نہیں فرماتے تھے اور ایک جید عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ کی طرح آپ کی عزت فرماتے۔اسی طرح مولانا موصوف کا مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی گہرے مراسم رہے ہیں۔۱۹۴۵ء میں جب مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جیل سے رہا ہوئے تو اس رہائی سے قبل مولانا آزاد کا ایک جوابی خط مولانا محمد زکریا کے نام آیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے۔

''حبی فی اللہ۔آپ کا خط ملا۔مولانا حبیب الرحمٰن نے اپنی قربانیوں اور استقلال سے ہندوستان کے سیاسی ممتاز رہنماؤں میں جگہ حاصل کر لی ہے۔اس دفعہ کی طویل نظر بندی میں تو وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں،میرا یقین ہے کہ اب دو تین ہی دن میں رہا ہو جائیں گے مجھے یاد ہے کہ دفتر وکیل اخبار امرتسر کے بعد کلکتہ میں بھی ملے تھے۔مجھے آپ کی ملاقات سے ہمیشہ مسرت ہوتی ہے'' [۱]

ابوالکلام۔۳؍جولائی ۱۹۴۰ء شملہ

اولاد و اخلاف:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے اپنے پیچھے مال و دولت اور زر و جواہر کے انبار نہیں چھوڑے،انہوں نے پوری زندگی ملک اور قوم کے لیے بلا کسی معاوضہ کے کام کیا،آزادی کے بعد بھی کسی چیز کے خواہش مند نہ تھے۔مولانا کے صاحب زادگان بھی اسی طرح اسلام کی خدمات میں مصروف رہے،جیسے وہ خود تھے۔یہ سب لوگ حالات کی خرابی،معاشی مشکلات کا شکار ضرور ہوئے،لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے خاندانی وقار،علم و عمل اور مذہبی طریقہ کار کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور پوری لگن سے ملکی اور ملی خدمات انجام دیتے رہے۔مولانا کو سات صاحب زادے اور چار صاحب زادیاں تھیں جن کا تعارف درج ذیل ہے:

۱۔مولانا خلیل الرحمٰن صاحب:

آپ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے۔لمبا قد،گورا رنگ،کتابی چہرہ،گفتگو اور چال میں وقار،نہایت ذہین اور پایہ کے عالم،مشکلات کے ہر دور میں اپنے والد حضرت

---

[۱] صبح امید،عزیز الرحمٰن،ص:۵

مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہے۔ جنگ آزادی میں بہترین کارہائے نمایاں انجام دیے۔کئی بار جیل جانا پڑا، جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ برسوں گجرات جیل اور پنجاب کے دوسرے جیلوں میں بند رہے،لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا۔آل انڈیا مجلس احرار کے ڈکٹیٹر رہے۔ ان کے ایک اشارے سے سینکڑوں احرار رضا کاروں نے انگریز کے خلاف بغاوت کی ۔ان کے جیل کے ساتھیوں میں آصف علی سے لے کر پرتاپ سنگھ کیروں تک شامل ہیں۔

۲۔مولانا عزیز الرحمٰن:

آپ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے دوسرے صاحب زادے ہیں۔درمیانہ قد، گورا رنگ ،آنکھوں اور چہرہ سے ذہانت ٹپکتی تھی،''رئیس الاحرار،درحدیث دیگراں''،''رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی''،''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ''اور دیگر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔آپ نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لیا۔ جیل گئے ،ہندوستان بھر کے تمام لیڈران سے واقف رہے،ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے خاص شاگردوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد دہلی کوچۂ رحماں میں مقیم رہے،صحافت کی دنیا میں آپ کا شمار بہترین صحافی کے طور پر کیا جاتا رہا ہے۔آپ نے دہلی میں ایک اسکول بھی قائم کیا جو آج بھی عزیزیہ پبلک اسکول کے نام سے موجود ہے۔

۳۔مولانا انیس الرحمٰن:

آپ رئیس الاحرار کے تیسرے صاحب زادے ہیں۔خدوخال نہایت خوبصورت،رنگ گورا،مخاطب سے جب بات کرتے تو سامنے والے پر رعب طاری ہوجاتا،آپ نے مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور سے اپنی تعلیم مکمل کی۔حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے مشہور شاگردوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نہایت ذہین اور حافظ قرآن تھے۔فراغت کے بعد برسوں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی خدمت میں رہے۔آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن لوگوں کو حضرت سے والہانہ تعلق تھا۔ اور حضرت کے خلفا میں بڑے درجہ کے مشہور خلیفہ رہے۔آپ سے سلسلہ بیعت بھی جاری ہوا،علما کی جماعت میں آپ کا ایک مقام رہا۔

۴۔مولانا محمد طیب صاحب:

آپ رئیس الاحرار کے چوتھے صاحب زادے تھے۔گندمی رنگ ،بھرا ہوا جسم،رعب دار شخصیت، علوم دینیہ کے عالم اور دنیاوی اعتبار سے گریجویٹ تھے۔دہلی میں کوچۂ رحمان میں مقیم رہے جہاں آپ کا دائرہ ایک حلقہ تک رہا۔بڑے اچھے پیرایہ میں علمی ، ادبی، اور سیاسی مسائل بیان کرتے تھے۔آپ نے رئیس الاحرار کے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کی مگر یہ کتاب آپ کی زندگی میں مکمل نہ ہونے کی وجہ سے منظر عام پر نہ آسکی،آپ کے صاحبزادے جناب زکریا صاحب ایک علم دوست انسان ہیں اور مع اہل خانہ سابقہ مکان (کوچہ رحمان،گلی شملہ والی) میں رہ رہے ہیں۔

۵۔مولانا محمد ازہر صاحبؒ:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے آپ پانچویں صاحب زادے تھے۔پتلے دبلے، درمیانہ قد،گندمی رنگ ،قبول صورت،چال ڈھال درویشانہ۔جالندھر کے مدرسہ خیرالمدارس میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔مولانا خیر محمد صاحب کے مخصوص شاگردوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

۶۔مولانا سعید الرحمٰن صاحب:

آپ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے چھٹے صاحب زادے تھے۔درمیانہ قد،گورا رنگ، رنگ وروپ وضع قطع کے اعتبار سے خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔حافظ قرآن اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے،نہایت ذہین اور پایہ کے عالم تھے،مسلمانوں کے طبقے میں خاصے مقبول رہے۔مرضی اور منشا کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے،حکام بالا سے کام نکالنے اور رسوخ پیدا کرنے میں ماہر۔لدھیانہ جوان کا ابائی وطن تھا آزادی کے بعد دوبارہ واپس آئے۔بڑی جدوجہد اور محنت کے ساتھ انہوں نے یہاں پر جامع مسجد دومنزلی واگزار کرائی، جو آزادی ہند کے وقت سکھوں نے اپنے قبضے میں کرلی تھی۔آج بھی یہ مسجد آباد ہے جہاں الحمدللہ نمازیوں کی اچھی تعداد ہر نماز کے وقت رہتی ہے۔(مذکورہ مسجد کے صحن کے جنوبی حصہ میں آپ مدفون ہیں)

۷۔مولانا محمد احمد رحمانی:

مولانا موصوف کا نسبی تعلق بھی رئیس الاحرار کے ساتھ ہے۔موصوف رئیس الاحرار کی اولاد میں

سب سے چھوٹے ہیں۔درمیانہ قد،گول چہرہ ،گورارنگ ۔ساری زندگی رئیس الاحرار کے اصول کو اجاگر کرنے میں لگے رہے۔موصوف نے ''الحبیب'' کے نام سے ایک ماہانہ پرچہ بھی نکالا،جوعرصہ تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا،بعد میں سرمایہ کی کمی اور حالات کی خرابی کی وجہ سے بند ہوگیا۔

مولانا کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں مکمل ہوئی اور شیخ الاسلام سید مولانا حسین احمد مدنی شیخ الاسلام مولانا اعزاز علی ،مولانا ابراہیم بلیاوی ،مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند،جیسے صاحب علم اور صاحب نسبت بزرگوں کی صحبت ملی۔

تعلیم کے بعد کچھ دنوں تک رائے پور میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے پاس روحانی فیض حاصل کرنے کی غرض سے مقیم رہے۔یہ دور حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ کا آخری دور تھا۔اپنے والد رئیس الاحرار کے آخری ایام میں ان کے ساتھ رہے جہاں ان سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔والد محترم کے انتقال کے بعد ان کی زندگی سے متعلق ایک مختصر کتاب مضامین رئیس الاحرار کے نام سے شائع کی جو تقریباً کمیاب ہے۔

آپ کا انتقال لدھیانہ میں ہوا اور جامع مسجد لدھیانہ فیلڈ گنج چوک کے صحن میں مدفون ہوئے۔

۸۔رقیہ بیگم:

آپ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی بڑی صاحب زادی ہیں۔بڑی عالمہ،زاہدہ اور فاضلہ رہیں۔ تقسیم ہند کے بعد راولپنڈی پاکستان میں مقیم رہیں۔آپ کے شوہر مولانا محمد یوسف صاحب پنجاب کے علما میں مشہور عالم مانے جاتے تھے، جو ہمیشہ تعلیم تعلم میں مشغول رہے،جس کی وجہ سے شاگردوں کا خاصہ بڑا حلقہ تھا۔

۹۔زبیدہ بیگم:

آپ رئیس الاحرار کی دوسری صاحب زادی ہیں۔نہایت ذہین ،عالمہ اور زاہدہ تھیں۔عرصہ تک ایک اسکول میں اسلامیات کی لکچرار رہیں،قرآن وحدیث پر بھی عبور حاصل تھا۔آپ کا انتقال تقسیم وطن کے ساتھ ہی لائل پور میں ہوا۔آپ کے انتقال سے رئیس الاحرار کو ہی نہیں بلکہ ملک بھر میں علمی دنیا کے لوگوں کو صدمہ پہونچا۔آپ کے شوہر غلام مصطفٰے صاحب ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور بڑے ہی

صاحبِ علم اور مہربان استاد تھے۔

۱۰۔خاتون جنت:

رئیس الاحرار کی تیسری صاحب زادی خاتون جنت ہیں۔علوم دینیہ کے واقف کار اور بڑے پایہ کی عالمہ تھیں۔دہلی احاطہ کالے صاحب پر ان کا گھر مسلمان بچیوں کا مرکز تھا۔قرآن اور مسائل دینیہ پڑھانے کا ان کو خاص ملکہ حاصل رہا ہے۔آپ کے شوہر جناب فراست علی صاحب صدیقی، جو ابھی باحیات ہیں اور علم دوست انسان ہیں۔

۱۱۔بلقیس فاطمہ:

آپ مولانا حبیب الرحمٰن کی چوتھی صاحب زادی ہیں۔ریاست بہاول پور مغربی پاکستان میں مقیم رہیں۔نہایت ذہین اور بذلہ سنج، مقررہ اور واعظہ تھیں۔ان کے شوہر محترم حبیب اللہ صاحب ایک بڑے عہدے پر فائز رہے۔نہایت دیندار اور صاحب علم انسان رہے ہیں۔(نیز پاکستان میں بلقیس فاطمہ ایم پی رہ چکی ہیں)

رفیقۂ حیات:

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی رفیقۂ حیات ''شفاعت النساء بی بی'' ہیں۔ پوری جدو جہد آزادی میں مولانا موصوف کے دوش بدوش سب سے زیادہ حصہ اگر کسی نے لیا تو وہ آپ کی اہلیہ ہیں۔جنہوں نے مصیبت اور مشکلات کے وقت مولانا کا ساتھ دیا اور کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ مولانا کی گرفتاری اور جدو جہد سے انہیں کوئی پریشانی ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جن عظیم ماؤں نے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں ان میں آپ کا نام سرخیوں میں آتا ہے۔آپ نے جنگ آزادی میں زبردست قربانیاں دی ہیں۔جمعیۃ العلماء، انڈین نیشنل کانگریس اور مجلس احرار کی مخصوص وفعال رکن تھیں۔مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بارہا فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر مجھے اس عالی ہمت خاتون کی رفاقت نصیب نہ ہوتی تو شاید میں اتنا سیاسی کام نہ کرسکتا''۔

مجاہد خاندان سے تعلق رکھنے والی اس عظیم خاتون کی صبر واستقامت کی مثال اس ایک واقعہ سے

بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ جب ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو گرفتار کرلیا گیا اور چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرپانے کی صورت میں آپ کے گھر کے تمام سامان کی قرقی کرلی گئی، حتی کہ زنانہ پولیس کے ذریعہ اس عظیم خاتون کا زیور اور بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں۔ جب دوسال بعد مولانا جیل سے رہا ہوکر گھر پہونچے تو گھر کی تباہی کا منظر مولانا کے سامنے تھا۔ دیواریں تک گرچکی تھیں، جہاں پردہ کے لیے کچھ پھٹے پرانے کپڑے اور ٹاٹ کے ٹکڑوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ایسے حالات میں بھی اس خاتون کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ اور تازندگی مولانا کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔

۲۷ر مئی ۱۹۴۸ء کو نمونیہ اور بخار کی وجہ سے طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ معالج کی حیثیت سے ڈاکٹر شنکر داس سے رجوع کیا گیا، لیکن مرض جان لیوا ثابت ہوا اور یکم جون کی رات کو وہ ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں۔ انا للہ الخ۔ نماز جنازہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے پڑھائی اور مسجد شاہجہانی کے سائے میں مدفون ہوئیں۔ [۱]

تعلیم:

مولانا حبیب الرحمٰن کی ابتدائی تعلیم مدرسہ حقانی میں دادا مرحوم مولانا شاہ محمد صاحب (مجاہد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) کے زیر سرپرستی ہوتی رہی، یہاں مولانا نے صرف تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی یہ مدرسہ مولانا نور محمد نے قائم کیا تھا۔

دادا محترم کے انتقال کے بعد آپ کے والد محترم نے آپ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ''نکودر'' ضلع جالندھر کے عربی مدرسے میں داخل کرادیا۔ ابتدائی دنوں میں آپ مدرسہ میں مقیم رہے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس مدرسے میں مولانا عبداللہ صاحب فاروقی کوٹلوی مدرس ہوکر تشریف لائے، چوں کہ مولانا عبداللہ صاحب آپ کے دادا مولانا شاہ محمد صاحب کے شاگرد تھے، اس لیے انہوں نے آپ کو اپنے گھر میں رہنے کو کہا، لہذا آپ مولانا عبداللہ کے گھر پر رہنے لگے اور کچھ چھوٹی کتابوں کے اسباق بھی ان

---

[۱] ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، عابدہ سمیع الدین، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص: ۲۵۲

سے پڑھتے رہے۔ یہ مدرسہ آپ کے نانا محترم نے قائم کیا تھا۔اس مدرسے میں آپ کے ساتھیوں میں مولانا احمد دین پوری، مولانا خیر محمد صاحب، مولانا عبداللہ صاحب کا نام آتا ہے۔اور آپ کے استادوں میں جناب حافظ محمد صالح صاحب، مولانا عبداللہ صاحب گلاؤٹھی والے، اور مولانا عبداللہ صاحب کوٹلوی کا نام آتا ہے۔قاری عبداللہ صاحب جو آپ کے ماموں زاد بھائی ہیں وہ بھی اس دوران اسی مدرسے کے طالب علم تھے۔آپ نے اس مدرسے میں دوسال تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد والد محترم نے آپ کو امرتسر مولانا نور احمد صاحب سیالکوٹی کی خدمت میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔مولانا شیخ بڈھے کی مسجد فرید چوک میں رہتے تھے اور وہیں ان کا مدرسہ تھا۔ وہاں آپ نے درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ ایک نابینا بزرگ سے علم تجوید حاصل کیا۔ یہاں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے ۱۹۱۴ء تک تعلیم حاصل کی۔ یہاں مولانا کے ساتھیوں میں مولانا عبداللہ صاحب، مفتی محمد نعیم صاحب، اور آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا عتیق الرحمٰن صاحب تھے۔

مولانا موصوف نے امرتسر میں ۱۹۱۴ء تک تعلیم حاصل کی، لیکن اس دوران مولانا کے ساتھ کچھ ایسے مسائل پیش آئے جس کی وجہ سے مولانا کو اسی دوران تعلیم کو خیر آباد کہہ دینا پڑا۔ کچھ گھریلو ذمہ داریاں بھی عائد ہوئی تھیں، جن کو پورا کرنے میں لگ گئے اور ملکی مسائل بھی ایسے رہے جن سے مولانا کافی الجھن کا شکار رہے۔ان حالات کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن کے صاحبزادہ محترم مولانا طیب صاحب لدھیانوی نے مولانا کے متعلق کچھ یادداشتیں تحریر کی ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں اور نامکمل بھی۔ لکھتے ہیں:

> ''ملکی، قومی اور ملی حالات اور خاندانی احساسات و کیفیات کی وجہ سے مولانا حبیب الرحمٰن کی زندگی اور طبیعت ہر وقت بے چین سی رہتی تھی۔اور وہ انگریز کے خلاف کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی دلی خواہش اور تمنا یہ تھی کہ ملک انگریز کے پنجہ سے آزاد ہو جائے، لیکن مولانا کو اس وقت بہت زیادہ دکھ ہوا جس وقت ۱۹۰۳ء میں رشد و ہدایت کی طرف گامزن کرنے والی دونوں شخصیتیں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں، یعنی مولانا مفتی محمد صاحب اور مولانا عبدالعزیز صاحب انتقال فرما گئے، اسی کے بعد آپ کی والدہ مکرمہ بہت زیادہ بیمار ہو گئیں اس پر مولانا کے والد مولانا محمد زکریا کے ماموں، مولانا عبدالواحد صاحب مولانا حبیب الرحمٰن کی والدہ کو اپنے گھر بغرض علاج لے گئے، وہاں جا کر وہ عارضی طور پر تندرست ہو گئیں، لیکن ان کا وصال

۱۹۰۶ء کے اوائل میں ہوگیا۔اس وقت مولانا کے دو چھوٹے بھائی مولانا محمد یحیٰ اور مولانا محمد حسن صاحب اور ایک چھوٹی بہن خاتون جنت حیات سے تھیں۔والدہ کے انتقال کے بعد ہی مولانا کی گھریلو ذمہ داریاں بڑھ گئیں، کیوں کہ گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی دوسری خاتون نہ تھیں اور دادی صاحبہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ان کے والد مولانا محمد ذکریا صاحب نے نکاح ثانی نہیں کیا۔مولانا نے چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال کے لیے تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیا، ان کے دادا اپنی زندگی میں علمی کام کرنے کے علاوہ مدرسہ اللہ والا سنہری مسجد میں درس بھی دیتے تھے، یہ دونوں مدرسے انہوں نے خود قائم کیے تھے۔اس کے علاوہ مولانا مفتی احمد صاحب گائے وغیرہ کی خرید وفروخت بھی کرتے تھے ہمارے آبائی بلیہ وال میں ان کی چند ایکر زمین بھی تھی، لیکن مولانا محمد صاحب کے ۱۹۰۳ء میں انتقال پر کاروبار کا سلسلہ بند ہوگیا اور آمدنی صرف بلیہ وال زمین کی بٹائی پر رہ گئی۔اس طرح مولانا کی معاشی زندگی پہلے سے زیادہ مشکلات کا شکار ہوگئی۔انہوں نے مولانا محمد علی صاحب سے گھڑی سازی کا کام سیکھا اور اس کے علاوہ وہ ہر جمعرات کو لدھیانہ کے قریب دیہات میں چلے جاتے اور وہاں سے دیسی گھی خرید لاتے اور قریب کے دیہات میں جمعرات کو ظہر سے عصر تک وعظ بھی کہتے اور جمعہ کے عصر تک واپس لدھیانہ آجاتے اور گھی چند آنے کا نفع اٹھانے کے بعد شہر میں مختلف جگہوں پر فروخت کر دیتے، اس طرح مولانا تبلیغ دین کے علاوہ رزق حلال بھی حاصل کر لیتے تھے۔مولانا کی اس عملی زندگی کا چرچا ہر طرف ہونے لگا اور وہ مولوی حبیب الرحمٰن سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بن گئے۔ اہلیان لدھیانہ و دیہات کے ہندو اور مسلمان آپ کے اس پاکیزہ زندگی کی وجہ سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے۔یہی مطہرہ اور پاکیزہ زندگی کے دن مولانا کی زندگی کے لیے مشعل راہ بن گئے اور یہی وہ ہدایت کی روشنی تھی جو ان کو پوری زندگی بھٹکنے نہیں دی اور اپنے پائے استقلال پر ہمیشہ نہایت ہی مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ بڑے سے بڑا لالچ انہیں گمراہ نہ کر سکا''۔[1]

حوالہ: مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا طیب لدھیانوی، مخطوطہ، ص:۱۶۶

عقد مسنون:

مولانا کی تعلیم کا ابتدائی دور تھا، اس وقت گھر کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ ۱۹۰۳ء کا واقعہ ہے جب کہ مولانا کی عمر تقریباً دس سال تھی۔ اسی وقت آپ کی نسبت آپ کے دادا کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی محترمہ شفاعت النساء سے طے ہوئی، لیکن شادی ۱۹۱۰ء کے قریب ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اپنے رشتہ ازدواج کے متعلق اپنی خودنوشت یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

''مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے دادا مرحوم سے مشورہ کر کے انتقال سے ایک ماہ پہلے اپنے لڑکیوں کی نسبت اپنے خاندان کے لڑکوں سے کر دی۔ میری نسبت مولانا عبدالعزیز صاحب کی چھوٹی صاحبزادی شفاعت النساء سے ہوئی۔ میری اور میری اہلیہ کی عمر بہت کم تھی۔ ایک مدت تک ہم دونوں یہ نہ سمجھ سکے کہ ہمارا آپس میں کیا رشتہ ہے'' [1]

۱۹۱۰ء کے قریب مولانا کی شادی ہوئی۔ اور اس کے بعد ان کی چھوٹی بہن کا بھی انتقال ہو گیا۔ مولانا اب تک مولانا نور احمد کے مدرسہ ہی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، کیوں کہ ان کے والد صاحب نے ان کو دوبارہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اسی دوران وہ بلقان وار کے زمانہ میں لدھیانہ آئے یہاں پر وہ تنہائی میں اور زیادہ بے چین ہو گئے، ان کے دل پر خاندان کے حالات نے بھی اثر کیا، وہ چاہتے تھے کہ انگریز جو ترکوں پر مظالم کر رہے ہیں اس کے خلاف کچھ کروں لیکن ان کو اپنی بے بسی کا پورا احساس تھا۔ ان حالات سے متعلق مولانا نے جو یادداشت تحریری طور پر قلم بند کی ہیں ان کو مولانا کے زبانی سنیے:

''.....میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں، اپنی بے بسی پر گھنٹوں مسجد کے اندر دعا کرتا اور رویا کرتا تھا کہ کوئی راستہ انگریز کے خلاف کام کرنے کا ملے، ایک دن شہر کے چند نوجوان دوستوں اور ساتھیوں سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو انہوں نے میری بات سن کر شہر میں اسلامیہ اسکول کے سامنے والے میدان میں جلسہ کرنے کا اعلان کر دیا، جلسہ کا عنوان تھا ''آج مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا وعظ ہوگا اور ترکوں کی ہمدردی میں بھی تقریریں ہوں گی'' ۔ اس اعلان کا ہونا تھا کہ شہر کے ہندو مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جلسہ میں شہر کے امراء، رؤسا، وکلاء اور

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن لدھیانوی، ص: ۹۵

ڈاکٹر،غرض کہ ہرطبقۂ خیال کے لوگ موجود تھے۔سی بی آئی کے رپوٹر بھی خاص تعداد میں موجود تھے۔اسٹیج پر میں تھااور میرے چندنوجوان ساتھی اور کسی کو یہ ہمت نہ تھی کہ اسٹیج پر آ کر بیٹھے۔تقریباً ایک گھنٹہ تک میری تقریر ہوئی۔تقریر سن کر لوگوں کے دلوں میں ہیجان پیدا ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی نوعیت کا یہ پہلا جلسہ تھا۔اسی رات میرے والد کے پاس ان کے دوست آئے اور کہا کہ آپ کے صاحبزادہ حبیب الرحمٰن دادا پردادا کے رنگ پر جارہے ہیں،میرا خیال ہے کہ صاحب زادہ پر جذبۂ شہادت سوار ہے،پھانسی سے کم ان کو سزا نہ ہوگی،اس لیے آپ ان کو مناسب طریقہ پر چلائیں،حالات ایسے نہیں ہیں کہ اتنی تیزی دکھائی جائے۔والد صاحب نے تو ان سے کچھ نہیں کہا،لیکن دوسری صبح مجھے لے کر دیوبند روانہ ہوگئے''۔[۱]

دیوبند میں داخلہ:

امرتسر کی تعلیم کے بعد مولانا ایشیا کی مشہور عربی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لیے تشریف لے آئے۔اور تقریباً سات سال تک دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے آپ کو گہرا تعلق تھا،ان کے حلقوں میں آپ شریک رہے اور علمی،مذہبی اور سیاسی بصیرت حاصل کی۔

بچپن میں دادا محترم کی نگرانی میں جس طرح آپ کی تربیت کی گئی،جذبۂ جہاد اور انگریز دشمنی کی تعلیم دی گئی،وہ آپ کے دل میں اس طرح جاگزیں ہوگئی کہ اخیر دم تک آپ اسی تربیت پر قائم رہے۔دارالعلوم کی تعلیم اور وہاں کا ماحول جس نے آپ کی زندگی کو دوبالا کردیا۔کیوں کہ دارالعلوم کا ماحول بالکل آپ کے ذہن کے عین مطابق تھا اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز بھی زمانۂ دارالعلوم سے ہی ہوا۔

مولانا اپنی خودنوشت یادداشت میں دارالعلوم میں داخلہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''دیوبند میں مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں مجھے داخل کرادیا اور میری تقریر کا سارا قصہ مہتمم صاحب کو سنادیا۔مہتمم صاحب نے اس بارے میں مجھ سے کوئی بات

---

[۱] رئیس الاحرار،عزیز الرحمٰن لدھیانوی،ص:۹۸

نہیں کی ،انہوں نے میری دیکھ بھال اور نگرانی کچھ اس انداز سے کی جس کی وجہ سے میں انہیں اپنا پہلا سیاسی استاد مانتا ہوں۔مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند میرے جذبات کی بڑی قدر کرتے تھے۔سیاسی رموز ونکات سمجھایا کرتے تھے۔اکثر پرانے بزرگوں کے سیاسی حالات میں نے ان سے سنے۔مدرسہ میں مجھے اطمنان اور سکون قلب حاصل ہوا۔مدرسہ میں اندرونی طور پر نہایت گہری سیاسی تنظیم اور تحریک چل رہی تھی جو میرے جذبات کے عین مطابق تھی'' [1]

دارالعلوم کا تعلیمی ماحول:

جس زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دارالعلوم میں بغرض تعلیم داخل ہوئے اس وقت دارالعلوم میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ،علامہ انور شاہ کشمیری،مولانا شبیر احمد عثمانی،مولانا سراج احمد صاحب، میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی،مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند،غرض یہ کہ دارالعلوم میں اہم شخصیتیں اس وقت باحیات تھیں۔ہر نئے آنے والوں کو مدرسہ میں نورانیت کا احساس ہوتا تھا۔ دارالعلوم کے طلبہ کی اکثریت ایسی تھی جو صاحب نسبت اور شب بیدار تھے۔اساتذہ کی یہ خواہش رہتی تھی کہ جو طالب علم دیوبند کے مدرسے سے فارغ ہو وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک نمونہ بن کر نکلے اور جوہر آب دار کی طرح دنیا میں چمکے۔اور طلبہ کی یہ خواہش شروع سے ہوتی تھی کہ وہ کتابی نصاب کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی فیضانِ نظر کی برکتوں سے پوری روحانی غذا لے کر یہاں سے جائیں۔ایسے ماحول میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا انور شاہ کشمیری کی خاص توجہ آپ پر تھی۔ان حضرات کی صحبت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی آنے والی زندگی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی،اور جس انداز سے مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک رہے،اس سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم وتربیت دونوں نے مولانا کی زندگی پر ایک گہرا اثر ڈالا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے حالات اور مولانا کے دور طالب علمی کے متعلق مولانا انظر شاہ کشمیری کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

---

[1] رئیس الاحرار،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۹۹

''کچھ بھی ہو اتنی بات تو واضح ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن اس دور میں اپنے اندر دعوتی رنگ پیدا کر چکے تھے اور ان کی ہنگامہ خیز طبیعت کسی مصلحتی فقدان عمل سے ساز کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کا اس پر ماحول مستزاد، کہ اس کارخانۂ علم وعمل کے بانی نے ۱۸۵۷ء کے ان ہی بکھرے ہوئے منتشر جذبات حریت کو دارالعلوم کی شکل دی تھی، جن جذبات نے لاکھوں ہندوستانیوں کے لیے سروتن کی قربانی اور گھر وبار کی ویرانی آسان تر کر دی تھی''۔[1]

مزید آگے فرماتے ہیں کہ:

''حاصل یہ ہے کہ اس فوجی معسکر میں حبیب مرحوم جیسا بانکا مجاہد طالب علمانہ داخلہ لینے کے بعد ایک جاں سپار وفدائے حریت مجاہد بن کر نہ نکلتا تو اور کیا بنتا۔ جب درس گاہ کے چھوٹے بڑے حریت پسندی کی آگ کو نگل رہے تھے اور ان کے نہاں خانے سے بھی آگ انگارے بن کر نہ نکلتی تو کیا پھر سرد پانی کے ذخیرے یا ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے سامنے آتے۔ کوئی الجھا ہوا سوال نہیں ہے، صاف اور بے غبار حقیقت کو آخر کس فلسفیانہ موشگافیوں کے نذر کر دیا جائے۔ ..... بہر حال یہ حقیقت تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا کی سہ آتشہ شخصیت میں ان کی خاندانی روایات، دارالعلوم کی حریت پسندانہ محرکات اور سرزمین پنجاب کی شعلہ نوائی کو خاص دخل تھا''۔[2]

اساتذہ:

دارالعلوم کے دورانِ تعلیم یوں تو آپ کے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا سراج احمدؒ، مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا نام آتا ہے۔ مگر جن شخصیتوں سے آپ زیادہ قریب رہے اور جن کی نظر عنایت آپ کی زندگی کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی وہ ہیں فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری، مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۰۸

[2] ایضاً، ص: ۱۰۹

مولانا حبیب الرحمٰن کی سرپرستی:

جیسا کہ ماقبل میں تحریر کیا جاچکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا لدھیانوی کے داخلہ کے بعد مولانا کی سرپرستی اور دیکھ بھال مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم نے کی۔جس کا اقرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

''انہوں نے میری دیکھ بھال اور نگرانی کچھ اس انداز سے کی جس کی وجہ سے میں انہیں اپنا پہلا سیاسی استاد مانتا ہوں''

آگے فرماتے ہیں کہ:

''مولانا میرے جذبات کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔سیاسی رموز ونکات سمجھایا کرتے۔اکثر پرانے بزرگوں کے سیاسی حالات ان سے سنے'' [1]

حضرت شاہ صاحب کی سرپرستی:

علامہ انور شاہ کشمیری وقار وتمکنت کے ایک کوہ گراں بار تھے، ہر کہہ ومہ سے ان کا بے تکلف ہونا امر دشوار تھا اور نہ زندگی کے عام معاملات سے ان کا کوئی رابطہ تھا۔مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی مولانا آزاد حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں دلی حاضر ہوتے تو ان کے سامنے دوزانو باادب بیٹھنا اپنی سعادت تصور کیا کرتے۔ڈاکٹر اقبال کا یہ قول کہ علم وفضل میں شاہ صاحب سے بڑا شخص میری نظر سے نہیں گذرا۔لیکن علامہ انور شاہ کشمیریؒ مولانا لدھیانوی کے گھر، ان کی اولاد اور ان کے خاندان سے اس طرح تعلق رکھتے تھے جیسے اپنے گھر، اپنے خاندان سے۔

حضرت شاہ صاحب سے آپ کے تعلقات دارالعلوم کے تعلیمی دور سے شروع ہوے۔مولانا اپنے اسباق اور شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوے فرماتے ہیں:

''تعلیم کے سلسلے میں میرے اسباق حضرت شیخ الاسلام فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری کے پاس تھے، مجھے فہم قرآن اور علم حدیث میں جو کچھ بھی حاصل ہوا، وہ سب حضرت شاہ صاحب کی خاص

---

[1] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۹۹

توجہ اور فیضان محبت کا نتیجہ ہے۔میں سبق کے بعد شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا ،شاہ صاحب بڑی شفقت ومحبت سے مجھے خدمت کا موقع دیتے،مولانا ادریس صاحب سکروڈوی حضرت شاہ صاحب کے خاص خدمت گذاروں میں تھے،ان سے بے تکلفی اور دوستی ہوگئی،شام کی چائے پر مولانا ادریس صاحب مجھے بھی حضرت شاہ صاحب کے ساتھ چائے پلاتے''[1]

حضرت شاہ صاحب کے درس میں:

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دیوبندی جو مولانا حبیب الرحمٰن کے قریبی دوستوں میں یاد کیے جاتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کے متعلق مولانا محمد طیب لدھیانوی اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مفتی صاحب اکثر میرے والد کا ذکر کرتے اور انہوں نے یہ واقعہ کئی بار مجھ سے بیان فرمایا کہ جب بھی حضرت مولانا انور شاہ صاحب درس حدیث دیتے تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی ان کے جوتے اٹھا کر اپنے کرتہ کے دامن میں رکھ لیتے اور جوتوں ہی کی جگہ بیٹھ کر سو جاتے اور جب حضرت شاہ صاحب درس دے کر واپس آتے تو وہ اپنے دامن سے جوتہ صاف کر کے ان کو پہنا دیتے۔ہم سب ساتھی مولانا سے کہتے کہ:جب درس میں آ کر سونا ہی ہے تو درس میں کیوں آتے ہیں،جواب میں وہ کہتے کہ (عبارت غائب ہے) اور درخواست کرنے پر حضرت شاہ صاحب کی اس دن کی پوری تقریر سنا دیتے تھے''[2]

حضرت شاہ صاحب سے گھریلو ربط:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری مولانا سے ان کے گھر،ان کی اولاد اور ان کے خاندان سے اس قدر مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور خاندان سے۔اور یہی حال مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا بھی تھا کہ آپ کو خانوادۂ انوری سے غیر معمولی شغف تھا۔مولانا موصوف حضرت شاہ صاحب سے گھریلو ربط کے متعلق کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

---

[1] رئیس الاحرار،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۹۹۔۱۰۰

[2] مولانا حبیب الرحمٰن (مخطوطہ)،محمد طیب لدھیانوی،ص:۱۷۲

''حضرت شاہ صاحب کو میری طالب علمی کے زمانہ سے ہی مجھ سے اور میرے خاندان سے اس قدر انسیت پیدا ہوگئی کہ سیاسی زندگی میں سرگرم حصہ لینے کے زمانے میں جیل میں بھی شاہ صاحب مجھ سے ملنے تشریف لائے اور سال میں ایک مرتبہ ضرور لدھیانہ میں میرے گھر تشریف لاتے۔اور کئی کئی دن قیام فرماتے۔ایک دفعہ میں جیل تھا،حضرت شاہ صاحب بلا کسی اطلاع کے گھر میں تشریف لے آئے ،اور بیٹھک میں آکر سامان رکھا اور خود ہی مولانا ادریس صاحب کے ساتھ بیٹھک کی صفائی فرمانے لگے۔گھر میں میرے بچوں کو بھی علم نہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔اچانک میری چھوٹی بچی نے شاہ صاحب کو دیکھ لیا،معذرت کی اور فوراً ہی بیٹھک کی ضروری صفائی کرنے لگی ،شاہ صاحب فرمانے لگے :''بیٹا یہ میرا گھر ہے ،گھر والے خود ہی اپنے گھر کی صفائی کرتے ہیں''۔حضرت شاہ صاحب نے تحریک خلافت کے زمانے سے لے کر تحریک احرار کے زمانے تک میری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرپرستی فرمائی''[1]

مولانا حبیب الرحمٰن نے بھی اپنے استاد کی خدمت میں کمی نہ کی ،جب بھی موقع ملتا خدمت کے لیے تیار رہتے۔چاہے مولانا کی خدمت یا مولانا کے گھر کے کسی بھی افراد کی۔حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادے مولانا ازہر شاہ مرحوم اور مولانا انظر شاہ کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند) سے جب بھی ملاقات ہوتی تو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے۔

حضرت شاہ صاحب سے گھریلو تعلقات کے متعلق مولانا انظر شاہ کشمیری کی اس تحریر سے مزید تقویت ملتی ہے:

''مولانا ایک بار غالباً جمعیۃ العلماء کی بلائی ہوئی میٹنگ میں شرکت کے لیے تشریف فرما تھے، مجھے معلوم ہوا تو ان سے ملاقات کے لیے پہونچا،مرحوم اس وقت ایک مجمع میں تشریف فرما تھے اور وہی مشہور و معروف خطابت کی آتش بازی جاری تھی ،میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولانا نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرمایا:

''میرے پاس اس وقت کچھ دینے کے لیے نہیں ہے ،اگر جمعیۃ نے مصارفِ سفر دے دیے تو

---

[1] رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۱۰۰

کچھ تمہیں بھی دے دونگا'' [1]

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:

''مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا موقع یاد نہیں پڑتا کہ ان سے ملاقات ہوئی ہو اور انہوں نے خالی ہاتھ آنے دیا ہو۔ والدہ مرحومہ ایک مرتبہ لدھیانہ کے مشہور میموریل ہسپتال میں زیر علاج تھیں، راقم بھی ان کے ساتھ تھا، اتفاقاً عید وہیں آگئی، مولانا مرحوم نے جس طرح کے ملبوسات اپنے بچوں کے لیے تیار کیے، اس سے زیادہ قیمتی اور اعلیٰ خاکسار کے لیے بھی تیار کیے اور جب اس تعلق کے اظہار کے لیے قلم حرکت کرتا ہے تو بے اختیار اپنے والد ماجد قدس سرہ کا وہ مشہور و معروف قول یاد آتا ہے:

''مجھے ہندوستان میں صرف دو ہی وفادار خاندان ملے، ایک بجنور میں مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم اور پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا'' [2]

شیخین سے محبت:

حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی۔ جو ایک زمانہ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ التفسیر بھی رہے۔ اپنے ایک مضمون ''حبیب قوم'' میں علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی محبت کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا، علامہ انور شاہ کشمیری کے عاشق صادق تھے۔ ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے وجد کیا کرتے۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے قرآن فہمی کا ذوق حضرت شاہ صاحب کی صحبت میں حاصل ہوا ہے''

آگے فرماتے ہیں کہ:

''ایک طرف حضرت شاہ صاحب سے اس قدر گہرے تعلق تھے، دوسری طرف شیخ الاسلام مولانا

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۱۹

[2] ایضاً

حسین احمد مدنی کی محبت میں کسی سے کم نہیں تھے، حضرت شیخ کو اپنا سیاسی رہنما سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ بھی مولانا سے بڑی شفقت فرماتے تھے۔ دہلی میں حضرت کا قیام دفتر جمعیۃ علماء ہند میں ہوتا اور اکثر صبح کی چائے مولانا کے یہاں نوش فرماتے'' [1]

اساتذہ سے محبت:

جہاں تک دیوبند کا تعلق ہے۔ دیوبند مولانا کا علمی گہوارہ تھا، مولانا نے جو کچھ حاصل کیا وہیں سے حاصل کیا۔ مولانا اپنی سعادت مندی، نیک طبعی اور ذکاوت و فطانت کی وجہ سے بہت جلد اس وقت کے اکابر دیوبند کے منظورِ نظر بن گئے تھے۔ انھیں مفتیٔ اعظم مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ اور مولانا میاں اصغر حسینؒ جیسے مرشدین کامل، حضرت مولانا محمد احمدؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ جیسے اصحابِ تدبر و سیاست، علامہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسے صاحب علم و فضل اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے متکلم و خطیب بزرگ، علمی و عملی رہنمائی کے لیے مل گئے تھے۔ مولانا نے ان سب سے خوب فائدہ اٹھایا اور انھوں نے بھی ان کو سینے سے لگایا۔

اپنے ان دینی، علمی اور سیاسی بزرگوں کا مولانا کے دل میں بڑا احترام تھا، جس کا ذکر کرتے بڑے ادب کے ساتھ کرتے۔ قاضی زین العابدین سجّاد میرٹھیؒ فرماتے ہیں:

''ملک کی سیاسیات اور دیوبند کے انتظامی معاملات میں اختلاف کی وجہ سے اکابر دیوبند کے حلقوں میں پہلی سی وحدت و جمعیت باقی نہ رہی تھی۔ مولانا کو اس سے بڑی دُکھن ہوئی۔ وہ سب کی خدمت میں جاتے اور جس سے جس درجہ کے تعلقات تھے ان کو نبھاتے۔ ایک دن دیوبند سے واپسی پر مجھ سے فرمانے لگے: ''قاضی صاحب جس طرح برہمن مندر میں جا کر ہر چھوٹے اور بڑے بُت کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور پھول چڑھاتا ہے۔ اسی طرح میں تو دیوبند میں سب بزرگوں کی خدمت میں جاتا ہوں اور ان کی دعائیں لیتا ہوں۔ میرے تو سب بزرگ ہیں، سب مجھ سے محبت کرتے ہیں، میں کسی گروہ بندی میں کیوں شریک ہوں؟'' [2]

---

[1] در حدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۸۳

[2] ایضاً

درس گاہیں جہاں تعلیم حاصل کیں:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے ابتدائی تعلیم سے فراغت تک کا سفر چار مدرسوں میں یکے بعد دیگرے طے کیا اور ہر جگہ آپ کے اساتذہ، باکمال اور اپنے زمانے کے بزرگ تھے۔ جن چار اداروں میں آپ نے تعلیم حاصل کی وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ مدرسہ حقانی: یہ مدرسہ آپ کے گھر پر قائم تھا۔ ابتدا سے تیسری کلاس تک کی تعلیم یہاں حاصل کی، اس مدرسے کے بانی مولانا نور محمد صاحب تھے۔

۲۔ دوسرا مدرسہ جس کا نام کتابوں میں نہیں ملتا ہے، صرف یہی تحریر ہے کہ ''نکودر'' ضلع جالندھر کے عربی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ آپ نے اس مدرسے میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔

۳۔ تیسرا مدرسہ جہاں آپ نے تعلیم حاصل کی وہ امرتسر میں مولانا نور احمد صاحب سیالکوٹی کا مدرسہ تھا جو شیخ بڈھے کی مسجد فرید چوک میں چلتا تھا۔ اس مدرسہ کا نام بھی کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ یہاں آپ ۱۹۱۴ء تک زیر تعلیم رہے۔

۴۔ بعدہٗ آپ نے فراغت تک کی تعلیم ایشیا کی مشہور یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ یہاں آپ پانچ سال رہے، یہاں آپ کو دینی تعلیم کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور علامہ انور شاہ کشمیری کی طرف سے سیاسی سرپرستی بھی حاصل رہی اور گاہے گاہے آپ مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ سیاسی مجلسوں میں شریک بھی ہوتے رہے۔

بیعت وانتساب:

حصول یقین، ترقی روحانی اور کامیابی کے راستے کی ابتدا اکثر بےچینی، اضطراب، اندرونی طلب اور سوال سے ہوتی ہے۔ مردانِ خدا اور کاملینِ راہ کی سوانح اور حالات میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے جدامجد حضرت مولانا عبدالقادر لدھیانوی، دادا مولانا شاہ محمد صاحب، مولانا شاہ عبداللہ صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب یہ وہ حضرات تھے جن سے ہندوستان کی ایک

کثیر تعداد نے بیعت وسلوک کے لیے مراجعت کی۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک آپ کے خاندان کا ہر شخص اپنے اندر دینی حمیت، جذبۂ حریت اور مجاہدانہ اسپرٹ لیے ہوا تھا۔ چنانچہ مولانا کے اندر بھی یہ باتیں اپنے اسلاف کی طرف سے جو ورثہ میں ملی تھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے زمانۂ طالب علمی کے اخیر وقت میں ہی حضرت الحاج مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ یہ حضرت شاہ صاحب کا اخیر زمانہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے کا دستور یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب سے جو شخص بیعت ہونا چاہتا تھا تو ضعف ونقاہت کی وجہ سے خود تو نہ فرماتے تھے، البتہ مولانا عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدہ بیعت کے الفاظ کہلا دیتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کے انتقال (۲۹ر جنوری ۱۹۱۹ء) کے بعد آپ نے حضرت کے خلیفہ مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری کی طرف رجوع کیا اور اخیر عمر تک اپنے پیرومرشد سے جڑے رہے۔ مولانا عبدالقادر صاحب سے آپ کو اور آپ سے مولانا عبدالقادر صاحب کو عشق کا تعلق ہوگیا۔ اسی طرح آپ کے بعد آپ کے صاحبزادگان نے بھی حضرت مولانا سے بیعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کے صاحبزادے مولانا عزیزالرحمٰن جامعی لکھتے ہیں:

> ''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی حضرت مولانا رائپوری سے آخری وقت میں بیعت ہوئے، اس کے بعد وصال ہوگیا۔ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب اپنی زندگی میں علماء لدھیانہ کے خاندان کی ہمیشہ سرپرستی فرمائی، لدھیانہ اکثر تشریف لاتے رہے اور دومنزلی مسجد میں قیام فرماتے رہے، جہاں انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں علم دین حاصل کیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت کے جانشیں خلیفہ مرشدی ومولائی حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دامت برکاتہم سے علماء لدھیانہ کے تقریباً تمام افراد بیعت ہیں۔ حضرت اقدس نے خصوصیت سے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی روحانی تربیت فرمائی اور حضرت رئیس الاحرار اپنے شیخ کامل کی اطاعت گذاری کرتے رہے۔ اب بھی حضرت اقدس علماء لدھیانہ کے تمام خاندان کی سرپرستی فرمارہے ہیں۔ رئیس الاحرار کے تمام صاحبزادوں کو اپنے

پوتوں کے درجہ میں سمجھتے ہیں اور نہایت ہی شفقت ومحبت فرماتے ہیں۔ پاکستان میں رئیس الاحرار کے صاحبزادے انیس الرحمٰن کو انہوں نے دستارِ خلافت عطا فرمائی ہے اور لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا بارہا مجلس میں ارشاد فرمایا ہے۔'' [1]

خصوصی تعلق:

مولانا ابوالحسن ندوی اپنی کتاب ''سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''تقسیم ہند کے بعد کئی مرتبہ قصاب پورہ کے محبین وخدام کی درخواست پر نواب والی مسجد میں کئی کئی ہفتے قیام ہوا اور متعدد بار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے مکان پر اسی خصوصی تعلق کی بنا پر جو مولانا کو حضرت سے اور حضرت کو مولانا سے تھا، کئی کئی روز قیام رہا اور اہل شہر نے فائدہ اٹھایا'' [2]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن ومولانا عطاء اللہ شاہ مرحوم نہ صرف حضرت سے بیعت وانتساب کا تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کو حضرت سے اور حضرت کو ان سے بہت گہرا تعلق تھا'' [3]

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے مولانا عبدالقادر صاحب کو ایک طرح کا قلبی تعلق تھا، یہی وجہ تھی کہ مولانا کے جیل جانے کے بعد ان کے خاندان اور ان کے اولادوں کی فکر اور زیادہ ہوجاتی، جب بھی کوئی ملاقاتی لدھیانہ کی طرف کا ملتا، ان سے مولانا کی اور ان کے گھر والوں کی خیریت ضرور معلوم کرتے، خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے لیے ہمیشہ بے چین نظر آتے۔

مولانا محمد علی صاحب جالندھری اپنے ایک مکتوب میں مولانا ابوالحسن ندوی کو لکھتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن منٹگمری جیل میں جب نظر بند تھے، ملاقات کی کسی کو اجازت نہیں تھی، میں رائے پور حاضر ہوا، انہوں نے فرمایا کہ'' مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے اگر ملاقات کسی طرح ہوجائے تو بہت اچھا ہے، دل ملاقات کو چاہتا ہے'' میں نے عرض کیا کہ میں انتظام

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۹۳

[2] سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص:۱۵۵

[3] ایضاً، ص:۲۶۴

کروں گا،اس پر بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا۔اور فرمایا کہ ''ضرور کوئی انتظام کریں'' سخت سردی کا زمانہ تھا، میں نے ایک ایم، ایل، اے کے ذریعے جو میرا ملاقاتی تھا، وزیر جیل منوہر لال سے اجازت لی۔بذریعہ تار ملتان اجازت کی اطلاع ملی، میں نے رائے پور اطلاع دی، حضرت والا سخت سردی میں منٹگمری تشریف لائے، میں اسٹیشن پر پہلے سے موجود تھا، رات منٹگمری میں ایک دوست کے یہاں قیام کرایا، صبح مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات ہوئی'' [1]

مولانا انظر شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

''رائے پور کی خانقاہ میں بعد مغرب اسی حال میں پایا کہ ان کے پیر و مرشد مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری ایک چارپائی پر تشریف فرما تھے اور مقابل کی دوسری چارپائی پر مرحوم رئیس الاحرار اپنی مخصوص بے تکلفی کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے''۔ [2]

بزرگوں سے عقیدت:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنی مخصوص بے تکلفی کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان کا دل و دماغ حساس عظمت کا آشیانہ تھا بلکہ اپنے اساتذہ اور اکابرین کے ساتھ وارفتگی اور عقیدت کا دل کش مرقع تھا، وہ اساتذہ کی اولاد بلکہ ان کے متعلقین سے بھی محبت و اخلاص کا معاملہ کرتے اور اپنے ساتھ والوں کو بھی بزرگوں سے عقیدت کی تلقین کرتے۔قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا ابوالحسن ندوی اور مولانا انظر شاہ کشمیری مولانا کے اپنے پیر و مرشد سے محبت و عقیدت کو ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

''زندہ بزرگوں میں حضرت شیخ الاسلام کے علاوہ حضرت امیر ملت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ العالی سے بڑی عقیدت و ارادت تھی۔مولانا اور ان کے فرزند حضرت رائے پوری سے بیعت بھی تھے۔ہر دوسرے تیسرے ماہ مولانا رائے پور تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز حضرت کے یہاں قیام فرماتے۔حضرت بھی دہلی تشریف لاتے تو مولانا کے یہاں ٹھہرتے۔ حضرت رائے پوری سے نسبت کی سعادت اس خاکسار کو مولانا ہی کے دولت کدہ پر انہی کی

---

[1] سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا ابوالحسن ندوی، ص:۲۶۶

[2] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۱۱۸

سفارش سے حاصل ہوئی اور یہ مولانا کا مجھ پر ایسا احسان ہے جسے میں تا قیامت نہیں بھول سکتا''۔ [1]

مولانا ابوالحسن ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''میں اپنے ایک عزیز شاگرد کے ساتھ لکھنؤ سے ہردوئی کے لیے پنجاب میل میں سوار ہوا، اسی درجہ میں مولانا حبیب الرحمٰن بھی سفر کر رہے تھے، کشیدہ قامت، چہرہ سرخ وسفید، پیشانی اور آنکھوں سے ذہانت اور اعتماد کا اظہار، غالباً میرے بھائی صاحب (ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب) سے وہ بار بار لکھنؤ میں مل چکے تھے۔ اسی تقرب سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت سید احمد شہید کا ذکر آیا، فرمایا:

''ہمارے بزرگ مولانا عبدالقادر صاحب اور ان کے شیخ و مرشد شاہ عبدالرحیم صاحب جن کی رائے پور میں خانقاہ ہے، سید صاحب کے بڑے معتقد تھے'' ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق دلایا، پوری گفتگو یاد نہیں۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب میرا رائے پور سے خصوصی تعلق پیدا ہوا اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد حاضری کی سعادت حاصل ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن کے آنے سے بہت خوش ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جس میں محبت واحترام دونوں شامل ہیں، لیکن محبت کا پلہ بھاری ہے۔ اپنی چارپائی کے سامنے ان کے لیے چارپائی بچھواتے ہیں، تکیہ رکھواتے ہیں۔ حضرت کی مجلس میں کم لوگ اتنی بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، جتنی مولانا۔ حضرت ان کی باتیں بغور سنتے ہیں، وہ بھی حضرت کا احترام شیخ کی طرح کرتے ہیں، لیکن اس میں محبت اور ناز کی ایک آمیزش ہوتی ہے، جو نتیجہ ہے قدیم نیازمندی، بڑے حضرت رائے پوری سے براہ راست تعلق اور بزرگان لدھیانہ خصوصاً مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی دینی خدمات، مجاہدانہ جذبات و حمیت دینی اور ایثار وقربانی کا۔ جس کا حضرت کے یہاں بڑا درجہ اور اعتراف تھا'' [2]

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۱۸۴

[2] ایضاً، ص:۱۷۔۲۱۶

مولانا انظر شاہ فرماتے ہیں:

''دہلی میں ایک باران کے صاحبزادے نے ہندوستان کی ایک باعظمت صاحب زادے کی شان میں کوئی ناروابات کہہ دی، وہ تیزی کے ساتھ اٹھے اور اپنے پاؤں کا جوتا اٹھا کر بے تکلف اس بچہ پر پل گئے۔ یہ تعبیر صورت واقعہ کی حقیقی ترجمانی کے لیے اختیار کی گئی ہے، کہتے جاتے تھے کہ: وہ صاحبزادہ تجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے اور اس کا باپ تیرے باپ سے لاکھوں مراحل آگے، پھر تجھے کیا حق ہے کہ اس صاحب زادے کے بارے میں منھ سے نازیبا بات نکالے'' [1]

غرض یہ کہ اپنے اکابر سے والہانہ تعلق اور ان کے متعلقین کی خبر گیری مولانا کا خاص امتیاز تھا۔

آزادی سے قبل مولانا اپنے پیرومرشد کے پاس وقت نکال کر ایک دو روز کے لیے جایا کرتے تھے۔ اور آزادی کے بعد جب کہ مولانا دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے تو ہفتہ عشرہ تک آپ کا قیام رائے پور میں ہوتا، لیکن شروع کے چند سال ایسے گذرے کہ مولانا اپنی ملکی سیاست میں مشغول رہتے، کلکتہ، بمبئی اور پشاور وغیرہ ان کی گذرگاہ تھی اور سہارن پور ہر جگہ کا جنکشن، اس لیے جب سہارن پور سے گذر ہوتا تو ایک دو شب قیام کے لیے رائے پور ضرور جاتے۔

تصوف کیا ہے؟

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اسی طرح کے ایک سفر کے متعلق تذکرہ کرتے ہیں:

''ایک مرتبہ میں دس بجے صبح کو اوپر کمرہ میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جا کر کہا کہ رئیس الاحرار آئے ہیں، رائے پور جا رہے ہیں، صرف مصافحہ کرنا ہے، میں نے کہا کہ جلدی بلاؤ، مرحوم اوپر چڑھے اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا، کہ میں رائے پور جا رہا ہوں اور ایک سوال آپ سے کر کے جا رہا ہوں اور پرسوں صبح واپسی ہے، اس کا جواب آپ سوچ کر رکھیں، واپسی پر جواب لوں گا۔ ''یہ تصوف کیا بلا ہے'' اس کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے مصافحہ کرتے کرتے جواب دیا ''صرف تصحیح نیت'' اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتدا

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۸۔۲۱۹

"انماالاعمال بالنیات " سے ہوتی ہے اور انتہا "ان تعبداللہ کانک تراہ" ہے، میرے اس جواب پر سکتہ میں کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے دلی سے یہ سوچتے آرہا ہوں کہ تو یہ جواب دے گا تو میں یہ اعتراض کروں گا اور یہ اعتراض کرے گا تو میں یہ جواب دوں گا، اس کو تو میں نے سوچا ہی نہیں، میں نے کہا جاؤ، تانگہ والے کو بھی تقاضہ ہوگا، میرا بھی حرج ہو رہا ہے، پرسوں تک اس پر اعتراض سوچتے رہیو، اس کا خیال رہے کہ دن میں مجھے لمبی بات کرنے کا وقت نہیں ملنے کا، دو چار منٹ کو تو دن میں بھی کرلوں گا، لمبی بات چاہو گے تو مغرب کے بعد ہو سکے گی۔ مرحوم دوسرے ہی دن شام کو مغرب کے قریب آگئے اور کہا کہ کل رات ٹھہرنا تو مشکل تھا، اس لیے کہ مجھے فلاں جلسے میں جانا ہے اور رات کو تمہارے پاس ٹھہرنا ضروری ہو گیا، اس لیے ایک دن پہلے میں چلا آیا اور یہ بھی کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے تم سے نہ کبھی محبت ہوئی نہ عقیدت، میں نے کہا علی ھذا القیاس۔ مرحوم نے کہا "مگر تمہارے کل کے جواب نے مجھ پر بہت اثر کیا اور میں کل سے اب تک سوچتا رہا، تمہارے جواب پر کوئی اعتراض سمجھ میں نہ آیا" میں نے کہا مولانا انشاء اللہ اعتراض ملنے کا بھی نہیں، "انماالاعمال بالنیات "سارے تصوف کی ابتدا ہے اور "ان تعبداللہ کانک تراہ "سارے تصوف کا منتہی ہے، اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو یادداشت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں" [1]

وفات:

دار فانی سے سبھی کو جانا ہے، لیکن جب کوئی بزرگ شخصیت دنیا سے ہمیشہ کے لیے سفر کرتی ہے تو آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں، دل چلا اٹھتے ہیں، بستیاں ویران نظر آتی ہے اور پورے عالم پر رنج والم کا ایک منظر طاری ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسے بزرگوں کا تعلق کسی خاندان یا افراد سے نہیں ہوتا، بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے یہ مشترکہ سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے چلے جانے کے بعد ہر انسان کو دکھ اور تکلیف پہنچتی ہے اور پوری انسانیت کو نقصان ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کی بے راہ روی اور گمراہیوں کے امکانات وسیع

---

[1] صحبت با اولیاء، مولانا تقی الدین ندوی، ص: ۸۵

ہوجاتے ہیں۔رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی شخصیت ایسی ہی تھی۔مولانا علم وفضل ،تقوی وطہارت، نیکی وپاکیزگی کا مجسمہ تھے اورایک ایسے سچے انسان تھے کہ جن کا ظاہر وباطن ہمیشہ یکساں رہا اور جس نے اپنی ساری عمر قومی اورملی خدمات کے لیے وقف کردی تھیں۔ایسے ہی بزرگوں کی موت کو''موت العالم موت العالَم'' کہا جاتا ہے۔ان بزرگوں کی موت حقیقت میں ان کی اپنی موت نہیں ہوتی بلکہ ان کی موت پوری دنیا کی موت ہوتی ہے۔

مرض کی شروعات:

مولانا موصوف جب اگست ۱۹۲۲ء کو لدھیانہ جیل گئے تو انہیں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ سینکڑوں رضا کاروں نے حکام کے رویہ اورکھانے کے خلاف بھوک ہڑتال کررکھی ہے۔مولانا بھی ان رضا کاروں کے ساتھ بھوک ہڑتال میں شامل ہوگئے اورکوشش کرتے رہے کہ جیل کے حکام اوررضا کاروں میں صلح ہوجائے۔مولانا کی کوشش کامیاب رہی۔جب بھوک ہڑتال ختم ہوئی تو جیل کے لنگر میں جو دال پکائی گئی تھی اس میں پرانے جوتے ڈال دیے گئے تھے،جس کی وجہ سے دال بہت بد بو دار تھی۔اس دال کو دیکھ کر رضا کاروں میں پھر جوش پھیل گیا۔مولانا اپنی خودنوشت یادداشتوں میں اس واقعہ کواس طرح لکھتے ہیں:

> ''والٹیر غصے میں بھرے ہوئے لنگر کی دال جس میں جوتے پکے ہوئے تھے۔مع پکے ہوئے جوتے کے میرے سامنے لائے، رضا کاروں کا غیظ وغضب دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ حکام جیل سے صلح کی گفتگو اور فیصلہ بجائے فائدے کے لڑائی کا پیش خیمہ بن جائے گا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ رضا کار تشدد پر اتر آئیں اور گورنمنٹ کا رویہ سخت ہوجائے، چنانچہ میں نے اس بڑے تصادم کو ٹالنے کے لیے ذرا سخت انداز میں رضا کاروں سے کہا کہ یہ جیل ہے، یہاں گھر کی طرح کھانے نہیں مل سکتے۔یہ دال کیا بری ہے۔یہ کہہ کر میں دال کا پیالہ اٹھا کر پی گیا۔میرے اس عمل نے رضا کاروں کے جذبات تو ٹھنڈے کردیے اوررضا کار اپنی اپنی جگہ پر چلے گئے،اس روز رضا کاروں نے صرف روٹی کھائی،دال نہیں کھائی۔میرا یہ حال ہوا کہ چھ دن کے فاقے کے بعد اس طرح بدبو دار دال اوروہ بھی زیادہ مقدار میں پینے سے میرے معدے کا نظام

بگڑ گیا اور مجھے خونی پیچش ہوگئی۔ چودہ دن تک مجھے خون کے دست آتے رہے۔ بڑی مشکل سے سول سرجن نے اس پر قابو پایا۔ دھرم سالہ جیل جا کر بھی کافی علاج ہوتا رہا، جس سے عارضی افاقہ ہوگیا، لیکن اس بیماری نے ایسی جڑ پکڑلی کہ ہمیشہ کے لیے معدہ کا نظام خراب ہوگیا۔ ذرا سی بد پرہیزی پر دست آنے لگتے یا شدید قسم کا قبض ہوجاتا۔ اس ایک بیماری سے دوسری بیماریاں بھی میرے جسم میں اس درجہ پیدا ہوگئیں جو زندگی میں ہر وقت ساتھ لگی رہتی ہیں۔ یہ بیماری کی وجہ سے کھانے کا ذائقہ ہی ختم ہوگیا۔ پرہیز اس طرح کا ہے مجھے لال مرچ کھائے ہوئے چونتیس سال ہوگئے، صرف نمکین شوربہ اور سبزیاں کھاتا ہوں۔ جب کبھی سرخ مرچ کھالوں، فوراً بیمار ہو جاتا ہوں۔ لیکن یہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہے کہ اس حال میں بھی پینتیس سال کام کرتا رہا'' [1]

آپریشن:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب آخری دس سال میں اکثر بیمار رہے۔ ان کے خاص معالجوں میں حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم بانی ہمدرد دواخانہ اور ڈاکٹر شنکر داس مہرہ کے نام آتے ہیں۔ حکیم عبدالحمید صاحب سے مولانا کے بڑے گہرے مراسم تھے اور مولانا کے بعد مولانا کے صاحبزادگان سے بھی حکیم صاحب کے روابط رہے۔ اسی طرح ڈاکٹر شنکر داس سے مولانا کے صاحبزادگان کا تعلق ایک گھریلو فرد کا ہوگیا تھا۔

مولانا کو جب کبھی علاج و معالجہ کی ضرورت پیش آتی تو مذکورہ دونوں حضرات سے آپ رابطہ کرتے اور نسخہ تجویز کراتے۔ انتقال سے کچھ قبل جب مولانا کو پیٹ میں درد محسوس ہوا تو آپ نے ڈاکٹر شنکر داس سے رابطہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرض کی تشخیص کے بعد آپریشن کا مشورہ دیا۔

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لکھتے ہیں کہ:

''اگست ۱۹۵۶ء میں مولانا کو آنت کے سوج جانے کا درد ہوا تو ڈاکٹر شنکر داس مہرہ نے مرض کی

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۱۸

تشخیص کے بعد مولانا کو گنگا راج ہسپتال میں آپریشن کے لیے داخل کرایا۔ جہاں میڈیکل آفیسر ڈاکٹر ایس۔ ایم کول کی زیرنگرانی مشہور سرجن ڈاکٹر کھیڑ نے مولانا کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا"۔[1]

ذمہ داریوں سے سبکدوشی:

غالباً مولانا کو اپنے وقت موعود کے قریب تر ہونے کا اندازہ ہوگیا تھا کہ اب سفر آخرت قریب ہے اور مالک حقیقی سے وصل ہونے والا ہے۔ چنانچہ مولانا نے چند روز قبل ہی تیاریاں شروع کردی تھی۔ آخری چند دنوں میں جو مولانا کے اقوال وافعال تھے اس سے اس کا اندازہ صاف طور پر لگایا جاسکتا ہے۔ درجہ ذیل مولانا کے چند اقوال وافعال یہ ہیں:

(۱) ۳۰ اگست ۱۹۵۶ء کو اپنے بچوں اور ساتھیوں کو بٹھا کر فرمایا کہ اب میں کام سے بہت تھک گیا ہوں، اس لیے تمام فائل بند کردیے جائیں تمام خطوط لکھنے کا سلسلہ آج سے منقطع ہوگا۔

(۲) مولانا نے اسی مجلس میں اپنے دونوں (انگریزی اور عربی کے) سکریٹریوں کو بھی ان کی خدمات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد انہیں کام کرنے سے سبکدوش کردیا۔

(۳) اسی دن شام کو اپنے بچوں اور بچیوں کو بٹھا کر فرمایا کہ یکم تاریخ سے گھر کا کام کاج خود دیکھو، خود کرو اور خود چلاؤ۔ پھر نام بنام سب کو دعائیں دیں کہ دین ودنیا تم سبھوں کی اچھی ہو۔ تم سب نے میری بڑی خدمت کی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں خوش وخرم رکھے۔

(۴) یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کو مولانا نے "انجمن حمایت الاسلام" (جو مولانا ہی کا قائم کردہ تھا) کا پہلا جلسہ اپنے دولت کدہ پر بلایا۔ جو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی صدارت میں ہوا۔ جلسہ کے ختم ہوجانے کے بعد مولانا نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا: "آج میرے سینے کا بوجھ ہلکا ہوگیا"۔[2]

(۵) علی الصباح مولانا کا معمول کمپنی باغ تک ٹہلنے کے لیے جانے کا تھا، مگر آپریشن کے بعد سے جسے دو ماہ گذرے تھے، رکشا میں آتے جاتے تھے۔ اس روز خلاف معمول پیدل واپس ہوگئے اور راستہ بھر

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۳۴

[2] ایضاً، ص: ۱۵۸

دوکان داروں اور محلّہ والوں سے سلام ومصافحہ کا سلسلہ جاری رہا۔[1]

(۶) یکم ستمبر کی رات کے دس بجے تک مولانا محمد احمد کاظمی، مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی، خان صاحب عبدالصمد خان رئیس مالیر کوٹلہ اور دیگر دوستوں سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی کے مسئلہ کے متعلق خاص طور پر ان سے باتیں کرتے رہے۔ شب کو دس بجے اپنے ذاتی خادم حافظ خلیل احمد سے فرمایا ''حافظ صاحب اگر میں مرگیا تو میرے بعد قرآن مجید پڑھ کر بخشنا بھول نہ جانا''

مذکورہ بالا چند واقعات وحالات سے بجا طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا کو اپنے وقت موعود کا اندازہ ہوگیا تھا۔ یقیناً ان حالات واقعات سے مولانا کی بزرگی کا پتہ چلتا ہے۔

سفر آخرت:

مولانا یکم ستمبر ۱۹۵۶ء تک اپنی تمام ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرچکے تھے۔ دن بھر اپنے گھریلو مسائل، دوستوں سے ضروری گفتگو اور مشورہ کے بعد، بعد نماز عشاء قاضی زین العابدین میرٹھی، مولانا محمد احمد کاظمی اور دیگر احباب سے شب کو دس بجے تک گفتگو ہوتی رہی، پھر مولانا آرام فرمانے لگے۔

۲ر ستمبر کی صبح کو چار بجے بیدار ہوگئے۔ گرمی سخت تھی، خود وضو کرکے نفل پڑھی، مہمانوں کو جگا کر مسجد میں بھیجا تو معلوم ہوا کہ اذان ابھی نہیں ہوئی ہے۔ اذان کے بعد نماز پڑھی نماز کے بعد خاموش وظیفہ حسب معمول کرتے رہے۔ ساڑھے چھ بجے میونسپل باغ چاندنی چوک میں سیر کے لیے تشریف لے گئے واپسی پر مہمانوں کے لیے ناشتے کا سامان لیا اور تمام کو چہ رحمان کے دکان داروں سے سلام ومصافحہ کے بعد گھر تشریف لے آئے۔ ناشتے کے بعد مولانا اپنے دوستوں سے گفتگو کرتے رہے۔ دوران گفتگو استنجے کی حاجت ہوئی تو زنان خانہ تشریف لائے۔ اندر جاکر اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ لڑکھڑاتے ہوئے نکلے اور اپنے لڑکے مولانا سعید الرحمٰن سے کہا ''میری طبیعت سخت خراب ہورہی ہے۔ عرق گلاب پلاؤ عرق گلاب دیا گیا ایک گھونٹ پینے کے بعد زور زور سے کلمہ شریف پڑھنے لگے۔ تیسری بار کلمہ شریف پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

Maulana Azad Library
Acc. 1-6236

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۶۸

مولانا کے انتقال کے بعد کا منظر مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں:

''گھر میں آہ وبکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔دوسروں کے ساتھ میں بھی افتاں وخیزاں گھر میں پہونچا۔حضرت مولانا بستر مرگ پر دراز تھے،نورانی پیشانی پر پسینہ کے موتی لرزاں تھے اور خاموش ہونٹوں پر تبسم کی موجیں رقصاں تھیں'' [1]

۲رستمبر ۱۹۵۶ء کی صبح کو یہ آفتاب حریت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ان کے انتقال سے ملک کو بھاری نقصان پہنچا۔ان کا وجود ملت کا قیمتی سرمایہ تھا۔جو مذہبیت اور دینداری کے ساتھ ملکی اور قومی خدمت، ایثار اور قربانی کی تاریخ بھی رکھتا ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کی خبر ریڈیو کے ذریعہ نشر کی گئی ،ملک و بیرون ملک نے اس المناک خبر کو عوام تک پہنچایا ۳رستمبر کے تقریباً تمام اخباروں نے مولانا کے سانحہ ارتحال کو اپنی سرخی بنا کر ملک وملت کے لیے ایک المناک حادثہ بتایا۔ملک وبیرون ملک میں قرآن خوانی ہوئی۔ مولانا کے انتقال کی خبر کا کسی کو بھی یقین نہیں آیا تھا،لیکن حقیقت اپنی جگہ تھی ،آناً فاناً ہزاروں آدمی جمع ہوگئے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنے سیکریٹری کو پھول دے کر بھیجا۔حکومت ہند کے وزراء وافسران کی ایک بہت بڑی تعداد آخری زیارت کے لیے آئی۔

نماز جنازہ:

مولانا کے جنازہ میں شریک ہونے کے لیے اطراف وجوانب سے لوگ جوق در جوق آئے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی کافی تعداد میں اپنے بزرگ رہنما کے آخری دیدار کے لیے آئے،جس میں خاص طور پر ہندوؤں کے علاوہ سکھ بھی تھے،جنہیں مولانا سے ایک خاص لگاؤ تھا۔بہر حال ایک بھیڑ تھی جو مجاہد وقت کے آخری دیدار کے لیے اُمڈ پڑی تھی اور جنازے کے جلوس میں شامل ہوکر مولانا کے آخری آرام گاہ تک گئی۔مولانا عزیز الرحمٰن جامعی تحریر فرماتے ہیں کہ:

---

[1] درحدیث دیگراں،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۱۸۷

''ایک بجے مولانا کے جنازے کا جلوس گھر سے روانہ ہوا۔ جامع مسجد شاہ جہانی میں کوئی بیس ہزار آدمیوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی، جو یکم ستمبر کی شام کو مل کر دیوبند تشریف لے گئے تھے، پھر دوبارہ دوسرے دن موٹر سے نماز جنازہ پڑھانے تشریف لائے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس طرح اپنی کامیاب اور پاکیزہ زندگی گذار کر ہمیشہ کے لیے دنیا والوں سے جدا ہوکر بارگاہ رب العلمین میں حاضر ہوئے۔

دلی جامع مسجد کے ملحقہ قبرستان میں جہاں پہلے سے آپ کی اہلیہ کی قبر تھی، اسی کے قریب تقریباً تین بجے آغوش لحد میں رکھ دیا گیا اور آپ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند میں آرام فرما ہوگئے'' [1]

مولانا کی عظمت اور بزرگی سے متاثر ہوکر ان حالات کو مولانا انظر شاہ کشمیری اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''ایک نافراموش ہونے والی شخصیت، بلکہ فراموش نہ کی جانے والی ہستی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی تھی۔جن کا آفتاب زندگی سپہر ہندوستان پر طویل گردش کے بعد دلی مرحوم کے افق میں ہمیشہ کے لیے چھپ گیا۔شاہجہانی مسجد کے زیر سایہ، نمناک خاک کے نیچے، عظمتوں کا ایک مینار، تقدس کی محراب، شرف ورفعت کا ممبر، عزم کا ہمالہ، تدبیر وتدبر کا ایک آتش جوالہ پڑا سوتا ہے۔اسی مسجد کے شمالی دروازے پر کھڑے ہوجایئے، بلند وبالا سیڑھیوں پر نظر ڈالیے، اس نظر کی پہلی منزل ایک غیور انسان کی ابدی خواب گاہ ہے، سامنے سڑک اور دریبہ کلاں کے چوک ہیں۔بے تاب انسان، دوڑتا، بھاگتا، ہانپتا کانپتا، گرتا پڑتا نظر آئے گا۔ انہیں کیا معلوم کہ اس سے متصل چہار دیواری میں ایک طوفان رکا ہوا ہے۔یہ کیا جانیں کہ ایک آندھی جس نے پورے ہندوستان کو کبھی زیروزبر کردیا تھا، وہ یہاں آکر تھم گئی۔بقول شاعر:

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہے خاک انتہا یہ ہے [2]

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۳۷

[2] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۰۳

قطعہ تاریخ:

محترم جناب محمد ادریس نسیم دہلوی صاحب مولانا مرحوم کی قطعہ تاریخ اس طرح پیش کرتے ہیں:

حضرت مرحوم نے دنیا کو پایا بے وفا　　چل دیے خالق سے ملنے کے لیے وہ باکمال

تھے وہ بطل حریت اور قوم پر قربان تھے　　تھے سلف کی طرح وہ بھی ایک فرد بے مثال

سال چاہو چار کا ماتم کرو تم چار سو

محرم دانا مرنجان شیر دل گردوں جلال

۳۴۴　۳۴۴　۳۴۴　۳۴۴

نوٹ: مصرع تاریخ کے چاروں لفظوں کے اعداد جمع کریں تو مولانا مرحوم کا سال وفات برآمد ہوتا ہے اور چوں کہ ہر لفظ کے اعداد مساوی ہیں لھذا ہر ایک کو چار پر ضرب دیں تو بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے۔

آفتاب حریت وائے قسمت شد غروب　　ہر کہہ و مہ از غمش مبتلائے آہ گشت

فکر کردم سال دارنہ سروش آمد ندا　　سال رحلت ارتحال خلیل اللہ گشت [1]

۱۳　ھ　۷۶

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۴۳۔۳۴۴

فی رثاء المولانا حبیب الرحمن اللدیانوی رحمة الله علیه

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب عمری، مبارکپوری، مولوی، فاضل، ایم۔اے، ایل۔ایل بی

الهفی مضی برتقی مدبر — فقیه کاشیاخ الحدیث محیر
وما احسن المنطیق ان مات عالم — اذا مات منا عالم متبحر
له درجة فی حومة الحرب والعلیٰ — یطوف بها الاجبال لکن تحسر
الا یومنا قد مل ذما نجیعه — لان مات من یمناه اهدی وانور
وانک للمشکور عن کل عالم — وانا لفرط الاحتظاء لنشکر
فانک راع فی مضیق المسالک — یسوق ویهدی حیثما کان اجدر
کانک شمس فی نجوم طوالع — وانک فی ظلماتنا الاسکندر
شموش تروی نفسها بجماله — کما تجتنی الاقمار منها تنور
دعائی بان تخشیٰ وتحمی وتکرما — الی ان اقمار اتهل وتبدر
حکی جوده صوب السماء اذا سجت — اعز متاع فی عیونک یصغر
کرویتنا الاقمار تروی عیوننا — تقروتروی عالما وتنور
کمثل الغوادی والسواری یرونه — لانک من فرط السخاء مبذر
حبیب الینا ماحبیب الهنا — اطابت غواد مابه الحب مضمر
تهیم سماء عن وراء حبیبها — وارض بتسکاب الغموم تبحر
الهفی بهند تستضیه وتجتنی — قطوف المزایا مابجدک تقدر
جزی الله مولانا حسین احمد الذی — امانی اقوام به تتزهر
قرین العلی قام العتیق له اذا — وحفظ اساس القوم لایتقصر
لعمری کهارون وموسیٰ وروحه — هدیتم هدایة وارث یتقرر

یطیب مایزری البریة طیب
کماء ینقی ثوبکم ویطهر

ترجمہ:

۱۔ افسوس کہ محدثین جیسا نیک، متقی اور مدبر گذر گیا

۲۔ کیا خوب کہنے والے نے کہا کہ جب کوئی عالم متبحر مر جائے تو سمجھنا چاہیے کہ دنیا مر گئی

۳۔ ایک ایسے شخص کے فوت ہونے کے باعث جو کہ ہادی و رہبر تھا، ہمارے دن تاریک ہو گئے

۴۔ ہماری طرح سارے علماء آپ کے مرہونِ منت ہیں

۵۔ کیوں کہ نازک ترین معاملات میں بھی آپ کی رہنمائی کامیاب ہوتی تھی

۶۔ چمکنے والے ستاروں میں تو سورج اور ہماری تاریکیوں میں تو اسکندر ہے

۷۔ آفتاب اس کے حسن سے مستفیض ہوتے ہیں جس طرح کہ چاند سورج سے

۸۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ معظم و مکرم رہو جب تک چاند ہلال اور بدر بنتے رہیں

۹۔ گھنگھور گھٹاؤں نے اس کی سخاوت کی نقل کی، عزیز ترین سامان بھی اس کی نظروں میں حقیر ہے

۱۰۔ جس طرح رویتِ قمر ہماری آنکھوں کو سیراب کرتی اور ٹھنڈک پہنچاتی ہے، تو دنیا والوں کو منور اور سیراب کرتا اور ٹھنڈک پہنچایا کرتا تھا

۱۱۔ لوگ تمہیں صبح و شام برسنے والی بدلیوں کی طرح (سخی) خیال کرتے ہیں، کیوں کہ آپ فرطِ سخاوت کی وجہ سے فضول خرچ (خیال کیے جاتے ہیں)

۱۲۔ حبیب الرحمٰن پروردگار کو بھی محبوب ہیں اور ہمیں بھی، محبت کے اس مدفن کو بدلیاں تر و تازہ رکھیں

۱۳۔ اپنے حبیب کی جدائی میں آسمان سرگرداں ہے اور زمین غموں کو بہا کر دریا بنا رہی ہے

۱۴۔ ہندوستان پر افسوس جو تیری کوششوں سے حاصل شدہ مراعات سے مستفیض ہو رہا تھا

۱۵۔ مولانا حسین احمد کو اللہ جزائے خیر دے جن کی بدولت قوموں کی تمنائیں شگفتہ ہو گئیں

۱۶۔ (مرحوم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے) عتیق الرحمٰن جو صاحب عزت ہیں اور حفظ الرحمٰن جو قوم کی اساس ہیں، حاضر ہیں

۱۷۔ زندگی کی قسم ہارونؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی طرح آپ لوگوں نے وراثتِ نبوی کا حق ادا کیا

۱۸۔ جس طرح پانی کپڑے کو پاک و صاف کر دیتا ہے (قاری) محمد طیب قوم کی خرابیوں کو دور کرتے ہیں [1]

---

[1] ماہنامہ برہان، دسمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۵۹-۶۰

اخبارات ورسائل:

مولانا لدھیانوی کی وفات پر ملک وملت کے بیشتر افراد نے خون کے آنسو ٹپکائے۔ جن میں سیاسی مبصرین بھی ہیں، ادیب وشعراء کے علاوہ محدثین وفقہاء کی ایک لمبی جماعت بھی، نیز اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی اخبارات ورسائل میں اپنے دلی احساس وجذبات کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں کچھ اخبارات و رسائل سے اخذ کردہ چند سطور بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی

دہلی ۳ر ستمبر۔

الجمعیۃ بڑے رنج والم کے ساتھ یہ روح فرسا اطلاع دیتا ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا آج صبح تقریباً ۶۴ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ان چند برگزیدہ ہستیوں میں تھے جنہوں نے آزادیٔ وطن کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں اور پوری زندگی ملک وملت کی خدمات میں صرف کی۔ وفات کی اطلاع ملتے ہی حضرت سبحان الہند مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا میاں صاحب قائم مقام ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، جناب محترم حاجی صالح صاحب خادم جمعیۃ علماء ہند واخبار الجمعیۃ نیز ڈاکٹر شنکر داس صاحب مہر، مولوی اخلاق حسین صاحب قاسمی اور دیگر اصحاب مولانا مرحوم کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے اور اظہار تعزیت کیا۔[۱]

۲۔ روزنامہ ''نئی دنیا'' دہلی

یہ خبر انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی جائے گی کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی آج صبح ۸ بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا ملک کے ان بزرگوں میں سے تھے، جنہوں نے اپنے آباء واجداد کی روش پر قائم رہتے ہوئے شروع سے ہی ملک کی جدوجہد آزادی میں کانگریس کے ساتھ تعاون کیا۔

مولانا جدوجہد آزادی میں اپنی خدمات کے باعث قوم پرست حلقے میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مولانا کی موت پر ہر طرف اظہار رنج وملال کیا جارہا ہے۔

---

[۱] الجمعیۃ۔ ۴ر ستمبر ۱۹۵۶ء

ادارہ نئی دنیا مولانا کے پسماندگان خصوصاً ان کے صاحبزادگان کے ساتھ دلی ہمدردی کرتا ہے اور دعاء کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل۔[1]

۳۔ روزنامہ ''نوائے پاکستان'' لاہور

ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

.....آج ہم یہ المناک خبر سن رہے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند کی مایہ ناز شخصیت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی ۲ر ستمبر کی صبح کو پوری ملت اسلامیہ کو سوگوار چھوڑ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا علم وفضل، زہد وتقویٰ اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے ایک منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ مولانا کا خاندان ملک بھر میں ممتاز اور معروف تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے محاسن وکمالات اور آپ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؔ نے ایک دفعہ آپ کے متعلق کہا تھا:

''مولانا۔ آپ کو دیکھ کر فاروق اعظم حضرت عمرؓ یاد آجاتے ہیں''

ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا کی وفات سے ملت اسلامیہ کو جو نقصان عظیم پہنچا اور آپ کی موت سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کی تلافی مشکل ہوسکے گی۔

مولانا کی وفات سے پاک وہند ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام سوگوار ہے (شریک غم ادارہ نوائے پاکستان)[2]

۴۔ روزنامہ انقلاب بمبئی

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا کل حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ احراریوں کی جو تحریک اٹھی اس کے بانیوں اور ممتاز لیڈروں میں مولانا حبیب الرحمٰن کا شمار تھا۔ آپ بڑے عالم اور بہت اچھے مقرر تھے۔ صاف گوئی اور بے باکی آپ کا طرّہ امتیاز تھا اور آزادئ وطن کی جدوجہد میں آپ نے بیش از بیش قربانیاں پیش کیں، مصائب جھیلے اور بارہا قید وبند کو لبیک کہا۔ خدا مرحوم

---

[1] روزنامہ نئی دنیا دہلی۔ منگل، ۴ر ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] روزنامہ نوائے پاکستان، لاہور، ۶ر ستمبر ۱۹۵۶ء

کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔[1]

(۵) روزنامہ ملاپ دہلی

مولانا حبیب الرحمٰن کا دیہانت

جہانِ فانی سے جانا سب کو ہے۔ لیکن جب کوئی ایسا آدمی جاتا ہے جو ملک کے لیے اور عوام کے لیے مفید کام کرتا رہا تو دکھ ہوتا ہے۔ ہر جانے والے کے لیے کچھ نہ کچھ لوگ روتے ہیں، لیکن جب ملک کا خادم جاتا ہے تو لاکھوں آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں، ہزاروں دل چلا اٹھتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن ایسے ہی سجن تھے۔ ان کے چلے جانے سے ملک کو نقصان ہوا، پنجاب کو نقصان ہوا..... انہوں نے اپنا سارا جیون دیش اور قوم کی سیوا میں بتا دیا۔ جانا سب کو ہے۔ کاش! کہ ان کے جیسا جیون سب کو ملے، ان کے جیسی موت بھی سب کو ملے۔[2]

(۶) پیام وطن دہلی

ملک کے مایہ ناز وطن پرور رہنما مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا انتقال پر ملال۔

پیام وطن کے قارئین اور ملک کے وطن پرور حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ آج صبح آٹھ بجے مشہور وطن پرور رہنما اور جنگ آزادی کے مجاہد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی دماغ کی رگ پھٹ جانے سے اچانک رحلت فرما گئے۔ انا للہ الخ۔

مولانا مرحوم ایک اچھے عالم دین ہونے کے ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی کے انتھک سپاہی اور جرنیل تھے آپ تحریک آزادی کے سلسلے میں تیرہ بار جیل گئے.....[3]

(۷) سماج لدھیانہ

''قوم پرست حلقوں کی ایک اور شمع بجھ گئی''

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی آخر کار چل بسے۔ ان کی عمر زیادہ نہ تھی اس لیے ان کی اس عمر میں

---

[1] روزنامہ انقلاب بمبئی ۴ر ستمبر ۱۹۵۶

[2] روزنامہ ملاپ دہلی، بدھوار ۵ر ستمبر ۱۹۵۶ء

[3] پیام وطن ۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء

وفات پر بہت دکھ ہوا، لیکن لدھیانہ والوں کو فخر سے سر بلند کرنا چاہیے کہ ان کے شہر کا ایک بزرگ آخر دم تک اتحاد کا پرچار کرتا ہوا ان سے جدا ہوا۔ مولانا کی ساری عمر انگریز کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے گذری۔ مولانا میں وطن کی آزادی کا جذبہ کوئی نیا نہ تھا، ان کو پیدائش کے بعد تربیت ہی اس قسم کی ملی ہوئی تھی۔

.....مولانا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ انگریز کے خلاف عوام میں نفرت کا پرچار کرنے میں سب سے آگے رہتے تھے۔ آخر کار ان کی قربانیوں سے ملک آزاد ہوا۔ ادارہ سماج کو مولانا کی وفات پر سخت دکھ ہے۔[1]

(۸) روز نامہ پرتاپ نئی دہلی۔

''آہ مولانا حبیب الرحمٰن''

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی چل بسے..... وہ جتنے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے اتنے ہی سچے نیشنلسٹ۔ ان کی قوم پرستی حقیقی تھی، نمائشی نہیں، ہر سوال کو وہ قوم پرستی کے زاویہ سے دیکھتے تھے اور ان مسائل سے جو بظاہر فرقہ وارانہ نظر آتے تھے ایسا خوبصورت قوم پرورانہ پہلو نکال لیتے تھے کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے تھے..... آزمائش کے کئی مواقع آئے، لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔[2]

(۹) روز نامہ خدمت منٹگمری

گذشتہ روز حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی وفات حسرت آیات کا حادثہ پیش آیا جو خصوصیت سے بھارتی مسلمانوں کے لیے ایک المناک، نا قابل تلافی قومی نقصان ہے۔

.....موت کے طوفان نے اس چراغ کو بجھا دیا ہے جس کی روشنی کی ضرورت تھی، جس سے بھولے بھٹکے لوگوں کو رہنمائی حاصل ہوتی تھی۔ ہم بارگاہ ایزدی میں بصمیم قلب دست بدعا ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ آمین۔[3]

(۱۰) روز نامہ سنسار دہلی

وجود اور عدم کو سمجھ کے ہستی میں　　تعینات سے گزرا وہ مرد آفاقی

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا انتقال ہو گیا اور وہ کتاب زندگی ختم ہو گئی جو چونسٹھ برسوں تک،

---

[1] سماج۔ لدھیانہ، ۶ر ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] روز نامہ پرتاپ نئی دہلی، مورخہ ۵ر ستمبر ۱۹۵۶ء

[3] روز نامہ خدمت منٹگمری، ۵ر ستمبر ۱۹۵۶ء

جہد مسلسل اور عزم مستقیم کی ایک ضخیم کتاب تھی۔.....مولانا آخر وقت تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی ایسوسی ایٹ ممبر بھی تھے اور قوم پرست مسلم طبقہ میں ان کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی جاتی تھی، خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے اپنے پیچھے کچھ ہم خیال بھی چھوڑے ہیں اور اپنے صاحبزادوں کو قوم اور سماج کی خدمت کے لیے تیار کیا ہے۔[۱]

(۱۱) ویکلی تیج دہلی

.....مولانا حبیب الرحمٰن دیش کے ان لیڈروں میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھی تھیں،.....وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس نے پنجاب میں کانگریس اور جذبہ آزادی کی پرورش کی، یہی وجہ ہے کہ پردھان منتری شری نہرو تک مولانا صاحب کی قدر کیا کرتے تھے ان کا انتقال یقینی طور پر ایک قومی نقصان ہے، ان کی وفات سے ایک عظیم محبّ وطن اٹھ گیا ہے۔[۲]

(۱۲) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ

مولانا حبیب الرحمٰن کی وفات کی خبر ملی۔ مرحوم ملک وملت کے پرانے خدمت گذار، مجلس احرار کے مشہور لیڈر اور جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدین میں تھے اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ کانگریس سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا، جو ہر زمانہ میں برابر قائم رہا.....طبعاً بڑے خاکسار، متواضع، فیاض اور مہمان نواز تھے، دارالمصنفین کے لوگوں سے بڑا اخلاص رکھتے تھے.....مگر ۲؍ستمبر کو قلب کا دورہ پڑا اور دفعتاً انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ اس پرانے خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔[۳]

(۱۳) ماہنامہ برہان دہلی

افسوس ہے اس ماہ کی دو تاریخ کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک معمولی دورۂ قلب کے بعد ۶۴؍برس کی عمر میں اچانک رہ گرائے عالمِ جاودانی ہوگئے.....لیکن چوں کہ وہ موروثی اور خاندانی طور پر ایک مجاہد، بطل حریت اور زعیم قوم تھے، اس لیے تعلیم سے فراغت کے بعد ہی عملی سیاست کی وادئ پر خار میں کود پڑے،..... وہ جہاں کہیں رہے اور جس محفل میں بیٹھے ممتاز اور نمایاں ہوکر رہے،..... عجیب اوصاف وکمالات کے بزرگ تھے۔ ان کی کس کس خوبی کو بیان کیا جائے۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔

---

[۱] روزنامہ سنسار دہلی۔ منگلوار ۴؍ستمبر ۱۹۵۶ء

[۲] ویکلی تیج دہلی، ۴؍ستمبر ۱۹۵۶ء

[۳] ماہنامہ معارف، شمارہ ۳، ج ۷۸، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۱۶۴

حق تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں مقام جلیل عطا فرمائے۔ آمین [1]

تعزیتی خطوط:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے سانحہ ارتحال پر جس طرح مختلف اخبارات میں مولانا کے انتقال کی خبریں شائع ہوئیں اور مولانا کی خدمات کا اعتراف کیا گیا، اسی طرح مولانا سے تعلق رکھنے والے ہندو پاک کے بے شمار افراد نے مولانا کے صاحبزادگان کے پاس تعزیتی خطوط لکھے، اپنے دکھ کا اظہار کیا، ساتھ ساتھ صبر کی تلقین بھی کی۔

تعزیتی خطوط کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے اندر ذاتی محاسن بے شمار تھے، حلقۂ احباب وسیع تھا، حکومت ہند کے نزدیک قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، عام لوگوں کے ساتھ ساتھ مولانا کا اثر سیاست دانوں اور ہندو پاک کے علماء کرام پر بھی تھا۔ ہر شخص نے مولانا کی رحلت کو ملک وملت کا عظیم سانحہ قرار دے کر اپنا ذاتی نقصان ہونا تحریر کیا ہے۔

یوں تو مولانا کی وفات پر سینکڑوں خطوط آئے، لیکن یہاں چند اہم خطوط کے تراشے نقل کیے جاتے ہیں، جس سے مولانا کی اہمیت پر مزید روشنی پڑتی ہے:

(۱) حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری ۴؍ستمبر ۱۹۵۶ء

برخوردار۔ حضرت مولانا مرحوم کے انتقال پر ملال سے تمہاری ہی کیا کمر ٹوٹ گئی۔ آپ لوگوں کے ساتھ اور بھی اس میں شریک ہیں۔ مولانا تو بہت لوگوں کے سہارا تھے۔ ہم لوگ بھی ان کا انتظار ہی کرتے رہتے تھے کہ کب تشریف لاویں۔ اب سوائے دعاء کے کیا کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو بڑے درجے عطا فرماویں۔

(۲) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ صدر جمہوریہ ہند۔ ۳؍ستمبر ۱۹۵۶ء

ایک مدت سے میں انہیں جانتا تھا۔ اس دوران میں میں نے یہ محسوس کیا کہ انہوں نے بے غرضی اور خلوص کے ساتھ قومی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ ان کی جدائی سے جو صدمہ آپ کو ہوا ہے، اس میں میں پوری طرح شریک ہوں اور امید کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اس صدمے کو برداشت کرنے کی توفیق دے گا۔

خیر اندیش راجندر پرشاد۔

---

[1] ماہنامہ برہان نئی دہلی۔ شمارہ ۳، ج ۳۷، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص: ۲

(۳) امرت کور، وزیر صحت حکومت ہند، دہلی

مرحوم نے اس ملک کی جنگ آزادی میں جو نمایاں حصہ لیا، ہندوستان کی تاریخ حریت میں ہمیشہ یادرہے گا۔ میں آپ کے دکھ میں پوری طرح شریک ہوں اور خدا سے دعاء کرتی ہوں کہ مولانا مرحوم کو جنت نصیب ہو اور لواحقین کو اس صدمہ عظیم کے برداشت کرنے کی ہمت ملے۔

آپ کی امرت کور

(۴) مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء

.....حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مغفرت فرما کر اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ سب دوستوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ یہ وقت ہر شخص کو پیش آنا ہے اور آ کر رہے گا۔ پس ماندگان کا جانے والے کے ساتھ جو بہترین سلوک ہوسکتا ہے، وہ اس کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب ہیں۔ امید ہے کہ اس میں آپ سب حضرات زیادہ سے زیادہ سعی فرمائیں گے اور اپنے احباب سے بھی اس کے لیے اصرار فرمائیں گے کہ مولانا مرحوم کے لیے اب اگر کوئی چیز ہے تو یہی ہے۔ انشاء اللہ ایک آدھ روز میں قرآن پاک پورا ہو جائے گا۔ فقط محمد زکریا

(۵) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۳ر ستمبر ۱۹۵۶

.....کیا خبر تھی آج سے دو ہفتہ پہلے جو ملاقات ہوئی تھی وہ آخری ملاقات ہوگی غفر اللہ لہٗ واکرم شواہ ۔ آپ سب بھائیوں کے ساتھ دیرینہ تعلقات کی بنا پر اور مرحوم کی بزرگانہ شفقت کی بنا پر شریک ہوں اور مغفرت ورضا کے لیے دعاء گو ہوں..... خاکسار ابوالحسن علی

سطور بالا میں صرف پانچ خطوط کے کچھ حصّے دیے گئے ہیں۔ مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی نے اپنی کتاب ''رئیس الاحرار در حدیث دیگراں'' میں ۱۶۶ر خطوط نقل کیے ہیں جن میں ہندو پاک سے آئے ہوئے خطوط شامل ہیں۔ تفصیل کے لیے مذکورہ کتاب صفحہ نمبر ۴۷۵ر تا ۵۷۴ر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

باب دوم

دینی، اصلاحی اور ملّی خدمات

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی دینی، اصلاحی اور ملی خدمات، ہندوستان کی علمی و سیاسی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ آپ نے ہندوستان کی اہم دینی اور علمی شخصیات سے استفادہ کیا تھا جن میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا معین الدین اجمیریؒ وغیرہ قابل قدر حضرات تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن ایک ممتاز عالم دین، نہایت متقی، پرہیزگار اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف آپ اپنے عہد کے جید اور ممتاز علماء کے علوم وفنون کے خوشہ چیں تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے قرآن وسنت اور دینی اقدار کی تبلیغ وترویج کے لیے اپنی زندگی وقف کردی، جس کا اندازہ ان کے ان خطبات اور تقریروں سے ہوتا ہے، جنہوں نے علمی شعور اور جذبہ حریت ہندوستان کے عوام میں پیدا کیا۔ دوسری طرف مولانا ایک غیرت مند اور حریت پسند شخصیت کے مالک تھے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال سے خاص طور پر فرزندان اسلام کو جن مصائب اور مظالم کو جھیلنا پڑا، مولانا کے ذہن اور دماغ پر اس کا گہرا اثر تھا، اس لیے انہوں نے ملک کی آزادی، ظالم انگریز کو ہندوستان سے نکالنے اور مسلمانوں کے اندر جذبۂ آزادی وخودداری بیدار کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگادی۔ اسلام کے خلاف جو سازشیں ہوئیں، ان کا بڑی سختی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آپ کے زمانے کا سب سے اہم مسئلہ قادیانت کا فتنہ تھا، جس کے ذریعہ انگریز اور دوسرے مخالفین اسلام، اسلام کے مستحکم نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے فتنۂ قادیانیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور قادیانیوں کی سازش سے عوام کو آگاہ کرایا۔

ہندوستان کی آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جانی اور مالی نقصان کے علاوہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں بھی غیر مسلموں کے قبضہ میں آگئیں۔

ایسے نازک حالات میں مولانا نے دینی حمیت کے پیش نظر قوم کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ دہلی اور پنجاب میں اپنے اثرات کا ستعمال کرتے ہوئے مختلف مسجدیں واگذار کرائیں، مسلمانوں کی مختلف جائیدادیں جو دوسروں کے قبضے میں چلی گئی تھیں، مسلمانوں کو واپس کرائیں۔ غرض کہ مسلمانوں میں وہ لوگ جو مختلف مسائل میں گھرے ہوئے تھے، مثلاً کوئی مقروض ہے، کسی کو حکومت ہند کے پاس سفارش کی ضرورت ہے، کسی ایڈیٹر کو اپنے پرچے کے لیے اشتہار کی ضرورت ہے، کسی کو علاج کے لیے پیسے نہیں اور کسی کو رہنے کے لیے مکان نہیں۔ مولانا ان تمام لوگوں کی پریشانیاں سنتے اور حتی المقدور ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔

مولانا کی خدمات بے شمار ہیں جن کا تفصیلی ذکر طوالت سے خالی نہ ہوگا، تاہم ذیل میں مولانا کی خدمات کا مختصراً جائزہ لیا جاتا ہے:

خطابت:

خطابت انسانی تاریخ میں ایک اہم اور اعلیٰ قدیم فن ہے۔ اس کا آغاز انسان کے وجود کے ساتھ ہوا، یہ دنیا کا سب سے قدیم ذریعۂ ابلاغ بھی ہے۔ آج جدید دنیا میں خطابت، ملکوں، قوموں اور قومی اداروں اور نسلوں کے لیے بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ آج کوئی حکمراں، لیڈر، قائد، مصلح، وکیل، مصنف اور فن کار خطابت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہے۔

اس میں کوئی حیرت وتعجب کی بات نہیں ہے کہ خطابت، سیادت وقیادت کا ذریعہ اور زعماء وقائدین کی زبان تھی۔ ہر دعوت و پیغام کا ترجمان اور ان کی دھڑکن تھی، ہر بغاوت وانقلاب کا خشک ایندھن اور شعلہ جوالہ تھی، ہر تحریک کی مدافعت کرنے والی روح اور اسے جاری رکھنے والی محرک تھی، حکومتوں کے قیام کا دارومدار اس پر تھا، حکمرانوں کی تائید اور ظلم واستبداد کو دفع کرنے کا یہی ذریعہ تھا۔

خطابت اجتماعی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ انسان کی معاشرتی زندگی کے آغاز سے آج تک مختلف حالات ومعاملات میں فکر وعقیدہ کی دعوت کا ذریعہ بنی ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر موڑ پر

جب بھی کوئی تحریک ابھری، خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، اس کی دعوت دینے والے تقریر کے ماہر اور یکتائے روزگار خطیب رہے ہیں۔ دنیا کی تمام اقوام میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے بنونوع انسان کی ہدایت کے لیے تقریر و بیان کو بھی اپنایا اور اس کے ذریعہ عوام الناس کی وقتاً فوقتاً اصلاح کرتے رہے۔

جس طرح بعض ملکوں اور علاقوں کی خصوصیات وہاں کے باشندوں سے اس طرح مربوط ہو کر رہ گئیں کہ ان روایات سے منفک کر کے وہاں کے باشندوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح بعض خاندانوں، اداروں اور علمی درس گاہوں کا حال ہے کہ ان کے زیر دامن تربیت پانے والے بعض اپنی انفرادی خصوصیات رکھتے ہیں، جماعتی زندگی میں بھی اس کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ احرار پارٹی جس کا طلوع پنجاب میں ہوا، اس جماعت کے اراکین وعمائدین میدان خطابت کے شہسوار تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر آفریں خطابت، مظہر علی اظہر کی اثر آفریں وکالت، صاحب زادہ سید فیض الحسن، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور چھوٹے بڑے تقریباً تمام ہی احراری اپنی خطابت کے جادو سے مسحور اور دلوں میں حرارت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ایک جانب اپنے اجداد سے فن خطابت ورثہ میں ملا تھا دوسری طرف دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم درس گاہ میں تعلیم وتربیت نے اس کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ اور ان کی خطابت علم کی قوت ایمان کا عزم ویقین اور جذبہ آزادی کی حرارت کی آئینہ دار تھی۔ اور پھر اس کو جلا بخشنے میں سرزمین پنجاب کی شعلہ نوائی کو بھی خاص دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا کی تقریر اور خطابت میں ایک امتیازی وصف لیے ہوئے ہوتی تھی۔ اسی لیے اپنی پرتاثیر تقریروں کی بناء پر ایک اعلیٰ درجہ کے خطیب کی حیثیت سے آپ پورے برصغیر میں مشہور ہو گئے۔

چنانچہ مولانا بغیر کسی خوف کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے، انہیں نہ قید و بند کی فکر اور نہ پھانسی کی کوٹھری کی پرواہ، جو بولنا ہوتا بے دھڑک بولتے، چاہے وہ حکومت انگریز کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اپنی اس جوشیلی تقریروں کی وجہ سے قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں اور جب عدالت میں بیان دینے کا وقت آیا تو وہاں بھی بے باکانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

مولانا کو جب اپریل ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ کے معاملے میں گرفتار کیا گیا تو آپ نے ۲۷ رمئی

۱۹۳۰ء کو عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے جس طرح سے خطاب کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا، یقیناً یہ آپ کی بے باکی کا بیّن ثبوت ہے۔ مولانا نے عدالت میں مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں حکومت انگریز کو ایک ایسی غیر ملکی حکومت سمجھتا ہوں جس نے اپنی چال بازیوں اور اپنی طاقت کے بل پر ہندوستان کو غلام بنا رکھا ہے، میں اپنے لیے اور ہندوستانیوں کے لیے یہ فرض سمجھتا ہوں کہ انگریز گورنمنٹ کو جس ممکن طریقہ سے بھی ہم نکال کر ہندوستان کو آزاد کرا سکیں کرائیں، اس بارے میں جو سزا بھی ہم کو ملے، ہم اسے بخوشی قبول کر لیں۔ انگریز حکومت نہ صرف غیر ملکی حکومت ہے، بلکہ ظالم اور ہندوستانیوں کی خون چوسنے والی حکومت ہے، اس لیے حکومت کی مشینری کو ناکام بنانا اور انگریزی مال کا بائیکاٹ کرنا ہر ہندوستانی کا اوّلین فرض ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ سچائی کے اجلے دامن پر برطانوی حاکمیت و طاقت ایک سیاہ داغ ہے اور اس داغ کو دھونا اگر جرم ہے تو میں اقرار جرم کرتا ہوں اور قانون عدالت کو اپنی منشا کے پورے کرنے کی اجازت دیتا ہوں'' [۱]

رئیس الاحرار اپنی تقریر کے دوران کبھی اپنی قوم کی بے بسی کا رونا نہیں روتے تھے بلکہ ہمیشہ قوم کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے اندر جذبہ آزادی اور جوش وولولہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے، ان کے سامنے ہمیشہ یہ جذبہ رہتا تھا کہ کس طرح اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک کیا جائے، چنانچہ ۱۹۳۱ء میں لاہور میں مجلس احرار اسلام ہند کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ صدارت میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی قوم اقلیت و اکثریت کی وجہ سے نہ زندہ رہتی ہے اور نہ مرتی ہے، دنیا میں صرف وہی قوم زندہ رہتی ہے جس کے افراد نیک نیت، بہادر، صاحب عقل اور صاحب ایثار ہوں، مجھے یہ سن کر بے حد تکلیف ہوتی ہے جب کوئی مسلمان کہتا ہے کہ ہم اس لیے کمزور ہیں کہ ہم ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔ اٹھو! اپنے اندر زندگی پیدا کرو اور ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دو۔ جس قوم کے ہاتھ سے ہندوستان کو آزادی نصیب

---

[۱] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۳۵

ہوگی، وہی سربلند رہے گی'' [1]

مولانا محترم لمبی تقریر کرنے کے عادی نہیں تھے، البتہ مختصر اور وقیع انداز میں مولانا کی تقریر ہوا کرتی تھی۔ جن لوگوں نے مولانا کی تقریریں سنی ہیں ان میں دارالعلوم وقف دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا انظر شاہ کشمیری بھی ہیں جنہیں مولانا کا قرب بھی حاصل رہا ہے۔ مولانا کی خطابت سے متعلق رقم طراز ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی تقریر اور خطابت بھی ایک امتیازی وصف لیے ہوئے تھی، وہ بالعموم کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے اور ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ لیتے اور ان کی خطابت کی غزل شروع ہوتی، غزل کی طرح ہر مصرعہ جدا ہوتا لب ولہجہ کی شوکت، بھاری بھرکم انداز، جس بات کو کہتے وقیع انداز میں، جس مصرعہ کو اٹھاتے قیامت بنا دیتے، ایک مصرعہ سنانے کے بعد اپنے داہنے ہاتھ سے ڈاڑھی کو موڑتے اور ہونٹوں میں دبا لیتے، وہ دوران خطابت اس کا بھی اندازہ لگا لیتے کہ مجمع ان کی منثور غزل سے کس حد تک متاثر ہو رہا ہے۔ ٹھیک ان اوقات میں چشمہ کے نیلگوں گلاس کے عقب سے وہ اپنی عقابی نظروں کو اذہان کے تجسس میں روانہ کرتے اور احتساب کے بعد مصرعہ ثانی اٹھاتے، تقریر پنجابی آمیز اردو میں ہوتی، وہ بین الاقوامی سیاست پر تبصرہ کرنے کے بعد اچانک مجمع سے کہتے ''میں دریافت کرنا چاہتا ہوں'' کبھی کبھی اپنی پارٹی کی عظیم اکثریت کا بیان کرتے تو لہجہ کی پوری قوت و استحکام کے ساتھ فرماتے ''میرے پاس نصف لاکھ تعداد میں رضا کار ہیں یہ ہندوستان کی تمام قوم پرور پارٹیوں میں ایک منفرد خصوصیت ہے'' فرنگی سیاست کے تار و پود کو بکھیرتے، ملکی سیاست پر تبصرہ ہوتا، تقریر کا اختتام بھی بہت البیلا تھا وہ عام مقررین کی طرح خاتمہ پر دھیرے دھیرے پہونچنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اچانک کسی جملہ کو پہلے سے زیادہ پرشکوہ انداز میں کہتے اور دفعتاً کرسی سے اٹھ جاتے'' [2]

مولانا چوں کہ سراپا اخلاص تھے، جو کہتے دل کی گہرائی سے کہتے اور دلی خواہش ہوتی کہ سامعین

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن، ص: ۱۳۵

[2] لالۂ وگل، مولانا انظر شاہ، ص: ۱۸۵

کے دلوں میں اتر جائے، اس لیے جو سنتا سر دھنتا، ہزاروں ہزار کا مجمع آپ کی تقریر میں ہوتا تھا اور بصد ذوق و شوق بیٹھا سنتا رہتا تھا۔

جب کبھی اسلامی غیرت وحمیت کو جگانا چاہتے تو انداز بیان اور زیادہ مؤثر اور خطیبانہ ہو جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ حالات کا نقشہ سامنے کھینچ کر لوگوں کو مشاہدہ کرا رہے ہیں اور مجمع اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، یہی وجہ تھی کہ آپ کے وعظ وتقریر سے عوام وخواص کے ایک بڑے طبقہ کو ایمان کی لذت ملی، عمل کا جذبہ پیدا ہوا اور دل و دماغ کی دنیا بدلی، مردوں نے بھی آپ کی تقریروں سے اپنا مستقبل سنوارا اور عورتوں نے بھی، بوڑھوں نے بھی اور جوانوں نے بھی، تاجروں میں بھی خدا کا خوف پیدا ہوا اور مزدوروں میں بھی۔

تحریک کشمیر:

تحریک کشمیر پر تفصیلی تذکرہ بعنوان ''مجلس احرار اسلام ہند، مقاصد اور خدمات'' کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف مولانا لدھیانوی کی اس ضمن میں جو خدمات ہیں اسے تحریر کیا جاتا ہے۔

مجلس احرار کی تحریک کشمیر کی ابتدا سے قبل کشمیری مسلمانوں کے جو حالات ہوئے اور مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے جس طرح کشمیر کمیٹی کے ذریعہ ہندوستان کے بااثر حضرات کو اپنی کمیٹی کا ممبر نامزد کیا، اس سے مولانا لدھیانوی نے محسوس کیا کہ اس طرح کشمیری مسلمانوں کے ایمان ضائع ہونے کا خطرہ ہے، چنانچہ آپ نے بمبئی جا کر مولانا ابوالکلام آزاد سے کشمیری مسلمانوں کے مسئلے اور کشمیر کمیٹی کے فکر وعمل کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ اس گفتگو کا ہی نتیجہ تھا کہ مولانا مولانا حبیب الرحمٰن نے کشمیر مسلمان کے ایمان کو بچانے اور انہیں ان کے حقوق دلوانے کے لیے بمبئی سے واپسی پر مجلس احرار کے کارکن سے آپسی صلاح و مشورہ کرتے ہوئے، مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے تحریک کشمیر کا آغاز کر دیا۔ مولانا کی بروقت کوشش ہی کا نتیجہ تھا کہ کشمیر کے لاکھوں مسلمان قادیانی ہونے سے بچ گئے۔ حالاں کے اس تحریک کی وجہ سے مولانا کو قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔

قادیانیت کے خلاف سرگرمی:

مرزا بشیر الدین محمود کے دور میں جب بھی کوئی شخص قادیانیت سے تائب ہوکر مسلمان ہوتا تھا۔تو قادیانی ان مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ کردیا کرتے تھے اور ان مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا تھا۔ قادیان سے باہر کا کوئی مسلمان قادیان جانا اپنے لیے خطرہ تصور کرتا تھا۔ ایسے حالات میں وہاں کے مسلمان بہت پریشان تھے اور یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص آئے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے۔ چنانچہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کو چنا۔ وہ قادیان جہاں مسلمانوں کے ایمان سلامت نہ تھے، عزت وآبرو کو خطرہ لاحق تھا اور مسلمانوں کو سانس لینا تک دشوار ہورہا تھا۔ وہاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مردانہ وار داخل ہوئے اور قادیانیت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ ہی کے دادا محترم مولانا محمد لدھیانوی نے سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا، اس کے بعد ہی ملک و بیرون ملک سے قادیانیوں پر کفر کے فتوے جاری ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے علماء لدھیانہ سے نہ صرف مرزا قادیانی پر کفر کا فتویٰ جاری کرایا بلکہ اس خاندان کے خون میں وہ جوش وجذبہ بھی پیدا کردیا تھا، جس کی وجہ سے مرزائیوں سے ٹکرانے کے لیے کسی بھی مقام پر پہونچ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے قادیان میں داخل ہونے کی جرأت بھی اسی خاندان کے فرزند جلیل مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کی۔

مولانا اپنی پوری زندگی قادیانیت کے خلاف جدو جہد میں لگے رہے، جب بھی ضرورت ہوئی قادیانی سازش کو عوام کے سامنے بے نقاب کرتے رہے۔ مولانا نے ذاتی طور پر بھی قادیانی پروپیگنڈہ سے لوگوں کو دور رکھنے کی کوشش کی اور مجلس احرار کے اہم ارکان کو بھی اس کام پر مامور کیا کہ قادیان جاکر وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کی جائے اور ان کے مذہب کی حفاظت کی جائے۔

مولانا محترم کی جرأت و بے باکی کا اندازہ مولانا کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے۔ جب مولانا احرار تبلیغ کانفرنس ۲۳/ مارچ ۱۹۳۴ء میں شمولیت کے لیے قادیان پہونچے اور لاکھوں کے مجمع میں جوشیلی تقریر کی، اپنا اور اپنی جماعت ''مجلس احرار'' کے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''خدا کی قسم میں اس بات کا منتظر ہوں کہ قادیان کی گلیوں میں احرار رضا کاروں کے خون کی نہریں بہتی ہوں اور میں سمجھ لوں کہ آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر میں اپنے مشن کو پورا کرتے ہوئے محمود کے حواریوں کے ہاتھوں خاص قادیان میں قتل کیا جاؤں تو میں اس کو شہادت کبریٰ تصور کروں گا'' [1]

حضور پاک ﷺ کے نبی ہونے کی حقیقت اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کے متعلق اپنے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

''نبوت کی بحث کس سے کرتے ہو۔ جو سرے سے مرزا (غلام احمد قادیانی) کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے ۔ آؤ تم کو یثربی نبوت کا حال سناؤں کہ ریگستانِ عرب کے لق و دق میں انتہا درجہ کی بے چارگی کے عالم میں علم توحید بلند کرتا ہے ۔ اپنے ، بیگانے دشمن ہوگئے ، قتل کے منصوبے کیے گئے اور وطن سے نکلنا پڑا ۔ بتلاؤ کسی حکومت سے امداد کی درخواست کی کہ مجھے کفار مکہ سے بچاؤ۔ کفار مکہ آئے اور انہوں نے کہا جس چیز کی ضرورت ہے لے لو، مگر ہمارے بتوں کو برا نہ ہو۔ ہم تمہارے خدا کو برا نہ کہیں گے ۔ اگر کوئی ماڈریٹ ہوتا تو کہتا صورت بہت اچھی ہے چلو مان جاؤ۔ مگر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ: ''اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دو، پھر بھی اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں آؤں گا''۔ یہ ہے شان نبوت، تم ہی بتلاؤ کہ قادیان کی نوزائیدہ نبوت پولیس کے بغیر کبھی دو قدم بھی باہر چلی ہے ۔ ساری عمر کی قید نہیں ، ایک دن بتلا دو کہ فلاں دن قادیان کی نبوت پولیس سے بے نیاز تھی ۔ پس یہ نبوت تو پولیس کے ہاتھ میں ہے ، جس کو چاہے نبی بنا دے ، پس جس شخص کا کسی پولیس افسر سے دوستانہ ہو نبوت کا دعویٰ کر دیا کرے ۔

یاد رکھو کہ نبی جب کمزور ہوتا ہے تو وہ اپنی بہادری اور شجاعت کا عظیم الشان مظاہرہ دنیا کے سامنے کرتا ہے اور دنیا کی تمام طاغوتی اور مادی قومیں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور جب وہ طاقت ور ہو جاتا ہے تو دشمنوں تک کی لیے رحیم ہو جاتا ہے'' [2]

---

[1] فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص: ۳۳۵

[2] ایضاً، ص: ۳۳۶

مولانا موصوف کے اندر قادیانیوں کے خلاف عملی جدوجہد کا ایک اہم جذبہ تھا اور اسی جذبہ کے تحت مولانا نے اپنی تقاریر میں احرار رضا کاروں کو دشمنان احرار سے بے خوف ہو کر عملی جدوجہد کرنے کی تلقین کرتے رہے اور خود بھی تا زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔

تحریک شاتم رسولؐ:

۱۹۲۷ء کے وسط میں لاہور کے ایک ہندو ناشر ''راج پال'' نے ایک کتاب ''رنگیلا رسول'' نام سے شایع کی، جس میں حضورؐ کے دامن اطہر پر ایسے گندے چھینٹے ڈالے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کا دل بے قرار ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے پنجاب میں اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور سخت تقریریں کیں۔ مولانا نے اپنی تقریر میں خاص طور پر مسلمانوں سے کہا کہ:

''یا تو رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنے والے کی زبان نہ رہے یا سننے والے کے کان نہ رہیں''۔[1]

چنانچہ اپنی مذکورہ بالا تقریر کی بنا پر حکومت انگریز نے آپ کو مجرم ٹھہرایا اور ۱۰ر جولائی کو زیر دفعہ ۱۰۷ کے تحت لدھیانہ سے گرفتار کیے گئے[1]۔ حکومت نے عدالت میں مقدمہ چلایا اور ضمانت طلب کی کہ آئندہ آپ اس طرح کی بات نہیں کہیں گے۔ لیکن مولانا نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا، جس کی وجہ سے آپ کو ایک سال قید کی سزا دی گئی، جسے آپ نے بخوشی قبول کر لیا اور قرآن پاک کی اس آیت کے مصداق بنے ''رب السجن احب الیّ ممایدعوننی الیه'' [2]

ہر دور میں ایسے لوگ سامنے آتے رہے، جس نے حضور پاک ﷺ کے دامن اطہر کو داغ دار کرنے کی ناکام کوششیں کیں اور دین اسلام کو ایک نیا مذہب بتا کر اس پر طرح طرح کے الزامات تراشے گئے۔ چاہے وہ دین اسلام سے تعصب کی بنا پر ہو یا نام و نمود حاصل کرنے کے لیے۔

دورِ حاضر میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں مثلاً مردوں میں سلمان رشدی اور عورتوں میں تسلیمہ نسرین کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ۱۹۵۵ء کے اخیر میں پیش آیا، کہ کسی

---

[1] فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص: ۲۳۴

[2] حوالہ: کاروان احرار، جانباز مرزا، ص: ۱۳۱

Maulana Azad Library
T. 6236
Acc.

شخص نے حضورؐ کے اسم مبارک کو توہین آمیز طریقے سے استعمال کیا تھا۔ اخبارات کے ذریعہ یہ خبر پورے ہندوستان میں پھیلی اور جب مولانا حبیب الرحمٰن کی نظروں سے یہ خبر گذری تو مولانا سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے جن سے بانیان مذاہب کی توہین کی جاتی ہو تو اس سے ملک کا امن وسکون برباد ہوکر رہ جائے گا اور پوری دنیا میں ہندوستان کے رہنے والے ذلیل ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح کے حالات کیوں پیش آتے ہیں؟ کیا ہماری طرف سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہے؟ انہی حالات وواقعات سے متاثر ہوکر مولانا نے ایک مضمون قلمبند کیا، جو مختصراً اس طرح ہے:

> ''کیا ہماری بڑی کوتاہی اور جرم نہیں ہے کہ ہم نے اپنے ہمسایہ قوم کو ایک ہزار سال میں بھی حضورﷺ کی شخصیت سے متعارف نہیں کرایا۔ ہم ہر سال کروڑوں روپیہ مولود خوانی اور سیرت النبی کے جلسوں پر تو خرچ کرتے ہیں لیکن اپنے کروڑوں ہم وطنوں کو حضورﷺ کی سیرت وشخصیت کے تعارف سے محروم رکھتے ہیں۔ ہم سب کو خدا کے سامنے اپنی اس غفلت کا جواب دینا ہوگا، جو ہم نے ہم وطنوں سے برتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں جب کبھی متعصب سے متعصب غیر مسلم کو نبی کریمﷺ کی شخصیت اور سیرت کا تعارف کرایا، تو وہ رونے لگا اور ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ: کاش! حضورﷺ کی سیرت طیبہ اور آپ کی زندگی کے حالات تمام دنیا کو اس طرح بتائے جائیں، جس طرح کہ آپ نے ہم کو بتائے ہیں''[1]

علمی نشست:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے دور طالب علمی ہی سے سیاسی جھمیلوں میں الجھ کر رہ گئے تھے، یہاں تک کہ نوجوانی کے زمانہ میں بھی تفریحی مشاغل سے لاتعلق رہے اور پھر طالب علمی کی واقعی مراعات وہ قائم نہ رکھ سکے، مگر اس کے باوجود وہ فطری طور پر علمی ذوق کے آدمی تھے۔ ہندوستان کی آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا جب دہلی میں مقیم ہوگئے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی تو علمی ودینی مجالس کی طرف رغبت مزید بڑھ گئی۔ روزانہ صبح کو ان کے یہاں حضّار مجلس کے سامنے ایک علمی نشست ہوتی، جس میں قرآن مجید

---

[1] مضامین رئیس الاحرار، محمد احمد رحمانی، ص: ۱۰

کے متعدد تراجم پڑھے جاتے اور مولانا تفسیری نکات اہتمام سے بیان فرماتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ سے انہیں عشق تھا اور اس پاکیزہ والہامی ترجمہ کے مسلسل مطالعہ سے اس کی گہرائی و گیرائی پر مکمل واقفیت رکھتے، عام مجلسوں میں بھی آیات قرآنی اور حضرت شاہ صاحب کے افادات کو جاذب انداز میں پیش فرماتے، فہم قرآن میں علامہ شبیر احمد عثمانی کو بے مثل قرار دیتے تھے اور ان کے فوائد القرآن کا اکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ارشادات پر بھی عبور تھا اور جا بجا ان کا افادہ فرماتے، جس سے حاضرین کے علم میں مزید اضافہ ہوتا۔

غیر مسلم حلقوں میں تبلیغ:

سیاسی بکھیڑوں کے باوجود دعوتی رنگ بھی مولانا پر غالب تھا اور غیر مسلم حلقہ کو اسلام کی خوبی و زیبائی پر مطلع کرنے کی تڑپ سے خالی نہیں تھے۔ مولانا کے یہاں ہر قسم کے افراد کا اجتماع رہتا تھا۔ ایک جانب خالص مذہبی قسم کے لوگ بھی ان سے مانوس تھے اور دوسری طرف سیاسی سلسلوں سے ہندو، مسلم، سکھ سب کی ان کے پاس آمد و رفت تھی اور اس سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ یہ سیاسی لوگ سیاسی لائن سے ہی ان کے پاس آتے تھے، مگر ساتھ ہی ان کی مذہبیّت سے متاثر اور اسے ایک مذہبی مقتدا کی حیثیت سے بھی دیکھتے تھے۔ مولانا مرحوم ان اثرات کو دین کے حق میں استعمال فرماتے تھے اور تبلیغ حق کے فریضہ کو باحسن اسلوب ادا فرماتے رہتے تھے۔ جس طرح سے نفسیات کا ایک ماہر اپنے کام کو انجام دیتا ہے۔

آزاد ہندوستان میں جب فرقہ پرستی غیر مسلموں کے ذہنوں پر اثر انداز ہو رہی تھی اور مسجد کے بلند و بالا میناروں سے اذان کی آواز بھی فرقہ پرستوں کو ناگوار گذرتی تھی، تو مولانا نے ان ناگوار جذبات کو ایک عجیب انداز میں ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اذان کا ہندی ترجمہ اور اس کے ساتھ مختصر تشریح کرا کر شایع کیا۔ خاص اشاعت غیر مسلم حلقوں میں کی گئی۔ مولانا کی اس کوشش کے متعلق مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا نے ایک دفعہ ہندوؤں کے سامنے اذان کی حقیقت اس انداز سے بیان کی کہ بہت

سے ہندوؤں کی خواہش ہوئی کہ اذان کا ہندی میں ترجمہ چھپوادیا جائے۔ مولانا نے ہندی میں اس کا سلیس ترجمہ کرایا اور عربی اذان اور ہندی ترجمہ ایک خوبصورت پمفلٹ میں چھپوایا، جو ہزاروں کی تعداد میں شایع ہوا اور اس کے گاہک سب کے سب ہندو تھے، جنہوں نے بخوش دلی اسے لیا اور اپنے بچوں کو یاد کرایا اور سمجھایا۔ اسی طرح سے وہ اسلامی مسائل کو سیاسی رنگ سے پیش کر کے اسے منوا لیتے تھے"۔ [1]

جامع مسجد لدھیانہ کا سنگ بنیاد:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے کارناموں میں ایک اہم کارنامہ لدھیانہ کی حالیہ جامع مسجد کا سنگ بنیاد ہے جو آپ نے ۱۹۲۳ء میں رکھا تھا۔ جسے آج تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

شہر لدھیانہ کے علاقہ فیلڈ گنج چوک میں، رقبہ اور خوبصورتی کے لحاظ سے پرکشش نہ نظر آنے والی صاف ستھری سادہ سی یہ مسجد آج بھی لاکھوں عوام، سیاسی اور غیر سیاسی لوگوں کا مرکز توجہ ہے۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ بھی ہے جسے مولانا نور محمدؒ (مؤلف نورانی قاعدہ) نے ۱۹۲۰ء میں قائم کیا تھا۔ اس مدرسہ کا ابتدائی نام ام المدارس تھا، آزادی کے بعد یہ مسجد سکھوں کے قبضہ میں چلی گئی تھی، جسے گردوارہ بنادیا گیا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی کوششوں سے آپ کے صاحبزادے مولانا محمد احمد رحمانی نے اسے دوبارہ حاصل کیا اور مدرسہ کی تعلیم بھی شروع کی اب اس کا نام جامعہ حبیبیہ تجویز ہوا۔ لیکن ایک بار پھر اس مدرسہ کے نام میں تبدیلی آئی اور کچھ دنوں قبل اس کا نام دارالعلوم لدھیانہ رکھا گیا ہے۔ مدرسہ کے سرپرست مولانا حبیب الرحمٰن کے پوتے مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانوی ہیں۔

مسجد سے گردوارہ، گردوارہ سے مسجد بننے اور سخت آزمائش سے گذرنے والی اس عظیم مسجد کا احترام آج لاکھوں دلوں میں موجزن ہے۔ حالیہ مجلس احرار ہند کا صدر دفتر بھی اسی مسجد میں ہے اور آج اس مسجد کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی مرکز سے پنجاب بھر میں مساجد آباد کرائی جاتی رہی ہیں۔ قادیانیت کے خلاف اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔ پنجاب کی سیاسی جماعتیں اور حکمراں وقتاً فوقتاً اس مسجد کا رخ

---

[1] درحدیث دیگران، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۲-۳۳

کرتے ہیں۔ حالیہ مجلس احرار نے جب ایک بار پھر ملک گیر سطح پر قادیانیت کا تعاقب شروع کیا ہے تو اس کا مرکز بھی یہی مسجد بنی ہوئی ہے۔[1]

انجمن ''حمایت اسلام'' کا قیام:

۱۹۴۷ء کے بعد ایک بڑا مسئلہ جو تقسیم ہند نے کھڑا کر دیا تھا، یہ تھا کہ پاکستان بن جانے اور ہندوستان کے حالات کے غیر یقینی ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں ڈگمگا گئے اور بڑے بڑے پہاڑ تزلزل میں آ گئے۔ پاکستان ہجرت کر جانے کا ایک ایسا وسیع اور طاقت ور رجحان بلکہ نشہ سب پر چھا گیا جس کو تھامنا اور مسلمانوں کو اس ملک میں مقیم رہنے پر آمادہ کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسے حالات میں جہاں ہندوستان کا دوسرا علاقہ متاثر ہوا، وہیں مشرقی پنجاب خصوصاً لدھیانہ بھی اس کی زد میں آ گیا۔

لدھیانہ کے متعلق عطاء الرحمٰن قاسمی اس وقت کے حالات کا تذکرہ اپنے الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''لدھیانہ میں ۱۹۴۷ء سے قبل ۸۵ر فیصد مسلمان تھے اور بڑے اثر ورسوخ والے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد انتقال آبادی کی وجہ سے یہاں سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ گیا..... یہاں کے قدیم باشندوں میں صرف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے خاندان کے کچھ افراد رہ گئے ہیں''[2]

تقریباً یہی حالات پورے مشرقی پنجاب کے تھے، ۱۹۴۷ء سے قبل جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اب یا تو پاکستان چلے گئے یا پھر جو رہ گئے وہ مرتد ہو گئے، مسجدیں سکھوں اور ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئیں اور وقف کی جائدادوں پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔ ایسے حالات میں اگر پنجاب کے مسلمانوں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی تو یقیناً پورا مشرقی پنجاب کافر و مرتد ہو کر رہ جاتا اور پنجاب سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جاتا۔

چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے دہلی میں رہتے ہوئے اس کی طرف توجہ فرمائی اور اس

---

[1] پندرہ روزہ الاحرار، ۱۵ر اپریل ۲۰۰۴، ص: ۳

[2] پنجاب وہریانہ کی تاریخی مساجد، عطاء الرحمٰن قاسمی، ص: ۱۰۵

کے لیے باقاعدہ طور پر ''انجمن حمایت اسلام'' کے نام سے ایک کمیٹی بنائی، جس کے تحت خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت، مساجد کو واگذار کرانا، مسلمانوں کو دوبارہ پنجاب میں اس کی حیثیت دلوانا اور آراضئ وقف کو غیر مسلموں کے قبضے سے لینا اہم مقصد بتایا گیا۔

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

''مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے انخلاء کا حضرت مولانا کو بڑا غم تھا۔ یہ ایک طرف مولانا کے سینے کا زخم تھا جو برابر رستا رہتا تھا، تو دوسری طرف وہ اسے ہندوستان کی سیکولر حکومت کی روشن پیشانی کا داغ بھی سمجھتے تھے۔ آخر کار حضرت رائے پوری مدظلہ العالی (مولانا عبدالقادر رائے پوری) کی سرپرستی میں مولانا مرحوم نے ۱۹۵۶ء کے وسط میں ''انجمن حمایت اسلام'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور منظم طریقے پر مشرقی پنجاب میں مساجد و مقابر کے انخلاء اور وطن میں رہتے ہوئے بے وطن مسلمانوں کی آبادکاری کا کام شروع کر دیا۔

اس انجمن کا پہلا باضابطہ جلسہ مولانا نے یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کو اپنے دولت کدہ پر بلایا۔ مشرقی پنجاب دہلی اور یوپی سے مولانا کے وہ احباب جو اس کام میں دل چسپی رکھتے تھے جمع ہوئے۔ جلسہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں صبح سے شام تک جاری رہا اور اس میں کام کا ایک واضح نقشہ بنالیا گیا۔ جلسہ ختم ہوجانے کے بعد مولانا نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا کہ آج میرے سینے کا بوجھ ہلکا ہوگیا''[1]

مولانا نے انجمن حمایت اسلام کے قیام سے قبل ہی اپنے صاحبزادگان مولانا خلیل الرحمٰن، مولانا سعید الرحمٰن اور مولانا محمد احمد رحمانی کو اس کام کے لیے پنجاب روانہ کر دیا تھا۔ ان حضرات نے لدھیانہ جا کر اپنے پرانے گھر کو آباد کیا اور وہیں مکمل سکونت اختیار کر لی اور تازندگی مسلمانان پنجاب کی فلاح و بہبود، مساجد کی واگذاری اور اوقاف کی جائیدادوں کو غیر مسلموں کے قبضے سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مولانا عمید الزماں کیرانوی اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''زندگی کے آخری دس سال انہوں نے (مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی) فرقہ وارانہ اتحاد

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۸۵

کے لیے جدوجہد میں گذار دیے۔ مشرقی پنجاب میں مساجد اور اسلامی اوقاف کی مقبوضہ جائدادوں کی واگذاری میں مصروف رہے۔ مظلوم اور پریشان حال لوگوں کی خدمت ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اس سلسلہ میں ان کے دو صاحبزادے مولانا سعید الرحمٰن لدھیانوی، مولانا محمد احمد لدھیانوی اور برادر محترم مولانا وحید الزماں کیرانوی نے بھی پنجاب کے دورے کیے"۔[1]

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے اس اقدام نے پنجاب کے مسلمانوں کو خاصا فائدہ پہنچایا، لدھیانہ اور اس کے گردونواح کے مسلمان جو ۱۹۴۷ء کے بعد مرتد ہوگئے تھے، پھر سے مسلمان ہوئے۔ ۱۹۸۱ء کے سروے کے مطابق لدھیانہ اور گردونواح میں تقریباً ۲۰ر ہزار مسلمان تھے اور اب یہ تعداد دو لاکھ کے قریب پہونچ چکی ہے۔ اس میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جو دوسرے صوبوں سے آکر محنت ومزدوری کرتے ہیں اور وہ حضرات بھی ہیں جو پہلے مرتد ہوگئے تھے اب تائب ہوکر مشرف باسلام ہوچکے ہیں۔

سفر حج اور عربوں کو اصلاحی مشورے:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ۱۹۵۵ء میں سفر حج کیا، آپ کے ساتھ اس سفر میں مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ، مولانا وحید الزماں کیرانویؒ اور ان کے علاوہ بھی کچھ افراد تھے۔ چوں کہ آپ ہندوستان میں ہمیشہ امت مسلمہ کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے اور یہ آپ کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا تھا، اس لیے آپ نے سفر حج کے دوران وہاں کے حالات کا بھی جائزہ لیا۔ مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ اور جدہ کے قیام کے دوران بلاد عربیہ کے بہت سے سیاست داں، اخبار نویس اور علماء آپ سے ملنے تشریف لائے، آپ بھی وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے، ان حضرات سے عرب کے حالات اور وہاں کے مسائل پر مولانا کی گفتگو ہوئی اور بڑی دردمندی اور بے قراری کے ساتھ عرب ملکوں کے حالات کے خطرناک نتائج سے ان کو آگاہ کیا۔ مغربی ملکوں کی استعماری داؤ پیچ کو اپنے تجربہ کی روشنی میں بے نقاب کرتے رہے۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ سفر حج میں مولانا کے ساتھ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

---

[1] ماہنامہ ترجمان دارالعلوم، شمارہ ۸، جلد ۸، جنوری ۲۰۰۱ء، ص: ۴۳

تھے۔قاضی صاحب مولانا کے اس سفر کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جولوگ مولانا سے ملاقات کے لیے آتے تھے، مولانا تین امور کی طرف ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ منعطف کراتے تھے۔(۱) اتحاد ممالک عربیہ (۲) ملک میں صنعتی اداروں کا قیام اور مغربی مصنوعات سے احتراز (۳) جدید وقدیم علوم کے تعلیمی اداروں کا اجراء۔جن کی تفصیل اس طرح ہے''

ا۔اتحاد ممالک عربیہ:

ایک روز دمشق کے ممتاز عالم شیخ احمد کفتارہ نقشبندی ملاقات کے لیے تشریف لائے، گفتگو عرب ممالک کی سیاست پر ہونے لگی۔مولانا نے فرمایا: اگر آپ بلاد عربیہ کو مغربی استعمار کے جال کے پھندوں سے نجات دلاسکیں اور چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کا جنہیں برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے اپنی مصلحتوں سے تقسیم کررکھا ہے، ایک عرب فیڈریشن بناسکیں تو یہ اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ اسلام دنیا کے لیے آزادی کا پیغام لایا۔یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ وہ ملک جہاں سب سے پہلے اسلام کا نور پھیلا، برطانوی اور امریکی اقتدار کے سایہ میں ہے۔

شیخ نے بڑی توجہ سے مولانا کی باتوں کو سنا، پھر فرمانے لگے، ہونا تو یہی چاہیے جو آپ فرمارہے ہیں مگر عملاً اس میں بڑی مشکلات ہیں۔عرب ریاستوں میں اسلام پر وطنیت غالب ہوچکی ہے اور اس جذبے نے شامی، عراقی اور حجازی کو ایک دوسرے سے جدا کردیا ہے۔

۲۔صنعتی اداروں کا قیام:

مدینہ منورہ کے دوران قیام میں ایک روز وہاں کے مشہور اخبار ''المدینہ المنورہ'' کے مدیران محترم نے مولانا اور ان کے رفقاء کی دعوت کی، میز پر مشروب کی حیثیت سے وہی ''کوکا کولا'' رکھا گیا، جو حجاز کا مقبول عام اور دل پسند شربت ہے۔

مولانا نے فرمایا:

''افسوس آپ ہمیں شربت بھی مغربی ملکوں سے آیا ہوا پلا رہے ہیں۔اللہ تعالی نے آپ کو روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ کھجور جیسی لذیذ مادی نعمت سے نوازا ہے۔ہمارے ہاں ایسی پھلوں میں وہ شیرینی اور لطافت نہیں ہوتی جو مدینہ منورہ کی کھجوروں میں ہے۔کیا آپ کا خیال کبھی اس طرف منعطف نہیں ہوا کہ آپ کھجوروں کا شربت تیار کریں۔یہ آپ کے ملک کی ایک بہترین صنعت ہوسکتی ہے۔پھر مولانا نے فرمایا، آپ کے ملک میں آنے والے حاجی ہر سال لاکھوں رومال اور جانمازیں یہاں سے خرید کر لے جاتے ہیں، کیا سعودی حکومت یہاں جانمازوں اور رومالوں کے بنانے کے کارخانے نہیں کھول سکتی۔اگر ایسے کارخانے ملک میں کھل جائیں تو ایک طرف حاجیوں کو اصلی تبرک مل سکے اور دوسری طرف ان ہزاروں گداگروں کے لیے روزگار مہیا ہوسکے، جو خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے دروازوں پر پیر جمائے کھڑے رہتے ہیں''۔

مدیران محترم مولانا کی اس تقریر سے بے حد متاثر ہوئے اور اخبار کی اگلی اشاعت میں مولانا کی اس تجویز پر ایک پرزور اداریہ لکھا۔

۳۔جدید وقدیم علوم کے تعلیمی اداروں کا اجراء:

مکہ معظمہ میں مجلّہ ''الحج'' کے مدیر اعلیٰ شیخ محمد سعید العامودی جب ملاقات کے لیے تشریف لائے تو مولانا نے مفصل طور سے اس موضوع پر گفتگو کی اور ایک ایسی مرکزی دینی درس گاہ کے قیام پر زور دیا جہاں تمام بلاد اسلامیہ کے طلباء اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق علوم دینیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں۔مدیر موصوف نے مولانا سے فرمایا کہ وہ اپنی تجویز کو تحریری صورت میں حکومت کے سامنے پیش کریں۔مجھے یاد نہیں کہ مولانا نے حکومت سعودیہ کو اس سلسلہ میں مخاطب کیا یا نہیں۔[۱]

☆ ☆ ☆

درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۷۸۔۱۸۱

باب سوم

معاصر علماء و رفقاء

مولانا معاصر علماء اور سیاسی رہنماؤں کی نظر میں

کسی علمی اور سیاسی شخصیت کی تعمیر میں خانوادے کے ساتھ ساتھ احباب ،رفقاء درس،موافق اور مخالف معاصرین،مخلص معاونین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اِن ہی عناصر سے شخصیت کی عظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا لدھیانوی کا اپنے معاصرین میں جن لوگوں سے تعلق تھا،ان احباب ورفقاء میں اس عہد کی تمام اہم روحانی ،علمی، دینی ،ادبی ،سیاسی ،فکری شخصیات شامل ہیں ،جو مولانا کی عظیم شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

علماء اور مشائخ جن سے مولانا لدھیانوی کا خاص تعلق تھا،ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ،علامہ انور شاہ کشمیریؒ،مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ،مولانا اشرف علی تھانویؒ،مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ،مولانا شبیر احمد عثمانیؒ،مولانا حسین احمد مدنیؒ،مفتی کفایت اللہؒ،مولانا احمد سعید دہلویؒ،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ،مولانا معین الدین اجمیریؒ ، شیخ الحدیث مولانا زکریا سہارنپویؒ ،سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ، شیخ حسام الدینؒ ،مولانا احمد علی لاہوریؒ ،مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ ،حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ،مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا اخلاق حسین قاسمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا کی زندگی ہمہ جہت تھی ۔علمی ودینی کارناموں کے علاوہ سیاسی وملی میدانوں کے شہسوار بھی رہے ۔ ہندوستان کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے نقوش وتاثرات اور سیاسی رجحانات سے عالمی سیاست پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

ہم عصر سیاسی،ادبی شخصیات اور دانش وروں میں حسب ذیل حضرات مولانا سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، حکیم اجمل خانؒ، قائداعظم محمد علی جناحؒ، ڈاکٹر ذاکر حسینؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانویؒ، عزیز الرحمٰن جامعیؒ، شورش کاشمیریؒ، علامہ انور صابریؒ، موتی لال نہرو، گاندھی جی، لالہ لاجپت رائے، سوبھاش چندر بوس، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد، ولبھ بھائی پٹیل، رام منوہر لوہیا وغیرہ۔

ذیل میں ہندوستان کے کچھ عظیم رہنماؤں کے ساتھ مولانا کے خصوصی تعلقات کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری:

آپ علم وفضل کے بحر ناپید کنار تھے۔قوت حافظہ، تبحر علمی اور وسعت معلومات میں اپنی نظیر آپ تھے۔تقویٰ وطہارت اور زہد وقناعت میں بے مثال تھے۔آپ کی ذات گرامی ان چند بلند پایہ ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی تھی، جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور صدیوں کو علم وفضل سے مالا مال کر جاتی ہے۔

آپ ۲۷ رشوال ۱۲۹۲ھ (۶ راکتوبر ۱۸۷۵ء) کو ''دودان'' نامی بستی جو کشمیر کی وادیٔ لولاب میں واقع ہے، پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم والد محترم مولانا معظم شاہ سے حاصل کی، کچھ کتابیں ہزارہ کے مدرسہ میں پڑھیں۔۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔۱۳۱۴ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد قطب عالم حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہو کر سند حدیث اور باطنی فیوض سے مالا مال ہوئے۔پانچ سال مدرسہ امینیہ دہلی، تین سال مدرسہ فیض عام کشمیر میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۳۲۷ھ تا ۱۳۴۵ھ دارالعلوم دیوبند اور ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۵۱ھ مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب کیا۔

درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی رہا، متعدد وقیع تصنیفات منصۂ شہود پر آئیں۔آپ کا عظیم کارنامہ فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی ہے، اس سلسلے میں بھی آپ نے متعدد معرکۃ الآراء

کتابیں تحریر فرمائیں۔مناظرے کیے۔مقدمہ بہاول پور آپ کی زندگی کے اہم کارناموں میں ایک ہے۔

علم وکمال کا یہ آفتاب ۳رصفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۲۹رمئی ۱۹۳۳ء کو ۵۹ سال تین ماہ پانچ دن کی عمر میں دین ودانش کی دنیا کا یہ مہر انور دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ الراجعون۔[۱]

رئیس الاحرار اور علامہ کشمیریؒ:

علامہ انور شاہ علمی وقار وتمکنت کے ایک کوہِ گراں بار تھے، ہر کس وناکس سے ان کا بے تکلف ہونا امر دشوار تھا۔مگر اس کے باوجود رئیس الاحرار ان چند خوش نصیب لوگوں میں تھے جنہیں علامہ انور شاہ بے پناہ عزیز رکھتے تھے۔علامہ، مولانا سے ان کے گھر، ان کی اولاد اور ان کے خاندان سے اس طرح مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور اپنے خاندان سے۔یہی وجہ تھی کہ جب کبھی علامہ انور شاہ لدھیانہ تشریف لے جاتے تو آپ کا قیام رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے گھر پر ہوتا۔علامہ مولانا کے ان اساتذہ میں سے تھے جن سے مولانا کے فکر وعمل کو ایک نئی جہت ملی۔واقعہ یہ ہے کہ مولانا بھی اپنی شاگردی کا پورے طور پر تا زندگی حق ادا کرتے رہے۔خانوادۂ انوری سے مولانا کو غیر معمولی شغف تھا۔ان کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے، پنجاب کے متعدد سفروں میں مولانا کو علامہ کے ساتھ رہنے کا شرف بھی حاصل رہا۔فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کے لیے مشہور مقدمۂ بہاول پور میں علامہ کے ساتھ مولانا کے خاندان کی شرکت مولانا سے تعلقات کا بین ثبوت ہے۔رئیس الاحرار کے علامہ انور شاہ اور ان گھرانے سے تعلقات کے متعلق ابن الانور مولانا انظر شاہ کشمیری کی ذیل کی تحریر سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔فرماتے ہیں کہ:

> ''مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں پڑتا کہ ان سے ملاقات ہوئی ہو اور انہوں نے خالی ہاتھ آنے دیا ہو۔والدۂ مرحومہ ایک زمانہ میں لدھیانہ کے مشہور ہسپتال میں زیر علاج تھیں، راقم بھی ان کے ساتھ تھا، اتفاقاً عید وہیں آگئی، مولانا مرحوم نے جس طرح کے ملبوسات اپنے بچوں کے لیے تیار کیے اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور اعلیٰ خاکسار کے لیے بھی تیار کیے اور جب

---

[۱] تلخیص از انور شاہ کمشیری حیات اور علمی کارنامے/محمد رضوان اللہ/مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ/۱۹۷۴ء
نیز دیکھیں حیات انور، سید محمد از ہر شاہ قیصر، محبوب المطابع برقی پریس دہلی، ۱۹۵۵ء

اس تعلق کے اظہار کے لیے قلم حرکت کرتا ہے تو بے اختیار اپنے والد ماجد قدس سرہ علامہ کشمیری کا وہ مشہور قول یاد آتا ہے ''مجھے ہندوستان میں صرف دو ہی وفادار خاندان ملے، ایک بجنور میں مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم اور پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا''[1]

مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ:

آپ ہندوستان کے مفتی اعظم اور مدبر اعظم ہی نہیں قافلہ فضل وکمال کے درشہوار اور قافلۂ حریت کے سالار تھے۔ آپ کی ذات گرامی مجموعہ کمالات تھی۔ آپ بیک وقت محدث، مفسر، ادیب، شاعر، ریاضی داں، سیاست داں اور مجاہد سب کچھ تھے۔

آپ شاہجہاں پور کے ایک غریب خانوادہ میں ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزازیہ شاہجہاں پور میں ہوئی۔ بعدہٗ دوسال جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں اور تین سال ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں جلیل القدر اساتذہ سے تمام علوم وفنون حاصل کر کے ۱۳۱۵ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر سلوک ومعرفت کی تکمیل بھی کی۔

فراغت کے بعد تقریباً پانچ سال مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور میں درس وافتاء کی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۲۱ھ میں دہلی مدرسہ امینیہ تشریف لائے، ۱۳۳۸ھ میں مولانا امین الدین (بانی مدرسہ) کے وصال کے بعد اہتمام کا منصب بھی سنبھالا، پھر تادم زیست ان خدمات کو انجام دیتے رہے۔ ۵۵ سالہ زمانۂ تدریس میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ارباب فضل وکمالات تیار ہوئے، جن میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی، فقیہ وقت مفتی مہدی حسن، سحبان الہند مولانا احمد سعید جیسے عبقری علماء شامل ہیں۔

درس وتدریس کے علاوہ ملی، قومی اور سیاسی تحریکات میں بھی آپ کی خدمات بے شمار ہیں۔ تحریک شیخ الہند میں شمولیت ۱۹۱۷ء میں انجمن اعانت نظر بندان اسلام اور جمعیۃ علماء ہند کا قیام آپ کے حسن تدبر کا

---

[1] لالۂ وگل، مولانا انظر شاہ، ص: ۱۹۲

نیز۔ یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ، از ہر شاہ قیصر، محبوب پریس دیوبند، ص: ۱۳۴۔۱۴۲

نتیجہ ہیں۔اس کے علاوہ تحریک ارتداد کا مقابلہ،۱۹۲۶ء میں شاہ سعود کی مؤتمر اسلامی اور ۱۹۳۸ء میں فلسطین کانفرنس قاہرہ میں شرکت ورہنمائی آپ کی عظیم القدر خدمات کے چند عنوانات ہیں۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو دہلی میں وصال ہوا اور درگاہ قطب الدین بختیار کاکی میں آسودۂ راحت ہیں۔فرحمة الله رحمة واسعة۔[۱]

رئیس الاحرار اور مفتی صاحبؒ:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے مفتی کفایت اللہ صاحب سے تعلقات کے متعلق غالب گمان ہے کہ رئیس الاحرار کے دورانِ طالب علمی سے ہی رہے ہوں گے۔اس لیے کہ دوران طالب علمی میں ہی رئیس الاحرار کی سیاسی جلسوں میں آمد ورفت شروع ہوگئی تھی۔البتہ تحریک خلافت کے دوران مفتی صاحب سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی ہوا،اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے پروگراموں میں شرکت اور تحریک کشمیر میں مفتی صاحب کے ذریعہ احرار اور حکومت کشمیر کے درمیان مصالحت کی کوشش کی بناء پر رئیس الاحرار مفتی صاحب سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ہندوستان کی جد وجہد آزادی کے دوران قید وبند کی صعوبتیں بھی ساتھ ساتھ برداشت کیں۔مفتی صاحب رئیس الاحرا کے اخلاق وکردار سے بہت متاثر تھے اور انہیں دوست کے درجے میں رکھتے تھے،جب کہ رئیس الاحرار مفتی صاحب کی ایک بڑے بزرگ کی حیثیت سے عزت کرتے تھے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب جب ۱۹۲۳ء میں ملتان سینٹرل جیل میں قید تھے اس وقت ہندوستان کے دوسرے مقتدر علماء کرام کے علاوہ رئیس الاحرار بھی مولانا کے ساتھ قید کی زندگی گذار رہے تھے۔ رئیس الاحرار مفتی صاحب سے پہلے رہا ہوئے تو مفتی صاحب نے ایک نظم رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی شان میں کہی جس سے دونوں مقتدر رہنماؤں کے آپسی تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے،نظم کے چند اشعار اس طرح ہیں:

اے صدیق محترم لدھیانوی　　لو تمہاری بھی رہائی آ گئی

---

[۱] تحریک آزادیٔ ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار،محمد سلمان منصور پوری،ص:۲۰۳

اے شفیق قوم رحماں کے حبیب　　آ گئی تیری جدائی آ گئی
دوستوں کو چھوڑ کے تو بھی چلا　　آہ کیسی شاق ہے فرقت تیری [1]

مولانا ابوالکلام آزاد:

مولانا آزاد ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں تھے جن کے لیے فلک برسوں آہیں بھرتا ہے، جن دیدہ وروں کے انتظار میں نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پہ روتی ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے، یہ جس طرف جھک پڑے تاریخ سازی کا کارنامہ انجام دیا، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں کہ خود جن کے لیے تاریخ لکھی جاتی ہے، ہر راہ میں ان کے نقش قدم موجود، ہر میدان میں یہ سرگروہِ لشکر، ادب ہو، دین ہو، صحافت ہو، یا سیاست ہو، اخبار نکالا تو صحافت کو نئے آفاق سے آشنا کیا، ادب کی طرف جھکے تو اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا، دین کی طرف رخ پھیرا تو ترجمان القرآن جیسا عدیم المثال کارنامہ یادگار چھوڑا اور میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو بڑے بڑے سیاسیوں کے دلوں پر اپنی دیدہ وری کا سکہ بٹھا دیا۔

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ:

''میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا، سیاست کا طالب علم بھی ہوں، علم سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں کسی اور نے نہیں پڑھیں، میں تیسرے چوتھے سال یورپ کا بھی دورہ کرتا ہوں، جہاں سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں نے سیاست کے تازہ ترین علم سے واقفیت حاصل کر لی ہے، لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا ابوالکلام آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی بہت آگے ہیں'' [2]

ہندوستان کے اس عظیم المرتبت قائد کی ولادت ۸/ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ (۱۷/اگست ۱۸۸۸ء) کو مکہ معظّمہ (زادھا اللہ شرفاً وعظماً) میں ہوئی۔ اس وقت مولانا کے والد خیر الدین مکہ کے محلّہ قدوہ متصل باب السلام میں رہتے تھے، مولانا آزاد کی پیدائش کے بعد والد محترم مکہ معظّمہ سے کلکتہ ہجرت کر کے آ گئے،

---

[1] پندرہ روزہ ''الحبیب'' رئیس الاحرار نمبر، لدھیانہ، مئی ۱۹۶۲ء ص: ۳۸

[2] مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، خلیق انجم، اردو اکادمی دلی، ۱۹۸۶ء، ص: ۲۱۶

جہاں مولانا کی نشو نما ہوئی اور ساری تعلیم گھر پر ہی مکمل کی، مجتہدانہ دماغ کے مالک تھے، علوم وفنون پر گہری نظر تھی، اسی کے ساتھ سحر بیانی، خطیب ومقرر بھی تھے، آپ نے اپنے زبان وقلم سے ہزاروں لاکھوں سینوں میں آزادیٔ وطن کی آگ لگادی، آپ کے اخبار ''الہلال'' نے ملک کے چپہ چپہ میں آزادی کا بگل بجادیا، ۱۹۱۵ء میں آپ کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت بنگال نے جلا وطن کر کے رانچی میں نظر بند کردیا۔ آزادیٔ وطن کے حصول میں بار بار قید وبند کے مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ مجلس احرار اسلام ہند کا قیام آپ کے عظیم کارناموں میں ایک ہے، جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے، آزادیٔ ہند سے قبل سات سال کانگریس کی صدارت کی، آزادی کی مشہور تحریک ''کوئٹ انڈیا'' ۱۹۴۲ء میں آپ کی قیادت میں چلائی گئی، آزادی کے بعد کانگریس وزارت میں وزیر تعلیم رہے۔

مولانا اپنی زندگی میں مختلف اخباروں کے ذریعہ بھی قوم کی رہنمائی کرتے رہے، بے شمار کتابیں بھی مولانا کی تصنیف کردہ ہیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔

۱۹ر فروری ۱۹۵۸ء کی صبح کو مولانا پر فالج کا حملہ ہوا، ۲۲ر فروری رات دو بج کر دس منٹ پر ہندوستان اور عالم اسلام کی یہ روشن ترین شمع گل ہوگئی۔ ۲۲ر فروری کی سہ پہر تین بجے مولانا احمد سعید نے دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں نماز جنازہ پڑھائی اور اسی گراؤنڈ میں جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان انہیں دفن کردیا گیا۔[۱]

رئیس الاحرار اور مولانا آزاد:

ہندوستان کے ان چند علماء اور سیاسی رہنماؤں میں مولانا آزاد بھی ہیں جن سے مولانا لدھیانوی کے خصوصی تعلقات رہے ہیں۔ باوجودیکہ مولانا آزاد کے مزاج سے ہم آہنگی ایک مشکل امر تھا۔ مولانا آزاد سے خط وکتابت، سیاسی جلسوں، اصلاحی اور ملی کاموں میں مولانا کے ساتھ شرکت اس بات کا بین ثبوت ہے۔

مولانا لدھیانوی کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اول مرتبہ مولانا آزاد کا نام اپنے والد کی زبان سے

---

[۱] تلخیص از ذکر آزاد، عبدالرزاق ملیح آبادی، اجالا پریس کلکتہ، ۱۹۶۰ء

نیز حیات آزاد، مولانا عظمت اللہ ملیح آبادی، انصاری پریس دہلی، ۱۹۴۰ء

مولانا کے کارناموں کا مختصر خاکہ دیکھیں: بیسویں صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین، ڈاکٹر سنجیدہ خاتون، بھارت آفسٹ دہلی، ۲۰۰۴، ص: ۲۷

۱۹۰۶ء میں سنا، اس کے بعد ''الہلال'' نے مولانا آزاد سے ذہنی طور پر قریب کر دیا۔ لیکن مولانا آزاد سے مکمل تعارف ۱۹۲۲ء میں کانگریس کے اجلاس دہلی سے ہوا۔ پھر وقتاً فوقتاً ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ منظور ہوئی، اس زمانے تک مولانا آزاد سے بڑے گہرے مراسم ہو چکے تھے، ان دنوں مولانا آزاد اکثر دہلی میں رہا کرتے تھے اور مولانا لدھیانوی کا قیام بھی دہلی میں تھا، اس لیے اکثر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ بارہا ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولانا لدھیانوی کا پورا پورا دن مولانا آزاد کے ساتھ گذر جاتا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک جب مولانا لدھیانوی مدت اسیری گذارنے کے بعد رہا ہوئے تو اس رہائی میں مولانا آزاد کی ہی کوشش شامل تھی۔ ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک بارہا مولانا لدھیانوی مولانا آزاد کے ساتھ سیاسی، دینی اور اصلاحی کاموں میں شریک رہے۔

سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی:

آپ کا شمار ہندوستان کے مشاہیر اور صف اول کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ آپ ہندوستان کے خوش بیان واعظ، مقرر و مناظر اور جنگ آزادیٔ ہند کے سپہ سالار تھے، آپ کی پیدائش ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفیٰ آبادی اور قاری محمد یسٰین سکندرآبادی سے حاصل کی، حفظ قرآن کی تکمیل مدرسہ حسینیہ دہلی میں ہوئی۔ مدرسہ امینیہ دہلی میں مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ اور دیگر اساتذہ سے جملہ علوم وفنون کی کتابیں پڑھ کر ۱۳۳۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ امینیہ میں ہی تدریسی خدمات انجام دیں۔ اسی زمانے میں آریوں وغیرہ سے متعدد مناظرے کیے۔ ترجمہ قرآن بیان کرنا زندگی بھر کا وظیفہ رہا۔

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس میں آپ کا نمایاں کردار ہے۔ ملی وقومی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ تحریکات آزادی کے دور میں آٹھ مرتبہ قید وبند کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔[1]

مولانا موصوف کی سیاسی اور مذہبی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے عزیز الرحمٰن جامعی تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا کی پوری زندگی سیاسی رہی، لیکن مذہب کے تابع رہی، کبھی کوئی قدم ایسا نہیں اٹھا جسے

---

[1] تحریک آزادیٔ ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، محمد سلمان منصور پوری، ص: ۲۱۳

اسلام کے منافی کہا جاسکے،.....تحریک خلافت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک متعدد بار جنگ آزادی میں جیل گئے ہیں اور بہت سے نامور جیل خانوں کو آباد کیا ہے.....'' [۱]

رئیس الاحرار اور سحبان الہند:

رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی کے مولانا احمد سعید سے روابط روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔خلافت تحریک سے لے کر ۱۹۴۷ء تک دونوں بزرگوں نے مختلف موقعوں پر ایک ساتھ مل کر قوم کی رہنمائی کی ہے اور ایک ساتھ جد جہد آزادی میں قید وبند کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ دونوں بزرگوں کے خطوط سے آپسی تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے،جس میں مولانا احمد سعید کہیں تو سرحدی مسلمان،فلسطین کے مسلمان،عرب اور افریقہ کے مسلمانوں پر مظالم اور ان کا سد باب کے متعلق مشورہ لیتے ہیں،کہیں جمعیۃ علماء پنجاب کے ذمہ داران علماء کے انتخاب کے لیے مولانا سے اصرار کرتے ہیں،کہیں ملی مسائل کو سامنے رکھ کر مولانا لدھیانوی کو مشورہ دیتے ہیں کہ جمعیۃ علماء ہند اور احرار متحد العمل ہوجائیں،تو کہیں تحریر کرتے ہیں کہ ''آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے'اور یہ کہ ''ملاقات ہونے پر بہت سی ضروری باتیں کرنی ہے آپ سے'' [۲]

رئیس الاحرار نے تعلقات کا یہ سلسلہ اخیر وقت تک جاری رکھا۔خاص طور پر آزادی کے بعد دہلی کے مسلمانوں کے جو مسائل سامنے آئے دونوں بزرگوں نے اس میں مسلمانوں کی پوری رہنمائی کی اور عوام وخواص کے مرکز توجہ بنے رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن (مجاہد ملت):

ملت اسلامیہ ہند کے بطل جلیل اور قائد بے مثل،جس نے اپنا سرمایۂ حیات قوم ووطن کی راہ میں نچھاور کردیا،جس نے ۱۹۴۷ء کے سیلاب حوادث کا پامردی سے مقابلہ کیا اور ملت اسلامیہ کی ڈوبتی کشتی کو سہارا دیا،۱۰/جنوری ۱۹۰۱ء(۱۳۱۸ھ) کو سیوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔اسم گرامی ''معز الدین'' تھا مگر

---

[۱] جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین،عزیز الرحمٰن جامعی،اعلیٰ پریس بلی ماران دہلی،۱۹۷۵ء ص:۱۳۷

[۱] درحدیث دیگراں،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۳۰۶

تاریخی نام ''حفظ الرحمٰن'' سے مشہور ہوئے ،ابتدائی تعلیم گھر پر والد ماجد مولوی شمس الدین سے حاصل کی اور درس نظامی کی تقریباً تمام کتابیں مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں پڑھیں ۔۱۳۴۱ھ میں از ہر ہند دارالعلوم دیوبند پہونچے ،وہاں علامہ انور شاہ کشمیری کے چشمہ فیض سے خوب خوب سیرابی حاصل کی ،۱۳۴۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ۔فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند ،جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ،جامعہ اسلامیہ امروہہ وغیرہ میں چند سال تدریسی خدمات انجام دیں۔

آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت کے دور سے ہوا،۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم کو اپنی خدمات کا مرکز بنا کر اپنی زندگی کو خدمت ملک وملت کے لیے وقف کر دیا۔دارالعلوم دیوبند،مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ،جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی مجالس انتظامیہ کے فعال ممبر رہے ۔قصص القرآن ،اسلام کا اقتصادی نظام اور اخلاق وفلسفۂ اخلاق جیسی وقیع تصنیفات آپ کی علمی یادگار ہیں ۔۲/اگست ۱۹۶۲ء کو آپ کا انتقال ہوگیا اور محدثین دہلی کے پہلو میں آسودۂ خواب ہوگئے ۔[۱]

مجاہد ملت کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا شریف حسین قاسمی تحریر کرتے ہیں:

''مجاہد ملت کی تقاریر پر وہ مذہبی ہوں یا سیاسی نوعیت کی ،ان کے زور خطابت کا بے مثال نمونہ تھیں،مولانا نے خطابت کے ساتھ تحریر وانشاء کے میدان میں بھی اپنا گہرا نقش چھوڑا ہے ، آخری دور کی تقاریر وخطابت میں جو ادبی چاشنی ہمیں مولانا کے ہاں ملتی ہے،وہ آپ کی متعدد تصانیف میں نظر نہیں آتی ،قصص القرآن ،اسلام کا اقتصادی نظام ،اسلام کا فلسفۂ اخلاق ،یہ چند ایسی اہم تاریخی اور مذہبی کتابیں ہیں جن میں مولانا نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کو ٹھیٹ مولویانہ نہیں بننے دیا ہے بلکہ ادبی لطافت اور شگفتگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے'' [۲]

---

[۱] مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ،ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری،اشتیاق پرنٹنگ پریس لاہور،۲۰۰۱ء
نیز ماہنامہ فاران،جنوری،۱۹۵۷ء

[۲] دلی والے،ڈاکٹر صلاح الدین ،ثمر آفسٹ پرنٹر،دہلی،۱۹۸۸ء،ص:۲۷۸

رئیس الاحرار اور مجاہد ملت:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک دوسرے کے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ رفیق کار بھی تھے، جمعیۃ علماء کی کانفرنس ہو یا مجلس مشاورت کی میٹنگ، ہمیشہ مولانا لدھیانوی جمعیۃ کے پروگراموں میں شریک ہوتے رہے، آزادی سے قبل ہندوستان کے مختلف مسائل پر مولانا سیوہاروی کے کئی خطوط مولانا لدھیانوی کے نام ہیں جن سے دونوں مقتدر رہنماؤں کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

خود مولانا سیوہاروی کا قول ہے کہ:

''مولانا حبیب الرحمٰن میرے مقتدر رفیقوں میں تھے'' [1]

آزادیٔ ہند کے وقت مولانا لدھیانوی پاکستان چلے گئے تھے۔لیکن کچھ ہی دنوں بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب مولانا آزاد کی زیر صدارت مسلمانان ہند کی عظیم الشان کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو مولانا لدھیانوی اس موقع پر پاکستان سے ہندوستان واپس آ گئے اور مولانا کی اس آمد کے محرک بھی مولانا حفظ الرحمٰن ہی تھے، اس سلسلے میں مولانا لدھیانوی کا قول ہے کہ: ''مولانا حفظ الرحمٰن نے دو تین تار دیے تھے، کسی طرح آ گیا ہوں'' [2]

مولانا معین الدین اجمیری:

آپ علم وفضل کے بحر ناپید کنار تھے، قوت حافظہ، تبحّر علمی اور وسعت معلومات میں اپنی نظیر آپ تھے، اسی طرح تقویٰ وطہارت اور زہد وقناعت میں بے مثال تھے، آپ ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو ایک نو مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے جملہ معقول و منقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی سے کرایا۔علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب سے حاصل فرمایا۔بائیس سال کی عمر سے ہی درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا، ہندوستان اور

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن، ص: ۲۱۰

[2] ایضاً، ص: ۱۷۳

ہندوستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در جوق آئے اور تلمذ کا رشتہ قائم کیا۔ ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں رہے، ۱۳۲۷ھ میں اجمیر شریف میں مدرسہ معین الحق قائم کیا اور یہاں درس دیتے رہے۔ ۱۳۳۸ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم کیا اور ۱۲ رسال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرماتے رہے۔

آپ کی وفات ۱۰ رمحرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن ہوئی۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین عمل میں آئی۔ وفات کے وقت کل ''خزانہ عامرہ'' سولہ روپیہ چند آنہ خاص صندوقچہ سے نکلا۔ [۱]

آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا۔ کچھ دنوں تک اس تحریک کی رہنمائی بھی کی۔ جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر بھی رہے۔ تحریک کشمیر کے زمانے میں مجلس احرار اسلام ہند کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے آپ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ کتاب 'باغی ہندوستان' میں مولانا کے سیاسی تناظر کا خاکہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> ''مولانا کا سیاسی مسلک تحریک خلافت سے لے کر آخر وقت تک ایک ہی رہا، غیر ملکی حکومت کا خاتمہ اور استخلاصِ وطن کی جد جہد میں تمام اقوامِ ہندوستان سے اشتراکِ عمل، مجلس احرار اسلام، جمعیۃ علماء ہند، آل انڈیا خلافت کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس، ہر آزادی پسند جماعت کے رکن رکین تھے، صوبائی و مرکزی صدر و ڈکٹیٹر رہے'' [۲]

مولانا موصوف کی جلالت علم اور تبحر فن کی علمی دنیا میں دھاک تھی۔ ایثار و قربانی اور خدمت قومی سے ان کی شخصیت معمور تھی، ہندوستان کے جلیل القدر رہنما اور لیڈر، ان کے آگے سر جھکانا باعث عزت سمجھتے تھے، مولانا محمد علی جیسا منچلا اور کسی سے نہ دبنے والا لیڈر فروتنی اور عجز کے ساتھ ان کے خلوص، صداقت اور فضل و کمال کا معترف تھا'' [۳]

---

[۱] تلخیص از یادرفتگاں، سید سلیمان ندوی، ص: ۱۹۷

[۲] باغی ہندوستان، ترجمہ عبدالشاہد خان، ص: ۲۱۴

[۳] دید و شنید، رئیس احمد جعفری، ص: ۱۲۳

رئیس الاحرار اور مولانا اجمیری:

مولانا اجمیری بھی رئیس الاحرار کی طرح جنگ آزادی کے ایک عظیم رہنما تھے۔تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اِن دونوں کا تعلق رہا۔تحریک کشمیر میں جب مولانا اجمیری ڈکٹیٹر کے منصب پر فائز ہوئے تو اس تعلق میں مزید اضافہ ہوگیا۔

چودھری افضل حق:

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جن مردان حُر نے تاریخ کے اہم ترین سیاسی موڑ پر متحدہ ہندوستان میں مسلمان قوم کی سیاسی اور مذہبی رہنمائی کی، نیز مجلس احرار اسلام ہند کی عنان اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں رہی ان میں چودھری صاحب کا نام سرخیوں میں آتا ہے۔

چودھری صاحب ۱۸۹۱ء کو ہوشیار پور تحصیل گڑھ شنکر میں راجپوتوں کے ایک معزز گھرانے چودھری امیر خاں کے گھر پیدا ہوئے۔گھر کا ماحول دیندار تھا، لہٰذا بچپنا میں نماز اور دین کے دوسرے امور سے کما حقہ آشنا اور ان کے پابند تھے۔ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں مکمل ہوئی، انٹرنس امرتسر میں کیا، جب کہ ان کا باقی خاندان بھی امرتسر منتقل ہو چکا تھا، ۱۹۱۰ء میں لاہور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا، ۱۹۱۳ء میں دیال سنگھ کالج میں داخل ہوئے، مزید کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد تعلیم کا ارادہ ترک کر دیا اور ۱۹۱۷ء میں پولیس میں سب انسپکٹر بھرتی ہوگئے، ابتدائی ٹریننگ کے لیے فلور بھیجا گیا، اس کے بعد انہیں لدھیانہ پولیس تھانہ میں لگا دیا گیا۔

چودھری صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۲۱ء سے ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں تحریک خلافت زوروں پر تھی، چودھری صاحب بطور انسپکٹر پولیس سیاسی جلسوں کی رپورٹ لکھنے پر مامور تھے۔ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری لدھیانہ میں تقریر کر رہے تھے اور چودھری صاحب حسب معمول ان کی تقریر کی ڈائری لکھ رہے تھے، شاہ جی نے تقریر کے دوران انگریزوں کے ترکوں پر مظالم اس انداز میں بیان کیے کہ چودھری صاحب پولیس سے مستعفی ہو کر خلافت کمیٹی میں شامل ہوگئے۔نوکری سے

فارغ ہوکر چودھری صاحب نے اپنے آبائی گاؤں گڑھ شنکر سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

سب سے پہلی مرتبہ آپ کی گرفتاری ۱۹۲۲ء میں ہوئی جبکہ آپ ترکوں پر انگریزوں کے ظلم وتشدد کی داستانیں سنا کر گاؤں والوں کو بھڑکا رہے تھے۔ اسی سلسلے میں ۱۶ رفروری ۱۹۲۲ء کو زیر دفعہ ۱۱۷/ چھ ماہ کی سزا ہوئی اور انہیں انبالہ جیل بھیج دیا گیا۔ جیل خانے میں آپ نے غیر سیاسی قیدیوں پر سرکاری افسروں کا تشدد اور سیاسی قیدیوں سے امتیاز کا مطالبہ کرتے ہوئے جیل کے نظم ونسق کے خلاف بغاوت کردی۔ آئی جی پولیس نے چودھری صاحب کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور کہا:

''پولیس کی نوکری چھوڑ کر انگریزوں سے حکومت چھیننے آئے ہو، اب اس کا مزہ دیکھو''

اس کے نتیجے میں چودھری صاحب کو تا سزا یعنی چھ ماہ تک پاؤں میں بیڑیاں اور ساتھ ہی کھڑی ہتھکڑی کی سزا دی گئی۔ چودھری صاحب کو صبح آٹھ بجے ان کی کوٹھری سے نکالا جاتا اور ایک درخت کے ساتھ دائیں ہاتھ کو ہتھکڑی لگا کر باندھ دیا جاتا اور شام چھ بجے تک چودھری صاحب اسی حالت میں کھڑے رہتے، بیڑیاں اور دایاں بازو اوپر اٹھائے کھڑے رہنے کے نتیجے میں ان کا دایاں بازو بیکار ہو چکا تھا، یہی وجہ تھی کہ چودھری صاحب بائیں ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔

سزا ختم کر کے رہا ہوئے تو اپنے ضلع کی کانگریس کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۲۶ء میں چودھری صاحب پہلی بار اپنے ضلع سے پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، اور یہ سلسلہ ۱۹۳۷ء تک رہا، اس عرصہ میں قیدیوں کی اصلاح کے لیے سرکاری کمیٹی کے غیر سرکاری ممبر بھی رہے اور پنجاب کے جیل خانوں کی اصلاح کی نیز پنجاب اسمبلی میں سکھوں کی طرح مسلمانوں کے لیے تلوار اور کلہاڑی بلا لائسنس رکھنے کی اجازت حاصل کی اور اس کے لیے باقاعدہ قانون بنوایا۔[1]

۱۹۲۹ء میں جب مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی گئی تو آپ اس میں ایک اہم شخصیت کی حیثیت سے شریک تھے، اور اس کے بعد کی اپنی پوری سیاسی زندگی مجلس احرار کی رہنمائی کرتے ہوئے صرف کردی، نمک ستیہ گرہ، تحریک کشمیر، کوئٹہ زلزلہ اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں جو خدمات آپ نے کی ہے اور جس طرح ان تحریکوں میں مجلس احرار کی خاص طور پر پنجاب اور کشمیر کے مسلمانوں کی راہنمائی کی ہے یہ یقیناً

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ص:۱۲۶

ہندوستان کی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے۔

چودھری صاحب کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا، تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی۔

چودھری افضل اور مولانا لدھیانوی:

رئیس الاحرار کے چودھری صاحب سے تعلقات، غالب گمان یہ ہے کہ تحریک خلافت سے شروع ہوگئے تھے۔اس تعلقات میں علاقائیت کا بھی دخل تھا،مجلس احرار کے قیام میں چودھری صاحب اور مولانا پیش پیش رہے، اور دونوں حضرات احرار کے لیے روحِ رواں تسلیم کیے گئے۔چودھری صاحب کے انتقال ۱۹۴۱ء تک دونوں حضرات کے درمیان تعلقات بڑے گہرے رہے اور احراری ہونے کی وجہ سے تعلقات میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔چودھری صاحب کے انتقال کے بعد احراری رہنماؤں میں جتنا نقصان مولانا لدھیانوی کو ہوا شاید کسی کو ہوا ہو۔

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ:

آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔آپ کی ذات ستودہ صفات آفتاب عالم تاب کی طرح روشن ہے۔ بلاشبہ آپ اپنے وقت کے بلند پایہ عالم اور بلند پایہ عظیم عبقری شخصیات میں سرفہرست تھے۔علم و فضل، زہد وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، جرأت وہمت، استقامت وعزیمت اور تدبر وذکاوت میں یگانۂ روزگار تھے۔آپ کا خاندان محمد تغلق (۷۲۵ تا ۷۵۲ھ) کے عہد سے میرٹھ میں قضات کے اہم منصب پر فائز اور علم و عمل میں ممتاز رہا ہے۔آپ کے جد امجد قاضی احمد اللہ شہیدؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ بالاکوٹ کے معرکہ ۱۲۴۶ھ میں شامل ہوئے اور جام شہادت نوش کیا۔آپ کے دادا قاضی عبدالباریؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ والد محترم مولانا بشیر الدینؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور مولانا ناظر حسن کے ارشد تلامذہ میں تھے،انہیں حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے حدیث کی سند حاصل تھی، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا تذکرہ عزیزیہ اور ملفوظات عزیزی وغیرہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

قاضی صاحب کی ولادت ۱۹۱۰ء/ ۱۳۲۸ھ میں میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میرٹھ میں اور پھر مدرسہ امدادالاسلام میرٹھ میں پائی (مدرسہ دارالعلوم میرٹھ کے قیام کے بعد پہلے طالب علم ہونے کا شرف بھی قاضی صاحب کے نام ہے [۱]) عربی ادب کا ذوق مدرسہ امدادالاسلام کے استاذ مولانا اختر شاہ خاں صاحب کی صحبت میں پیدا ہوا اور اسی مدرسہ میں مشکوٰۃ اور بیضاوی تک مولانا عبدالمومن دیوبندیؒ سے پڑھا۔ اسی دوران آپ نے فاضل ادب عربی کا امتحان الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا اور ہائی اسکول تک انگریزی پڑھی۔ حدیث کی تکمیل کے لیے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۴۵ھ میں داخل ہوئے جہاں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے حدیث کا فیض حاصل کیا اور ۱۳۴۶ھ میں امتیاز کے ساتھ دورۂ حدیث سے فراغت پائی۔

بلاشبہ آپ کی شخصیت ہمہ گیر تھی، لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا کا رجحان علمی میدان کی طرف زیادہ رہا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی مولانا کے عربی قصائد لکھنے، عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے، اور اردو انشا پردازی میں علمی حلقوں میں شہرت حاصل کرلی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد لاہور سے نکلنے والا ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے، ۱۳۵۷ھ میں جب دہلی میں ندوۃ المصنفین قائم ہوا تو اس کے رفقائے تحریر اور بانیان میں تھے اور بعد میں آپ نے اپنے وطن میرٹھ سے ''الحرم'' کے نام سے ایک موقر ماہنامہ بھی جاری کیا جسے عوام وخواص میں مقبولیت حاصل ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد ۱۹۵۷ء میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مولانا اسلم جے راج پوری کی جگہ تاریخ اسلام اور تفسیر کے استاذ کے منصب کے لیے آپ کو دعوت دی، جہاں ایک عرصہ تک آپ اس منصب پر فائز رہے۔ آپ جامعہ میں نظامت دینیات کے منصب پر بھی فائز رہے اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس عہدہ پر آپ سے پہلے خواجہ عبدالحی مرحوم ناظم دینیات رہ چکے تھے۔

قاضی صاحب عربی اور اردو کے اعلیٰ انشا پرداز اور عظیم مصنف تھے۔ آپ کے مضامین دینی رنگ اور ادبی چاشنی اور اسلامی افکار کے جامع ہونے کی وجہ سے خواص وعوام میں دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے اور تمام اہم مجلّات میں شایع ہوئے۔ ندوۃ المصنفین سے شایع ہونے والی پہلی کتاب آپ کی تصنیف

---

[۱] تذکرہ مدرسہ اسلامی میرٹھ، علامہ محمد اسحٰق القاسمی، المکتبۃ القیمہ کراچی،

''نبی عربی'' اور ''تاریخ ملت'' کے دوسرے حصے نہ صرف یہ کہ عوام میں بے حد مقبول ہوئے بلکہ یونیورسٹیوں اور مدارس کے نصاب میں شامل ہوئے۔ آپ کی مرتبہ قرآنی لغت ''قاموس القرآن'' اور عربی اردو لغت ''بیان اللسان'' نے برصغیر کے علمی حلقوں میں بے حد شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) بیان اللسان پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ''انہوں نے عربی ادیبوں، طلبہ، مدارس اور اساتذہ علوم عربیت پر احسان فرمایا ہے [۱]'' قاموس القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تحریر کرتے ہیں: ''آپ نے یہ کتاب لکھ کر بہت بڑی خدمت انجام دی''۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کتاب کی افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ''علمی کاموں میں یہ ''قاموس القرآن'' میرے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہے'' [۲] اس کے علاوہ بھی آپ کی کچھ ایسی کتابیں ہیں جنہیں عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی، مثلاً ''مفتاح النحو، نبی عربی، خلافت راشدہ، خلافت بنی امیہ، کلام عربی، سیرت طیبہ اور اخلاق نبوی وغیرہ۔

قاضی صاحب علمی مشغولیات کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں اور تنظیموں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ، مجلس منتظمہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، فیکلٹی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند وغیرہ کے رکن اور آل انڈیا دینی تعلیمی بورڈ کے صدر رہ چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے سعودی عرب اور پاکستان کے دورے بھی کیے، آپ کی علمی خدمات کا اعتراف سرکاری سطح پر بھی کیا گیا اور ۱۵/اگست ۱۹۸۰ء میں سند اعزازی برائے ممتاز فضلائے عربی، صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے پیش کی گئی۔

آپ کی وفات ۳۱/مارچ ۱۹۹۱ء/۱۴/رمضان المبارک بروز اتوار ۱۴۱۱ھ کو میرٹھ شہر میں ہوئی۔ نماز جنازہ مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری 'حال مہتمم دارالعلوم دیوبند' نے پڑھائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ [۳]

---

[۱] بیان اللسان، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مکتبہ علمیہ میرٹھ، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۳

[۲] قاموس القرآن، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی،

[۳] شخصیات میرٹھ، نور احمد میرٹھی، ادارہ فکرِ نو، کراچی، ۲۰۰۳ء

نیز دیکھیں: ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء، گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۴۲

رئیس الاحرار اور قاضی صاحب:

قاضی صاحبؒ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی جانتے تھے۔ اسی طرح رئیس الاحرار کو بھی قاضی صاحب سے غائبانہ تعارف تھا۔ قاضی صاحب کی تصنیف کردہ کتاب ''خلافت راشدہ'' اور ''خلافت بنی امیہ'' کا مطالعہ اپنی جیل کی زندگی میں کر چکے تھے۔ مگر قربت حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی خدمت میں دونوں کی حاضر باشی اور ان سے عقیدت کی وجہ سے ہوئی اور جب ۱۹۴۷ء کے بعد رئیس الاحرار نے دہلی میں اقامت کر لی تو دونوں حضرات کے درمیان محبت اور دوستی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ قاضی صاحب جب بھی دہلی تشریف لاتے تو قیام رئیس الاحرار کے گھر پر بھی ہوتا رہا اور جیسے جیسے تعلقات میں پختگی آتی گئی رئیس الاحرار کا مکان مولانا کے لیے مستقل قیام گاہ بنتا گیا۔ خود قاضی صاحب اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''میرا دہلی آنا جانا ''الحرم'' اور اس کے مکتبہ کی کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں رہتا ہی تھا، مولانا سے برابر ملاقات ہونے لگی، بلکہ مولانا کا دولت کدہ ہماری مستقل قیام گاہ بن گیا''[1]

۱۹۵۵ء میں جب رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سفر حج کو تشریف لے گئے تو قاضی صاحب بھی آپ کے ساتھ شریک سفر تھے اور اب قاضی صاحب نے مولانا کے مشیر خاص اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل کر لی۔

ملک کے مختلف مقامات پر دینی اور ملی مسائل پر جو کانفرنس یا میٹنگ ہوتی مولانا کے ساتھ قاضی صاحب بھی اس میں شرکت کرتے۔ رئیس الاحرار جب بھی دہلی سے دیوبند تشریف لے جاتے تو میرٹھ میں قاضی صاحب کے مکان پر کچھ دیر کے لیے ضرور ٹھہرتے۔ قاضی صاحب کی تصنیف کردہ کتاب ''قاموس القرآن'' میں رئیس الاحرار کا مختصر مگر وقیع تبصرہ بھی موجود ہے۔

۱۹۵۶ء میں رئیس الاحرار نے اپنے انتقال سے قبل انجمن حمایت اسلام کی میٹنگ قاری طیب صاحبؒ کی صدارت میں منعقد کرائی۔ قاضی صاحب بھی اس میں رئیس الاحرار کی دعوت پر شریک ہوئے اور

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۷۴

جب اگلے روز رئیس الاحرار کا انتقال ہوا تو قاضی صاحب رئیس الاحرار کے گھر پر ہی موجود تھے۔

دونوں بزرگوں کے جس طرح کے تعلقات تھے آج بھی اس کے اثرات دونوں خاندانوں پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ:

ہندوستان کی عظیم دینی درس گاہ درالعلوم دیوبند کے تعلق سے جو شخصیات اقوام عالم میں مشہور ہوئیں ان میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سرفہرست ہیں۔آپ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے ہیں۔۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے،تاریخی نام ''مظفر الدین'' تھا۔۷/سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے،دوسال میں قرآن مجید قرأت وتجوید کے ساتھ حفظ کیا،پانچ سال فارسی اور ریاضی کی تعلیم لی،اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہوئی،۱۹۱۸ء میں سند فضیلت حاصل کی۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ علم حدیث میں آپ کے خاص استاذ ہیں۔فراغت کے دوسال بعد ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند سے بیعت کی۔حضرت کی وفات کے بعد مولانا انور شاہ کشمیری کی طرف رجوع کیا اور ۱۹۳۱ء میں حضرت تھانوی نے خلافت سے سرفراز فرمایا۔

تکمیل علوم کے بعد قاری صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر تقرر ہوا۔۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے انتقال کے بعد قاری صاحب کو مہتمم بنادیا گیا۔اس عظیم عہدہ پر آپ تقریباً ۵۳/سال تک فائز رہے۔ دارالعلوم دیوبند آپ کے دور اہتمام میں بے پناہ ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔دارالعلوم دیوبند کا صدسالہ اجلاس (۱۹۸۰ء) آپ کی زندگی کا عظیم کارنامہ ہے۔

علمی سلسلے میں درس وتدریس کے علاوہ وعظ وخطابت میں آپ کو خداداد ملکہ اور قوت بیان حاصل تھا،جدید تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے علمی اور حکیمانہ اسلوب بیان سے خاص طور پر متاثر ہوتا تھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں آپ کی تقریریں خاص طور پر مقبول تھیں،بعض معرکہ آرا تقریریں کتابی

صورت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔

قاری صاحب ہندوستان کے علاوہ بیرون ممالک افغانستان، برما، جنوبی افریقہ، مشرقی افریقہ، زنجبار، کینیا، روڈیشیا، ری یونین، عدن، کویت، حجاز، مڈغاسکر، حبش، مصر، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں بھی اپنی ایک شناخت اور علمی حلقہ رکھتے تھے۔ اس میں آپ کے بیعت وارشاد کے سلسلے کو بھی دخل تھا جو ہندو بیرون ہند پھیلے ہوئے تھے۔

ان گونا گوں مصروفیتوں کے علاوہ جن چیزوں سے آپ کو خاص دل چسپی رہی ہے وہ تعلیم وتدریس اور دعوت وتبلیغ ہے۔ ان کمالات کی وجہ سے ملک میں آپ کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ اس کے علاوہ مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ ہمیشہ جاری رہا۔ آپ کی تصانیف بے شمار ہیں۔ جو مختلف اسلامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ معروف ترین تصانیف سائنس اور اسلام، التشبّہ فی الاسلام، خاتم النبیین، اسلام میں اخلاق کا نظام، فطری حکومت، اسلام اور مسیحی اقوام، حدیث کا قرآنی معیار، کلمۂ طیب وغیرہ ہیں۔[1]

آپ کا انتقال ۱۹۸۳ء میں ہوا اور مزار قاسمی (دیوبند میں جہاں بزرگان دین کی قبریں ہیں) اپنے جد امجد کے آغوش میں مدفون ہوئے۔ رحمهم الله رحمة واسعة۔

رئیس الاحرار اور قاری صاحب:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور قاری محمد طیب صاحب کے آپسی تعلقات دو طرح کے تھے۔ پہلا یہ کہ رئیس الاحرار کا قاری صاحب سے خاندانی نوعیت کا تعلق تھا اور قاری صاحب کے اہل بیت لدھیانہ کے سفر میں رئیس الاحرار کے گھر پر مقیم بھی ہوتے رہے۔ دوسرے یہ کہ رئیس الاحرار دارالعلوم کے ایک فیض یافتہ تھے، قاری صاحب کے دور اہتمام میں بارہا دیوبند آتے اور دارالعلوم کے دینی اور ملی مسائل پر اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔

قاری صاحبؒ اس آپسی تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میرا ان کا تعلق شخصی نہیں بلکہ خاندانی نوعیت کا تھا، موقع بہ موقع ہمارے اہل بیت ان کے

---

[1] تلخیص از تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی، جید پریس بلی ماران دہلی، ۱۹۷۸ء، ج۲، ص: ۱۳۶-۱۳۳

یہاں مقیم ہوتے تھے اور گھر جیسا معاملہ تھا۔ میرے ساتھ خصوصیت سے ممدوح کو مخلصانہ محبت تھی اور حاضر و غائب خیر خواہی فرماتے تھے'' [۱]

مہاتما گاندھی:

بابائے قوم اور مہاتما گاندھی کے نام سے مشہور ہونے والے موہن داس کرم چند گاندھی کی پیدائش ۲/اکتوبر ۱۸۶۹ء کاٹھیاوار میں پور بندر مقام پر ایک مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کرم چند پور بندر صوبے کے وزیر اعظم تھے، ان کی والدہ سادھو کی طرح زندگی گذارنے اور مذہب میں یقین رکھنے والی تھیں۔ گاندھی جی کو ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول میں وقت کی پابندی اور اساتذہ کے حکم کی تعمیل کرنے والے تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن لوٹے۔ کاٹھیاوار اور بمبئی میں تھوڑے دنوں تک وکالت کرنے کے بعد ایک مسلم گجراتی کی طرف سے ایک مقدمہ کی پیروی کرنے ساؤتھ افریقہ گئے۔ ساؤتھ افریقہ میں کالے گورے رنگ کے بھید بھاؤ نے ان کی زندگی میں ایک ہلچل مچائی، ان کا ماننا تھا کہ ''سب انسان بھگوان کے بنائے ہوئے ہیں، پھر بھی لوگ اس میں امتیاز کرتے ہیں''۔ جس سے ان کی نفرت ایک عوامی زندگی میں ڈھل گئی۔ اسی کے پیشِ نظر ۱۹۰۶ء سے ساؤتھ افریقہ کے اندر ستیہ گرہ کا آغاز کیا جس میں انہیں کامیابی ملی، پھر ہندوستان میں ۱۹۱۶ء سے سیاست میں آ گئے۔ مگر باضابطہ گاندھی نے اپنی سیاسی زندگی چمپارن کے ستیہ گرہ سے شروع کی اور یہاں پر نیل کی کاشت کاری کرنے والے کسانوں پر گورے زمینداروں کو جانچ کرنے کے لیے حکومت کو ایک کمیشن منتخب کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے ایک سال بعد کھیڑا ضلع میں ٹیکس نہ دو تحریک اور احمد آباد میں مزدور تحریک میں انہیں کامیابی ملی۔

ابتدا میں گاندھی حکومت انگریز کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں برطانوی حکومت کے ذریعہ ''رولٹ ایکٹ'' کی شکل میں قانون پاس کیے جانے اور ۱۹۱۹ء میں ''جلیان والا باغ'' قتل عام کی وجہ سے

---

[۱] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۰

حکومت کے قانون سے یقین اٹھ گیا اور 'مسلمان خلافت تحریک' کے سوال پر حکومت کے خلاف تحریک شروع کرنے کا پروگرام بنایا اور مسلمانان ہند کے ساتھ خلافت تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۴ر فروری ۱۹۲۲ء کو ''چوری چورا'' سانحہ کے بعد اس تحریک سے اپنے آپ کو الگ کرلیا، ۴ر مارچ ۱۹۲۲ء کو گاندھی کو گرفتار کر کے غداری کے جرم میں سات سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ان کی صحت برابر خراب رہنے کی وجہ سے ۵ر فروری ۱۹۲۴ء کو جیل سے آزاد کر دیا گیا، ۱۹۲۵ء میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے ۲۱ر دن کی بھوک ہڑتال کی اور اسی وقت کانگریس کے صدر چنے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ''ارون معاہدہ'' کو رد کر کے ''سکنڈ ٹیبل کانفرنس'' میں حصہ لیا۔ دوبارہ جیل گئے اور چند دنوں بعد ۱۹۳۴ء میں رہا ہوئے۔ گاندھی ہمیشہ عوامی فلاح کے لیے کام کرتے رہے۔ ان سے ہندو مسلم اتحاد، سماجی سدھار، عورتوں کی فلاح و بہبودگی اور 'ہت کرگھا' صنعتوں کو فروغ ملا۔

بالآخر ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ان کے ہم مذہب ناتھورام گوڈسے نے تین گولیاں داغ کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ گاندھی سیاسی لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے درجے کے انگریزی کے صحافی وانشاء پرداز بھی تھے۔ ان کی تمام تحریروں کو حکومت ہند نے ۹۲ر جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ [۱]

رئیس الاحرار اور گاندھی جی:

ہندوستان کی اس قدر آور شخصیت سے بھی مولانا کے تعلقات سیاسی سطح پر بڑے گہرے رہے ہیں۔ گاندھی جی سے مولانا کی ملاقات آزادی سے قبل اور بعد کی ملکی اور ملّی مسائل کے تحت ہوتی رہی۔ کبھی کبھی ملاقات کے دوران مذہبی گفتگو بھی ہوتی تھی اور مولانا اسلامی تعلیمات کو قرآن وسنت کی روشنی میں گاندھی جی کے سامنے پیش کرتے، جسے گاندھی جی یکسو ہو کر سنا کرتے تھے۔

ملکی مسائل پر جب بھی گفتگو ہوتی مولانا کا انداز بے باکانہ ہوتا اور مرعوب ہوئے بغیر ہندوستان کے خصوصاً مسلمانوں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ان مسائل کے حل کی بھی وضاحت کرتے اور پرزور

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مہاتما گاندھی، بی۔ آر۔ نندا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں دہلی، ۲۰۰۲ء، طبع ثانی نیز، گاندھی جی، اسرار احمد آزاد، ۱۹۴۸ء

انداز میں دلیل دے کر اپنی بات کو منوانے کی کوشش بھی کرتے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان خصوصاً دہلی اور پنجاب کے جو حالات ہوئے، قتل و غارت گری عام ہونے لگی تو مولانا نے گاندھی جی سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی، اس ملاقات میں ملکی حالات پر جس طرح سے گفتگو ہوئی اس سے دونوں رہنماؤں کے آپسی تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے، گفتگو کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ۴۰ء میں مجھ سے فرمایا تھا کہ تم نے مسلمانوں میں کام نہیں کیا، اس لیے عام مسلمان آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ اب فرمایئے کہ آپ نے ہندوؤں میں ساری عمر کام نہیں کیا، اب عام ہندو تو کیا بقول آپ کے سردار پٹیل بھی آپ کے ساتھ نہیں اور آپ پر پاکستان کی حمایت کرنے کا الزام لگا رہے ہیں..... مہاتما جی آپ بے بس اور بے کس ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں موجودہ سیاست کو اس طرح سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ نے تو کانگریس سے شکست کھائی کہ وہ تقسیم پنجاب اور بنگال کو قبول کرنے پر راضی ہوئے اور کانگریس ہائی کمانڈ نے ماؤنٹ بیٹن سے شکست کھائی کہ وہ ملک کی تقسیم پر راضی ہو گیا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ چرچل نے مہاتما جی کو شکست دے دی۔ اس لیے میرا دل چاہتا ہے کہ..... میں لندن جا کر چرچل کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر یہ کہوں کہ 'تم جیتے اور ہم ہارے''۔

مولانا کی گفتگو کا آخری جملہ سن کر مہاتما جی آبدیدہ ہو گئے اور کہنے لگے..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنی جان دے کر انگریزی سیاست کو شکست دوں گا، قتل و غارت گری کا طوفان رکے گا اور ضرور رکے گا،..... مولانا صاحب میں کل سے برت شروع کروں گا..... مولانا صاحب اگر میں سچا ہوں تو ضرور کامیاب ہوں گا..... مولانا صاحب آپ نے جو کچھ فرمایا ہے حرف بہ حرف ٹھیک ہے، میں بھی یہی سمجھتا ہوں جو آپ سمجھتے ہیں''[1]

بالآخر دونوں رہنماؤں کی اس گفتگو کے بعد گاندھی جی نے برت رکھا، پورے ہندوستان میں نہیں تو کم از کم دہلی اور اس کے اطراف میں گاندھی جی کے اس اقدام سے عوام و خواص پر بہت زیادہ اثر ہوا۔

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۱۴

آخر کار گاندھی جی نے اپنے آپ کو ملک وعوام کے لیے قربان کر دیا۔

جواہر لال نہرو:

آزادیٔ ہند میں صف اول کے قائد اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نومبر ۱۸۸۹ء الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے عہدِ طفولیت میں ہندوستان انتشار اور غلامی کے بھیانک ماحول سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار تھا۔ اس ماحول میں ان کے والد (پنڈت موتی لال نہرو) نے ابتدائی تعلیم گھر پر شروع کروادی، ساتھ ہی اسکول میں بھی داخل کرادیا۔ ان کی تعلیم کا رنگ بالکل نوابین اور راجگان کے بچوں جیسا رہا۔

باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے بڑی آؤ بھگت ہوئی اور سب کے لیے سامان تفریح اور آنکھوں کا تارا بھی تھے۔ جب ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت مکمل ہوئی تو عمر کی پندرہ بہاریں گذر چکی تھیں، لہذا انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیج دیا گیا۔

دوران تعلیم یورپ کے اندر بہت سی اہم شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہاں رہ کر روسی انقلاب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اسی ولولہ وجذبہ کو لے کر ہندوستان آئے اور چاہتے تھے کہ اسی طرح کا نظام ہندوستان کے اندر بھی رائج ہو۔ حالاں کہ وہ عدم تشدد کے قائل تھے مگر رہبانیت کی حد تک نہیں۔

پنڈت نہرو کی زندگی جس ناز وانداز سے پروان چڑھی وہ جوانی کے دہلیز پر کانٹوں میں الجھ گئے، یہاں کے قائدین ورہنما کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کے لیے بارہا جیل گئے، مگر اپنے اصول ونظریات اور لائحۂ عمل میں فرق نہیں آنے دیا۔ وہ ایک فولادی انسان کی طرح پورے ملک کے نوجوانوں کو فولادی انسان بنانا چاہتے تھے، خود جیو اور دوسرے کو جینے دو کے قائل تھے۔

پنڈت نہرو نے ۱۹۲۹ء میں آزادی کا ''کامل نصب العین'' لائحہ عمل تیار کیا، ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کے اندر ورکنگ کمیٹی میں سوشلزم کی راہ دکھائی، آزادی سے پہلے ہندوستان کی آزادی کا نقشہ تیار کرنے کے لیے پلاننگ کمیٹی بنائی، ۱۹۵۰ء میں 'لیاقت نہرو پیکٹ' ان کی زندگی کا زرّیں کارنامہ ہے۔

بالآخر ہندوستان آزاد ہوا اور پنڈت نہرو ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ ان میں ہر مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور ان میں توازن قائم کرنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی۔ جواہر لال کا رخ مستقبل کی طرف ہے، لیکن ماضی کی بہترین قدروں اور کارناموں کو دامن میں سمیٹ کر ان سے قوت حاصل کرنا چاہیے۔ وہ ''خذ ما صفا دع ما کدر'' (اچھی چیزوں کو لو اور بری چیزوں کو چھوڑ دو) کے اصول کے قائل تھے۔

جواہر لال بین الاقوامی مسائل حل کرتے اور ملک وقوم کی خدمت کرتے ہوئے نحیف، کمزور، جھکا جھکا، تھکا اور بوڑھا ہو کر مئی ۱۹۶۴ء کو انتقال کیا اور وہ کتاب زندگی بند ہوگئی جس کی طرف لوگ رجوع کیا کرتے تھے۔ [۱]

رئیس الاحرار اور نہرو:

ہندوستان کے اِن دو عظیم رہنماؤں کے درمیان تعلقات ان کے آپسی خط وکتابت سے خوب واضح ہوتا ہے۔ (مکاتیب کے عنوان کے تحت اس کا تذکرہ موجود ہے)

پنڈت جی اور مولانا لدھیانوی کے درمیان دوستانہ روابط رہے ہیں۔ پنڈت جی مولانا کا ازحد احترام کرتے اور آزادی کے بعد جب کبھی ملکی وملّی مسائل پیش آتے تو بلا تکلف مولانا کو بلا کر اُن سے مشورہ لیتے، یہی وجہ ہے کہ مولانا لدھیانوی کی وفات پر تعزیتی پیغام میں پنڈت جی نے کہا کہ مولانا کی وفات سے ملک ہی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے، جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے سے قریب رہے۔

---

[۱] آندھی میں چراغ - خواجہ غلام السیدین - انڈین اکیڈمی نئی دہلی - ۱۹۶۲ء - ص! ۲۵۳

نیز۔ پنڈت نہرو۔ ضیاء عظیم آبادی۔ الماس بکڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۶۴ء

نیز۔ جواہر لال نہرو اپنی تحریروں کی روشنی میں، عبداللطیف اعظمی، ہریانہ اردو اکادمی، ۱۹۸۹ء

سید عطاء اللہ شاہ بخاری:

سید عطاء اللہ شاہ بخاری یکم ربیع الاول ۱۳۰۱ھ/۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ننھیال پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ شاہ صاحب کی عمر ابھی تین چار سال سے زیادہ نہ تھی کہ ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا ان کے پرورش اور ابتدائی تعلیم ننھیال میں ہوئی۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے نانا حکیم سید احمد اندرابی سے (جو طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے اور علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے) سے پڑھیں۔ شاہ صاحب سن بلوغت کو پہونچے تو پنجاب کا سفر اختیار کیا اس سفر میں انہیں کافی مشکلات و مصائب سے دو چار ہونا پڑا۔ امرتسر آئے اور اساتذہ وقت کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مولانا نور احمد امرتسری (م ۱۳۴۸ھ) سے تفسیر قرآن مولانا مفتی محمد حسن سے حدیث، اور مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی (م ۱۳۵۲ھ) سے فقہ کے اسباب پڑھے۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے عملی زندگی کا آغاز امرتسر کی ایک چھوٹی سی مسجد میں فرائض امامت کی انجام دہی سے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آواز اور زبان میں بے پناہ تاثیر رکھی تھی۔ بحیثیت واعظ ان کی شہرت امرتسر سے پھیل کر ملک گیر ہوگئی۔ اپنے دور کے عظیم مقرر تسلیم کیے گئے۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے تحریک خلافت کے زمانے میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور قید و بند زندگی کے معمولات میں شامل ہوگئی۔ پہلی بار اس تحریک میں ۱۴/ مارچ ۱۹۲۱ء/۴/ رجب ۱۳۳۹ھ گرفتار ہوئے اور تین سال قید بامشقت کی سزا کاٹی۔ اس کے بعد برّصغیر میں اٹھنے والے ہر جذبۂ آزادی کو اپنایا، آریہ سماجیوں کی دریدہ دہنی جب حد سے گذر گئی تو میدان عمل میں آئے اور ۶/ جولائی ۱۹۲۷ء/ ۶/ محرم ۱۳۴۶ھ کو ایک سال کے لیے جیل چلے گئے۔ ۱۹۳۰ء/ ۴۹-۱۳۴۸ھ میں کانگریس کی نمک ستیہ گرہ میں شمولیت کی پاداش میں چھ ماہ قید ہوئے۔ ۲۹/ دسمبر ۱۹۲۹ء/ ۸ شعبان ۱۳۴۹ھ کو مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی گئی تو مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے صدر چنے گئے۔ احرار اسلام کی تحریک کشمیر میں دو سال پسِ دیوارِ زنداں رہے۔ دوسرے عالمی جنگ کے آغاز سے چند دن پہلے مختلف سنگین الزامات کے تحت گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا تو پولیس رپورٹر کے انکشاف نے حکومت کی سازش عیاں کردی اور چھ ماہ قید رہ کر باعزت بری ہوگئے۔

آخری ایام حیات میں ملتان منتقل ہوگئے تھے وہیں ۹ر ربیع الاول ۱۳۸۱ھ/۲۱راگست ۱۹۶۱ء کو فوت ہوئے۔[۱]

شورش کاشمیری نے مولانا کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ رأس کماری سے لے کر سری نگر تک اور خیبر سے لے کر کلکتہ تک شعلے بکھیرتے پھرتے ہیں۔ انہوں نے ایک وقت میں دس دس گھنٹہ تک لوگوں کو اپنی طاقت لسانی سے مسحور کئے رکھا ہے۔ اور کئی بار چارپائی پر لیٹ کر تقریر کی ہے وہ کسی نامور مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں لیکن ان کے ہاتھ پر انور شاہ نور اللہ مرقدہ بیعت ہو چکے ہیں اور بڑی بڑی فضیلتوں نے انہیں خراج عطا کیا ہے''۔[۲]

رئیس الاحرار اور مولانا بخاری:

مولانا لدھیانوی اور مولانا بخاری کے درمیان مجلس احرار اسلام ہند کے قیام سے قبل روابط و تعلقات تھے۔ یہ روابط و تعلقات گھریلو، سیاسی اور دینی تھے۔ اور آپس میں بے تکلفی تھی۔ مجلس احرار ہند کے تاسیسی رکن ہونے کے بعد یہ تعلقات اور بھی استوار ہوگئے۔ پالیسیاں بنانے اور مجلس احرار اسلام کو روشناس کرانے میں جہاں مولانا لدھیانوی کا نام آتا ہے وہیں مولانا بخاری بھی ان سے کم نہیں۔ اس طرح تحریک آزادی سے لے کر قیام پاکستان تک دونوں رہنماؤں نے مل کر اصلاح وتجدید کاری کا کام کیا۔

وحیدِ عصر مولانا وحید الزماں کیرانوی:

اتر پردیش کا مردم خیز ضلع مظفر نگر جس کا ایک قصبہ کیرانہ جنگ آزادی سے لے کر آج تک تعلیمی اور سیاسی میدان میں دیگر علاقوں سے ممتاز رہا ہے۔

مولانا مسیح الزماں کیرانوی فاضل دیوبند تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیری وعلامہ شبیر احمد عثمانی کے گھر ایک ہونہار فرزند وحید الزماں، نانیہالی نام قمر الزماں کی پیدائش ۱۴ر فروری ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ دادا مولانا اسمٰعیلؒ، پردادا مولانا محمد حسینؒ، اس طرح آپ کا شجرہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جا ملتا ہے۔ والد کے

۱۔ تذکرہ علمائے پنجاب، اختر راہی، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۳۷۹-۳۸۳۔ ج:۱

۲۔ چہرے، شورش کاشمیری، مکتبہ ماحول کراچی، ۱۹۶۵ء، ص:۴۷

زیرِ نگرانی ابتدائی تعلیم وتربیت شروع ہوئی ۔ پہلے حفظ قرآن پھر ضروری دنیوی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم دی گئی ۔ اس طرح آپ نے کیرانہ ،حیدرآباد، آخر میں دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۵۲ء میں فضیلت حاصل کی ۔۱۹۶۳ء میں دارالعلوم میں بحیثیت استاذ ادب عربی تقرر ہوا، دارالعلوم سے ستائیس سال وابستہ رہنے کے ساتھ مختلف النوع عظیم الشان کارنامے انجام دیے، جن میں عربی زبان وادب کی ترویج وترقی، اجلاسِ صدسالہ کے دور میں مختلف کمیٹیوں کی سربراہی ،مختلف عمارتوں کی ترمیم وتزئین اور تعمیر جدید اور تحریک اصلاح وانقلاب کی کامیاب قیادت شامل ہے ۔عربی انگریزی تعلیم کے لیے دارالفکر کا قیام اور ۱۹۸۸ء میں دارالمؤلفین کے نام سے ایک علمی ادارہ کی بنا ڈالی ،جس سے بہت سی کتابیں شائع ہوئیں ۔

صحافتی خدمات:

اردو ماہنامہ القاسم ،سہ ماہی عربی مجلّہ دعوۃ الحق ،پندرہ روزہ عربی الدّاعی اور پندرہ روزہ عربی الکفاح کا اجراوادارت ۔

تصنیف وتالیف:

اردوعربی کی تقریباً دو درجن کتابیں شامل ہیں ۔ ان میں عربی کی القراۃ الواضحۃ تین حصے ، القاموس الجدید اردوعربی ،القاموس الاصطلاحی عربی اردو (ڈکشنری) آپ کی زندگی میں عالمی طور پر حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ،اور حال ہی میں القاموس الوحید (اٹھارہ سوصفحات پر مشتمل ڈکشنری) منظر عام پر آچکی ہے ۔

عہدے اور مناصب:

رکن عاملہ جمعیۃ علماء ہند صدر مرکزی جمعیۃ علماء ہند، رکن عاملہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نئی دہلی ،معتمد دارالمؤلفین دیوبند ،ڈائریکٹر مرکز دعوت اسلام ،کوٹ ممبر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہ ۔

اسفار:

مسلم ممالک کے اکثر علاقوں میں آپ کا سفر ہوتا رہا اُن میں متحدہ عرب امارات، کویت، قطر، سعودی عرب اسی کے ساتھ انگلینڈ ،فرانس، ماریشش وغیرہ ۔

مولانا وحیدالزماں کیرانوی کی متعدد صلاحیتوں نے خصوصیت کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔مختلف میدانوں میں ان کے کارنامے ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ان میں مردم سازی نہایت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔اتنی ہی اہم خصوصیت ان کی جہد مسلسل بھی ہے۔ہم میں بہت سے حضرات ایسے ہیں جو مولانا کوایک شفیق معلم،ایک مشفق دوست،ایک بیباک منتظم،ایک حساس انسان،ایک شعلہ بیاں مقرر،ایک متبحر ادیب،ایک محقق عالم،ایک متحرک قائد اور بے خوف مجاہد وغیرہ جیسی خصوصیات سے جانتے سمجھتے دیکھتے رہے ہیں۔بیشک یہ تمام خصوصیات ان میں اعلیٰ درجہ کی تھیں۔

علم وادب کا یہ ہمالہ (زبان وادب کے معاملے میں پوری دنیا معترف رہی) برسوں بیمار رہنے کے بعد ۱۵/اپریل ۱۹۹۵ء کو مالک حقیقی سے جاملا۔دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور مزار قاسمی میں سپرد خاک کیا گیا۔[۱]

رئیس الاحرار اور مولانا کیرانوی:

مولانا کیرانوی نے جن حالات میں تعلیم وتربیت پائی وہ غلام ہندوستان میں آزادی کے لیے اٹھنے والے طوفانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ان دنوں ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں نے چھوٹے بڑے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔دارالعلوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دہلی میں اپنے والد مولانا مسیح الزماں کیرانوی کے زمانہ طالب علمی کے بے تکلف دوست اور اس وقت کے عظیم سیاسی اور علمی شخصیت مولانا لدھیانوی کی معیت اختیار کی۔مولانا کیرانوی پرسنل سکریٹری کی حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک رئیس الاحرار کے ساتھ رہے،اس دوران ۱۹۵۵ء میں سفر حج میں بھی رئیس الاحرار کے ساتھ رہے اور مولانا کے حکم پر پنجاب میں مسلمانوں کے مسائل اور مسجد کی واگذاری کے لیے لدھیانہ اور اس کے گردونواح کا دورہ بھی کیا۔چند ہی برسوں میں مولانا کی صحبت میں رہ کر اپنی علمی ذہانت وفطانت کی بدولت سیاست کی باریکیوں کو سمجھ لیا تھا۔اسی زمانہ میں محمد احمد کاظمی کی کتاب ''تقسیم ہند اور مسلمان'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔مختلف مواقع پر مولانا لدھیانوی کے عربی ترجمان کی حیثیت سے عرب سفراء اور مختلف سیاست دانوں سے گفتگو کا موقع

---

[۱] ترجمان دارالعلوم مولانا کیرانوی نمبر ص:۵۱۸

حاصل ہوا۔[1]

مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں مولانا کیرانوی اور مولانا لدھیانوی کے دونوں صاحبزادے مولانا سعید الرحمٰن اور مولانا محمد احمد بھی ایک ہی دور میں زیر تعلیم رہے ہیں۔ پھر ان تعلقات میں اور بھی استحکام پیدا ہوگیا تھا۔ یہ روابط وتعلقات آخر تک باقی رہے، حتی کے لدھیانوی اور کیرانوی کے درمیان تحفہ وتحائف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔[2]

---

[1] ترجمان دارالعلوم مولانا کیرانوی نمبر ص: ۵۱۸

[2] ماہنامہ ترجمان دارالعلوم، جنوری ۲۰۰۱ء۔ ص: ۳۹

مولانا معاصر علماء اور سیاسی رہنماؤں کی نظر میں

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مولانا کی وفات کی خبر سنی تو دیر تک خاموشی میں ڈوبے رہے اور آہ بھر کر فرمایا:

''ایک اچھے رفیق، مونس، غم خوار، سراپا ایثار ساتھی کی جدائی نے میرے سینے میں ایک گہرا زخم کر دیا، مولانا کی وفات ملک وملت کے لیے اس صدی کا سب سے عظیم سانحہ ہے''[1]

رسالہ الحرم میں مولانا زین العابدین نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

''مولانا حبیب الرحمٰن اپنے اوصاف وکمال میں ایک گلدستہ صد گل اور ایک گل صد رنگ تھے، سیاست دانوں کے مجمع میں وہ سیاسی تھے، ادباء کے محفل میں ادیب، صوفیاء کی صحبت میں صوفی، ہر شخص سے اس کے موضوعات پر بات کرتے، بے حد ذہین تھے، مخاطب کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے صفحۂ دل کی تحریر پڑھ لیتے، گفتگو ٹکی ہوئی اور مدلل کرتے تھے، مختصر لفظوں میں اپنا مضمون سننے والے کے دل میں پیوست کر دیتے تھے''[2]

حضرت مولانا سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب فرماتے ہیں کہ:

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بہت پرانے کارکن تھے، کانگریس، جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام سے ان کا ہمیشہ تعلق رہا، آزادی کی تحریکات میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے، کئی مرتبہ ان کے ہمراہ مجھ کو جیل میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ میرے جیل کے رفیق تھے اور وہ جیل کے قیدیوں کی بڑی خدمت انجام دیتے تھے، جیل اور بیرونِ جیل ان کی انتھک خدمات کو ہر شخص سراہتا تھا، وہ نہایت نیک عمل، باہمت اور صاف گو عالم تھے''[3]

---

[1] روزنامہ نوائے پاکستان ۶/ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] ماہنامہ الحرم، اکتوبر ۱۹۵۶ء

[3] روزنامہ الجمعیۃ دہلی، منگل ۴/ستمبر ۱۹۵۶ء

خطیب پاکستان مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی نظر میں:

''مولانا مرحوم کی زندگی برطانوی سامراج کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔آپ ان احرار وطن کے قافلہ سالار تھے جنہوں نے آزادی وطن اور تحفظ ملت کے لیے آگ اور خون کے طوفان سے لے کر قید و بند کے پہاڑوں سے ٹکر لی اور بالآخر برطانوی سامراج کی زنجیریں ان کے آتشیں عزائم سے پگھل کر خود بخود ٹوٹ گئیں''۔[1]

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم ان الفاظ میں رئیس الاحرا کے اوصاف کا اظہار کرتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ملک کے علمی گھرانے کے ایک لائق کارکن تھے،ان کا خاندان ملک بھر کے لیے ہادی اور مربی دین رہا اور اس کے ساتھ ساتھ حریت اور آزادی کا پوری قوت اور ہمت سے علم بردار رہا،مولانا ممدوح اپنی خاندانی روایات کے مطابق ایک ذکی عالم،مفکر اور راہنما تھے،معاملات میں گہرائی کے ساتھ سوچتے تھے،ملک کی آزادی میں ان کا زبردست حصہ تھا،ہر بنیادی مسئلہ میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے تھی،اس کے ساتھ ساتھ اسلامیات اور دینی معاملات میں نہایت پختہ تھے،دیانت و سیاست میں ان کے ہاں حدود تھے،ان حدود کے سختی سے پابند تھے،بااصول اور وضع دار شخصیت رکھتے تھے،ان کے ہر قول و عمل سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے قلب میں دین کا رسوخ کافی ہو چکا ہے،ان کی ہر بات خواہ وہ سیاسی رنگ ہی کی ہو،دین کے جذبے سے خالی نہ ہوتی تھی''۔[2]

حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے رئیس الاحرار کی عظیم شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح سے فرمایا:

''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن آسمان شہرت کے ماہتاب و آفتاب تھے اور احقر مولانا کو اس طرح دیکھا کرتا تھا،جس طرح زمین کے بسنے والے چاند ستاروں کو دیکھا کرتے ہیں۔

---

[1] روزنامہ نوائے پاکستان لاہور،۶ ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] مضامین رئیس الاحرار،مولانا محمد احمد رحمانی ص:۳۲

ذہانت مولانا کا مخصوص وصف تھا جس نے آپ کو پوری جماعت میں سب سے ممتاز کردیا تھا، ذہانت کے ساتھ فراست اور سیاسی بصیرت بھی ممتاز خصوصیت کی حامل تھی اور کوئی بھی سمجھ دار شخص پہلی ہی مجلس میں مولانا کی ان خصوصیتوں سے متاثر ہوجاتا تھا۔

جس وصف نے مولانا کی ذہانت وبصیرت کو جوہری شان بخش دی تھی، وہ جرأت، دلیری اور بہادری تھی جو حاتم کی سخاوت کی طرح مولانا کے نام نامی کے ساتھ لازوال خصوصیت بن گئی ہے، جس نے مولانا کی زندگی کو ہمیشہ مسائب کے شکنجے میں گرفتار کیا'' [۱]

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے ان الفاظ کے ساتھ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کا ذکر کیا ہے:

''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اپنے سیاسی شعور، جوش عمل، اولوالعزمی اور جدوجہد کے امتیاز سے ہمیشہ نمایاں رہے۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور اس راہ میں بارہا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں'' [۲]

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رئیس الاحرار کے متعلق فرماتے ہیں:

''ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ سالہا سال قید وبند کی صعوبتیں انتہائی ثابت قدمی سے برداشت کیں اور مصائب وآلام کا مقابلہ اس شان سے کیا کہ ان کی جبین صبر واستقامت پر کبھی ادنی سی شکن بھی ظاہر نہیں ہوئی۔ ان کی مہمان نوازی اور وضع داری ضرب المثل تھی، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی سیاسی طریقہ کار میں ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے تھے وہ بھی ان کو عزت واحترام سے دیکھتے تھے'' [۳]

مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی رئیس الاحرار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

---

[۱] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن، ص: ۵۹

[۲] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۵۵

[۳] روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۴ر ستمبر ۱۹۵۶ء

''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی عزم صمیم کا ایک پہاڑ تھا جو ڈھے گیا، جرأت وہمت کا آتش فشاں تھا، جو ٹھنڈا پڑ گیا، حق وصداقت کا ایک صور تھا جو ہمیشہ کے لیے چپ کر دیا گیا۔ حبیب الرحمٰن کا جسم تو بے شک لاغر تھا، مگر لاغر وناتوں جسم میں وہ روح تھی جو باطل قوتوں کے مقابلے میں پہاڑ سے بڑھ کر اٹل اور باڑھ دار تلواروں سے زیادہ کاٹنے والی۔ عجیب اسلامی جوش تھا، حیرت انگیز اسلامی جذبہ تھا، راہ حق میں زبان سے شعلے برستے تھے اور خطابت اس پر نثار ہوتی تھی'' [۱]

تاریخ اسلام کے مصنف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خصوصیات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا ملک وملت کے پرانے خدمت گذار، مجلس احرار کے شہسوار لیڈر اور جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدین میں تھے، اس راہ میں قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، کانگریس سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا، جو ہر زمانہ میں برابر قائم رہا، ہندوستان کی تقسیم اور اپنے وطن لدھیانہ کی تباہی کے بعد دہلی متوطن ہو گئے تھے، ان کی عمر کا بڑا حصہ قوم وملک کی خدمت میں گذرا، طبعاً بڑے خاکسار، متواضع، فیاض اور مہمان نواز تھے، دارالمصنفین کے لوگوں سے بڑا اخلاص رکھتے تھے، جب مشرقی اضلاع کی جانب آنا ہوتا تھا تو دارالمصنفین ضرور آتے'' [۲]

شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق ڈین اور ماہنامہ برہان کے ایڈیٹر مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے مولانا مرحوم کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا حبیب الرحمٰن موروثی اور خاندانی طور پر ایک مجاہد، بطل حریت اور زعیم قوم تھے، اس لیے تعلیم سے فراغت کے بعد ہی عمل سیاست کی وادیٔ پرخار میں کود پڑے، اس تقریب سے ان کا تعلق کانگریس سے بھی رہا اور جمعیۃ علماء ہند سے بھی، اس کے علاوہ مجلس احرار کے تو وہ نفس ناطقہ یا عقل فعال ہی تھے، خوش تقریری، خطابت، جرات وبے باکی، ذہانت اور طباعی،

---

[۱] مضامین رئیس الاحرار، محمد احمد رحمانی، ص:۲۶

[۲] ماہنامہ معارف/شاہ معین الدین احمد ندوی/ستمبر ۱۹۵۶ء نمبر۳، ج۷۸/ص:۱۶۴

ایثار وفداکاری یہ ان کی وہ خصوصیت تھیں جن کے باعث وہ جہاں کہیں رہے اور جس محفل میں بیٹھے ممتاز اور نمایاں ہو کر رہے۔ حد درجہ خلیق ومتواضع، بڑے سادہ اور بے تکلف، مگر اپنی بات کے پکے اور وعدہ کے پورے، عجیب اوصاف وکمالات کے بزرگ تھے'' [۱]

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ رئیس الاحرار کی شخصیت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مولانا کے سیاسی خیالات ونظریات سے پورا اتفاق نہ ممکن تھا نہ ضروری، ان کے خیالات و رجحانات سے بھی جو ان کے ذاتی تجربوں اور خاص طرح کی تربیت وماحول سے پیدا ہوئے تھے، ہم آہنگی بھی کسی معاصر کے لیے خواہ وہ خرد و نیاز مند ہو ضروری نہیں، لیکن جس چیز میں زیادہ قیل وقال کی گنجائش نہیں وہ ان کا جذبۂ حریت، انگریز دشمنی، وطن دوستی، اخلاقی بلندی، شخصیت کی دلآویزی اور ایک خاص طرح کا قائدانہ بانکپن جو خود اعتمادی، پاکیزہ زندگی اور خلوص کا نتیجہ ہوا کرتا ہے'' [۲]

جمہوریہ ہند کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے متعلق اپنے دیرینہ تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''مولانا حبیب الرحمٰن کی وفات سے ملک ہی کا نقصان نہیں ہوا، بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے، جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے، مولانا موصوف جس عقیدت پر یقین رکھتے تھے اور جس جرأت اور آہنی استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہے، اس کے سبب میں ان کا ہمیشہ مداح رہا اور احترام کرتا رہا، شمالی ہند میں جو المیہ رونما ہوا اور جس کی لپیٹ میں شدید طور پر آئے، مگر اس سے ان میں تلخی نہیں آئی اور انہوں نے ہمت نہ ہاری، وہ ہندو مسلمان، سکھ سب ہی کے محترم رہے، وہ ایک جواں مرد کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کیے جاتے رہیں گے'' [۳]

---

[۱] ماہنامہ برہان دہلی رسعید احمد اکبر آبادی رستمبر ۱۹۵۶ء رص:۲

[۲] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۲۱۹

[۳] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۵۸

مجلس احرار اسلام کے اہم رکن اور پاکستان کے مشہور صحافی وادیب شورش کاشمیریؒ نے مولانا کی چند خصوصیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا میں ذاتی محاسن بے شمار تھے، وہ جماعت کے لیے اپنی ذات اور اس کے ہر بلندی کی تیاگ کے قائل تھے، ان کی زندگی میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اپنی جماعت کے لیے بڑے سے بڑے ایثار کو گوارا کرلیا۔ دوستوں کے دوست ہی نہیں، بلکہ ان پر جی جان سے نچھاور بھی ہوتے، آپ میں تنظیمی صلاحیت بے پناہ تھی۔ سالہا سال مجلس احرار کے صدر رہے اور نہایت طنطنے سے کام کیا اور جب صدر تھے تو بول چال کے تیور بھی صدارتی تھے، صدر نہیں رہے تو صدر کے نقش قدم پر چلتے، آپ کی فطری خوبی تھی کہ آپ تابع رکھ بھی سکتے تھے اور رہ بھی سکتے تھے'' [۱]

پنجاب کے مشہور صحافی اور مصنف غلام رسول مہر مولانا کے ذاتی محاسن کو تحریر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''میرے سامنے ان کی زندگی میں ابتلاء کے بیسیوں مرحلے آئے کسی میں بھی ہراساں یا خوف زدہ یا پریشان نہ دیکھا، وہ میدان عمل کے شہسوار، خدا نے انہیں نازک سے نازک ماحول میں سچی بات سلیقے سے کہنے کی خاص صلاحیت عطا کی تھی، جو کچھ ان کی زبان پر جاری ہوتا تھا، خلوص اور صداقت کے باعث اس میں زندگی کی ایک روح خاص جلوہ گر رہتی تھی، ان کے سامنے ہمیشہ یقین کی روشنی رہی اور وہی روشنی ان کے تمام افکار واعمال کے لیے مشعل راہ تھی'' [۲]

اخبار ''پیامِ وطن'' کے ایڈیٹر ملک کے مایہ ناز صحافی محترم مولانا عبدالباقی صاحبؒ نے ایک اداریہ مولانا کے حالات پر سپرد قلم کیا، جس کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

''اپنی زندگی کے آخری دور میں مولانا کبھی خاموشی سے کبھی اعلانیہ نئے ہندوستان کی جو خدمت کی وہ انہی کا حصہ تھی، کوچہ رحمان میں ان کا گھر ایک یونیورسٹی تھا، ایک مکتب خیال

---

[۱] روزنامہ نوائے پاکستان، ۶، ستمبر ۱۹۵۶ء

[۲] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۲۰۱

تھا، جہاں ہندو، مسلمان، سکھ، شرنارتھی، کمیونسٹ، سوشلسٹ، کانگریسی، ملحد، مومن سب ہی آتے تھے اور مولانا کے منجھے دھلے افکار سے استفادہ کرتے تھے.....لیکن تبلیغ دین کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا اور نرالا تھا، تبلیغ دین سے زندگی کی آخری ساعت تک انہیں غیر معمولی دلچسپی رہی، دینی تاریخ اور مذہبی مسائل پر انہیں پورا عبور تھا'' [۱]

مہاشہ کرشن ایڈیٹر اخبار پرتاپ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ جتنے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے اتنے ہی سچے نیشنلسٹ، ہر سوال کو قوم پرستی کے زاویے سے دیکھتے تھے، نہایت مؤثر پیکر تھے، ان کی تقریر سن کر لوگ جھوم اٹھتے تھے، آزمائش کے کئی مواقع آئے، لیکن ان کے پایہ ثبات میں لغزش نہ آئی، نہایت خوددار تھے، ان پر کڑے وقت آئے لیکن توکل برخدا، انہوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارا'' [۲]

ملک کے مشہور اخبار نویس شری رنبیر نے اپنے تاثرات کا ''ملاپ'' اخبار میں اس طرح اظہار کیا ہے:

''جہانِ فانی سے سب کو جانا ہے، لیکن جب ملک کا خدمت گار جاتا ہے تو لاکھوں آنکھیں پرنم ہوجاتی ہیں، ہزاروں دل چلا اٹھتے ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے ہی سجن تھے، انہوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے وقت اپنے سامنے رکھا تھا وطن آزاد ہونا چاہیے۔ مذہبی فرقہ پرستی کا انت ہونا چاہیے، ہندوستانیوں کو ایک متحد قوم بن کر آگے بڑھنا چاہیے، اس کے لیے وہ جیون (زندگی) بھر لڑتے رہے، جدوجہد کرتے رہے، اسلامی شرع اور مذہب کے بڑے ودوان تھے، اگر وہ چاہتے تو انگریز کا ساتھ دے کر بڑی بڑی جاگیریں حاصل کرسکتے تھے، لیکن ایسا کرنے کے بجائے انہوں نے حریت پسند طاقتوں کا ساتھ دیا، بار بار کی نظر بندیوں اور قید کو لبیک کہا، ان کے اٹھ جانے سے ملک کو نقصان ہوا، پنجاب کو نقصان ہوا، مجھے ذاتی بھی نقصان ہوا، وہ ہیں نہیں، اس خیال سے دکھ ہوتا ہے'' [۳]

---

[۱] پیام وطن، مولانا عبدالباقی، ۶ ستمبر ۱۹۵۶ء ایڈیٹوریل صفحہ

[۲] روزنامہ پرتاپ نئی دہلی۔ ۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

[۳] روزنامہ ملاپ، بدھ وار ۵ ستمبر ۱۹۵۶ء

مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد علی جالندھری نے فرمایا تھا کہ:

''مولانا حبیب الرحمٰن خلوص، ایثار اور شجاعت کا پیکر تھے'' [1]

مجلس احرار اسلام پاکستان کے سابق صدر ماسٹر تاج الدین انصاری نے فرمایا کہ:

''اپنی زندگی میں آپ سا شریف، نڈر اور جری انسان میرے مشاہدے میں کم ہی آیا ہے۔ ایسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں'' [2]

☆ ☆ ☆

---

[1] روزنامہ نوائے پاکستان، لاہور، ۶ ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] روزنامہ نوائے پاکستان لاہور، ۶ ستمبر ۱۹۵۶ء

باب چهارم

سیاسی خدمات

ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی خدمات اس قدر ہیں کہ دوسرے برادران وطن کی خدمات سے ان کا موازنہ کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ یوں تو مسلمان جہاں آباد ہوگئے، وہیں ان کا وطن ہے اور وہ مادر وطن ہی کی طرح سے اس کی حفاظت کرتے آئے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے ساتھ جو روحانی رشتہ مسلمانوں کا ہے وہ کسی بھی برادران وطن کا نہیں ہے۔ ہندوستان کی دیگر نسلیں (آرین وغیرہ) اگرچہ وہ کتنی ہی قدیم کیوں نہ ہوں، لیکن جو قدامت ہندوستان میں اسلام اور فرزندان اسلام کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الاسلام تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں سے صرف مسلمان ایسی اقوام قدیمہ میں سے ہیں، جن کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی انہوں نے سکونت اختیار کی اور یہاں ہی سے ان کی نسل دنیا میں پھیلی۔ اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ''سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان'' میں متعدد روایات اس کے متعلق مذکور ہیں۔ بائبل میں اس کے حصۂ عہدِ قدیم میں بھی ذکر کیا گیا ہے''۔ [۱]

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اور خصوصاً علماء دیوبند کو ہندوستان سے خاص تعلق اور محبت ہے۔ حضرت سید احمد شہید نے انگریزوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، وطن عزیز کو آزاد کرنے اور یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی انتھک کوششیں کیں اور بالآخر معرکۂ بالاکوٹ میں اپنی جان عزیز کو قربان کر دیا۔

علماء دیوبند کی سیاسی اور ملکی خدمات اسی تحریک سے شروع ہوتی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء سے پیشتر جتنی تحریکیں ہو چکی تھی، مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء، تحریک ریشمی رومال اور خلافت وغیرہ سب اسی تسلسل سے شروع

---

[۱] تذکرہ مشائخ دیوبند، مفتی عزیز الرحمٰن، دار التالیف بجنور، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۴

ہوئیں کہ ایک تحریک میں ناکامی کے بعد بالکل اسی وقت دوسری تحریک کی داغ بیل ڈال دی گئی اور گذشتہ تحریک کو مدّ نظر رکھ کر جدید تحریک کو چلایا گیا۔ ریشمی رومال تحریک تو اتنی تعجب خیز تھی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ چٹائیوں پر بیٹھنے والے علما اور خانقاہوں میں گوشہ نشیں رہنے والے درویش کتنے عمدہ اسلوب کے ساتھ تحریک چلاتے ہیں کہ انگریز کی سی۔آئی۔ڈی کو بارہا منھ کی کھانی پڑی ہے۔

آزادی سے پہلے مسلمانوں کی سیاسی حالت:

ہندوستان میں اٹھارویں صدی کی ابتدا سے مسلمانوں کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے مسلمانوں کی سیاست کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ایک طرف مسلمانوں کے اندر جماعتی بدنظمی اور دینی انحراف پھیل رہا تھا تو دوسری طرف آریوں اور عیسائیوں نے اسلام پر طرح طرح کے اعتراضات شروع کردیے تھے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے فقہ وحدیث کے درس وتدریس سے اور مولانا قاسم نانوتویؒ نے اپنی تقریروں اور حکمت آفریں کتابوں سے ان کا تدارک کیا، اس کے بعد جب ترکی اور اسلامی عظمت کا آخری نشان مٹانے کی کوشش کی گئی تو دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔

مولانا رشید احمد اور مولانا قاسم نانوتوی یہ وہ حضرات تھے جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرپرستی میں کارہائے عظیم انجام دے چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں علم آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ میں انگریزی اقتدار کا مقابلہ کیا تھا، ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی آگ سلگتی رہتی، یہی وجہ ہے کہ شیخ الہند میں انگریزی اقتدار کے فنا کردینے کا جذبہ مستقل طور پر جاگزیں ہوگیا تھا۔

۱۹۱۲ء میں دنیاء اسلام پر ایک نئی مصیبت آئی جب کہ برطانیہ اور ہم نوا حکومتوں نے بلقان کی ریاستوں کو ترکوں کے مقابلے پر لا کھڑا کردیا۔ ۱۹۱۳ء میں کان پور میں ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے مسجد کو شہید کرادیا گیا۔ کلکتہ میں حضورﷺ کی شان میں گستاخی کی گئی۔ علاوہ ازیں مندرجہ وجوہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے مسلمانان خاص طور پر علماء دیوبند کو آزادی کی صف اول میں لا کھڑا کردیا:

۱۔ انگریز ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس نے جس قدر نقصان مسلمانوں کی دولت،

تجارت اور صنعت و حرفت کو پہونچایا کسی قوم نے نہیں پہونچایا۔ وہ ہندوستانیوں کو ہمیشہ غلامی کی لعنت میں گرفتار کر کے اسے ابھرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔ انگریز کا نعرہ خدمت انسانی صرف اپنی نسل، اپنی رنگت اور اپنی سرزمین یورپ تک محدود تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کو وہ صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ہر ظلم، ہر بے حیائی، ہر بدعملی کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری سمجھتا تھا اور ہندوستان جو مذہبی اور روحانی ملک تھا اسے بالکل ناستک اور بے دین بنا کر رکھ دینا چاہتا تھا۔[1]

۲۔ انگریز نے اس ملک کو مسلمانوں سے چھینا، ورنہ پہلے وہ خود حاکم تھے۔ ہندوستان مسلمانوں کا آبائی وطن تھا۔ اس ملک کی آزادی سے پردیسی اسلامی ممالک مثلاً افغانستان، ایران وغیرہ بہت سے مصائب اور خطرات سے محفوظ ہو جائیں گے۔ مقامات مقدسہ اور دیار عرب مصر و شام، فلسطین سوڈان، اور شمالی ہند وغیرہ جن میں اسلامی آبادی ہے اور ہندوستان کی غلامی کی وجہ سے یہ سب غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں آزاد ہو سکیں گے۔[2]

بیسویں صدی کا بیسواں سال (۱۹۱۹) ہمیشہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ''صبح صادق'' تسلیم کیا جائے گا۔ کیوں کہ اسی ۱۹۱۹ء کے مارچ میں ستیہ گری کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی سال جمعیۃ علماء ہند کے نظام جدید کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال جلیان والا باغ کا وہ مشہور حادثہ پیش آیا جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کی مردہ تحریک میں مظلوم معصوم خون کے انجکشن سے جان ڈالی اور ایک کامیاب تحریک کی آبیاری کی۔[3]

تاریخ کے ہر دور میں بعض شخصیتیں اس طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں، جن پر ساری قومی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام میں امام ابوحنیفہؒ، امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہؒ اور ابن خلدون نے ایک ایسا مقام پیدا کیا، جس کی دنیا آج تک معترف ہے اور حقائق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تاریخ اسلام میں اگر یہ شخصیتیں نہ ابھرتیں تو اسلامی دنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ چودھویں صدی کے اخیر تک اسلامی زندگی کے خدوخال اور اسلامی کردار کی تاریخ اب نقش و کالحجر کی طرح ان مٹ ہے۔

---

[1] نقش حیات، ج ۲، ص: ۱۲۹

[2] علماء حق، مولانا محمد میاں، ج ۲، ص: ۱۷۲

[3] مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلیمان شاہ جہاں پوری، ص: ۱۳۰

وہ ان بزرگوں کی فکری اور اعلیٰ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ ''اسلام کے دینی اور سیاسی مزاج اور ضابطہ اخلاق کا مرتب شدہ نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ علماء سلف کی کوششوں کا نتیجہ ہے''۔ ہر صدی میں اسلام کے مجدد دین پیدا ہوئے۔ یہ بزرگ حق اور کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے ہر طرح کی آزمائشوں سے ہو کر گذرے، امام ابوحنیفہ سے لے کر شاہ ولی اللہ تک تین ہزار علماء اور محدثین نے اعلاء کلمۃ الحق پر اپنی جانیں قربان کیں، لیکن زندگی کے اعتقادات اور کردار میں ایک حرف بھی کم نہ کیا۔

ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جماعت نے جس استقامت، تدبیر اور تفکر سے کام لیا وہ اپنی جگہ دنیا کے لیے قابل تقلید مثال ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کا خاندان مجاہدین کے سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہے، جس کڑی کو شمار کیے بغیر ہندوستان کی اسلامی اور ملکی جدوجہد مکمل نہیں ہوتی۔ رئیس الاحرار کے افکار انقلابی افکار تھے۔ بغاوت کا جو انداز رئیس الاحرار نے پھیلایا وہ اپنی جگہ منفرد کردار ہے۔ ہندوستان میں اہل حق کی جماعت میں بہت سی شخصیتیں ابھریں ان کا رنگ اور جدوجہد مقامی تھا۔ ہندوؤں میں برادران وطن کی جماعت میں بہت سے افراد سامنے آئے اور ان لوگوں نے آزادی کی جدوجہد میں ایک معیار قائم کیا۔ میری مراد پنڈت جواہر لال نہرو، سوبھاش چندر بوس اور گاندھی جی سے ہے۔

گاندھی جی نے بھی اپنی رہنمائی کا فرض ادا کیا۔ مولانا آزاد علمی دنیا میں ایک انفرادی حیثیت رکھتے تھے، قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت بھی اپنی مثال آپ تھی، لیکن افکار و کردار کی جو جھلک رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن میں پائی گئی وہ ہندوستان کے کسی بھی شخصیت میں نمودار نہ ہوئی۔ سیاسی زندگی میں مولانا نے گاندھی جی سے بارہا گفتگو کی اور ہر مرتبہ گاندھی جی کو مولانا کے خیالات اور ان کی حکمت عملی اور تدبر سے اتفاق کرنا پڑا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی پہلی نمائندہ کانفرنس میں ایک ہزار ڈیلی گیٹوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ ''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے جس طرح ملک کی سیاست کا تجزیہ کیا اور رہنمائی کی ہے اس کے بعد کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ میں کوئی بات آپ لوگوں سے کہوں۔

میری خواہش ہے کہ تمام ڈیلی گیٹ حضرات مولانا حبیب الرحمٰن کی رہنمائی پر غور کریں اور جو تجویز انہوں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں، ان کی تائید کی جائے''۔ مولانا آزاد جیسے انانیت پسند انسان کا یہ اعتراف تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں، جس شخص نے کبھی گاندھی جی کے افکار کو قبول نہ کیا ہو اور جو اپنے افکار کی تجلّی میں کوہ طور کا درجہ رکھتا ہو، اس کا کسی مجلس میں اس طرح اعتراف اور اقرار مولانا حبیب الرحمٰن کے فکری رہنمائی کو ایک ایسا درجہ عطا کرتا ہے جو ہندوستان میں کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا۔

پنڈت جواہر لال نہرو مولانا کے عقیدمندوں میں تھے۔ دہلی کے مشہور رام لیلا گراؤنڈ پر مولانا کے انتقال کے بعد تعزیتی پروگرام میں جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ:

''ہندوستان کی بین الاقوامی سیاست جب الجھ جاتی تھی اور ہم سب مل کر اس کو سلجھانے کی کوشش کرتے، مگر جب ہم ناکام رہتے، تو مولانا حبیب الرحمٰن کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا نے اس کو پہلے سے ہی سلجھا رکھا ہے۔ اب ہم کس کے پاس جائیں گے''۔[1]

پنڈت جواہر لال نہرو کے اس اقرار سے مولانا لدھیانوی کی شخصیت مزید ابھر کر سامنے آتی ہے جو مولانا کی سیاسی بلندی کا پتہ دیتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انسان کو بہت سی چیزیں تجربہ و تعلیم سے ملتی ہیں۔ لیکن بعض خصائص طبعی طور پر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاندان سے ورثہ میں ملتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لطف عمومی سے طبیعت کا حسن بن کر فطرت ہو جاتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن کے پردادا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ پنجاب میں تنہا بزرگ تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لدھیانہ میں فتویٰ دیا اور چند روز کے لیے شہر میں متوازی گورنمنٹ قائم کی۔

آپ کے دادا حضرت مولانا محمد علیہ الرحمۃ نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس علم کو بلند رکھا اور جب کانگریس نے اپنا ابتدائی ڈھانچہ تیار کیا تو ہندوستان کے علماء سے بھی ان کے حق میں فتویٰ لیا اور خود بھی اپنی بصیرت کے روشنی میں فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے کانگریس کی شرکت جائز ہے۔ وہ سمجھتے تھے

---

[1] مولانا عبداللہ لدھیانوی جو مولانا حبیب الرحمٰن کے خادم تھے ابھی دہلی میں باحیات ہیں ان سے ملاقات ہوئی مذکورہ واقعہ ان ہی سے معلوم ہوا۔

کہ ہندوستان میں جو حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کے پیش نظر ہندو مسلم کے اشتراک ہی سے برطانوی نظم و نسق میں خلل ڈالا جاسکتا ہے۔

انگریز دشمنی کا یہ جذبہ مولانا حبیب الرحمٰن کو ورثہ میں ملا تھا اور یوں کہنا چاہیے کہ ان کی زندگی کے عناصر اربعہ کا ایک جزو تھا، حتیٰ کہ ان کے خون کی گردش ہی اس سے قائم تھی اور طبیعت کا حسن بن کر فطرت کی نیو بن گیا تھا۔

کرپس جب پہلی دفعہ ہندوستان آیا تو مولانا سے ملاقات ہوئی اور ہندوستان کی سیاست پر تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی۔ لیکن جب رخصت ہونے لگا تو اسی نے کہا: آپ مجھے ایک مرتبہ پھر ملیے گا..... .....اور پھر بعض صحافی حضرات کو ملاقات میں بتایا کہ: مجھے مولانا کی گفتگو نے نہایت متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک میں جن ذہین ہندوستانی سیاست دانوں سے ملا ہوں ان میں مولانا ایک سربرآوردہ سیاست داں ہیں۔

مجلس احرار جب قائم ہوئی تو سالہا سال آل انڈیا مجلس احرار کے صدر رہے اور نہایت طنطنہ سے کام کیا، جب صدر تھے تو بول چال کے تیور بھی صدارتی تھے اور جب صدر نہیں رہے تو صدر کے نقش قدم پر چلتے رہے، یعنی مولانا کی خوبی تھی کہ آپ تابع رکھ بھی سکتے ہیں اور تابع رہ بھی سکتے ہیں۔

مولانا میں ذاتی محاسن بے شمار تھے، مثلاً وہ جماعت کے لیے اپنی ذات اور اس کی ہر بلندی کو تیاگ دینے کے قائل تھے، ان کی زندگی میں بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے جماعت کے لیے بڑے سے بڑے ایثار کو بھی گوارا کرلیا۔ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ ان پر جی جان سے نچھاور بھی ہوتے رہے۔

ذہنی کشمکش:

مولانا لدھیانوی نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ خاندان کے بزرگوں اور محلے کے بڑے بوڑھوں سے اپنے ملک و وطن کی زبوں حالی و درماندگی پر نوحہ کناں کا قصہ اور انگریزوں کی طرف سے ہونے والی انتقامی کارروائیوں کی داستان سنی تھی، چوں کہ مولانا کے دادا مولانا شاہ محمد صاحبؒ غدر کے ہنگامہ میں انگریزوں کے مدمقابل رہ چکے تھے۔ انہوں نے مولانا کی پرورش و پرداخت اس انداز

سے کی کہ کم عمری ہی سے تقریر وعظ سکھلانے لگے اور خالی اوقات میں تقریریں سنا بھی کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کے اندر بچپن سے ہی اسلام سے والہانہ محبت اور انگریزوں کی غلامی سے انتہائی نفرت پوری طرح جاگزیں ہوگئی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا اپنی عمر کے ابتدائی مرحلے میں ہی تھے کہ ۱۹۱۴ء میں ترکوں پر انگریزی مظالم کی خبریں سنیں تو مولانا بے چین ہوگئے اور انگریزوں کے خلاف کچھ کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے، یہاں تک کہ دوستوں اور ساتھیوں سے بھی اپنے جذبات کا اظہار کر بیٹھے، دوستوں نے یہ سنتے ہی ایک اسکول میں جلسہ کرنے کا اعلان کر دیا اور جلسہ کا عنوان رکھا ''آج مولانا حبیب الرحمٰن کا وعظ ہوگا اور ترکوں کی ہمدردی میں بھی تقریریں ہوں گی'' اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ شہر کے ہندو و مسلم، امراء و روساء کی بڑی تعداد جمع ہوگئی۔ حکومت کے سی آئی ڈی رپورٹر بھی آ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ترکوں کی حمایت اور انگریزوں کی مخالف میں تقریر ہوتی رہی۔ غدر کے بعد لدھیانہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا جلسہ تھا، جس نے ہندوستانی عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ چوں کہ لوگوں میں خوف و دہشت سمایا ہوا تھا، حکومت کے خلاف اپنی آواز اٹھانے سے بھی لوگ ڈر محسوس کرتے تھے۔ ایسے حالت میں مولانا کی تقریر نے لوگوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا، چناں چہ مولانا کے والد کے ایک دوست مولانا کے گھر آئے اور ان کے والد سے کہا۔ آپ کے لڑکے میں دادا پردادا کی پرچھائیاں نظر آ رہی ہیں، ان میں جذبہ شہادت سوار ہے، پھانسی سے کم ان کو سزا نہ ہوگی۔ اس لیے آپ انہیں مناسب طریقے پر زندگی گذارنے کی تلقین کیجیے۔ حالات ایسے نہیں ہیں کہ اتنی تیزی دکھائی جائے۔

مولانا کے والد نے ان واقعات کو سننے کے بعد اپنے لڑکے سے تو کچھ نہیں کہا البتہ دوسری صبح مولانا کو لے کر ازہر ہند دارالعلوم دیوبند چلے آئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم کی سرپرستی میں داخل کرایا اور تقریر کا سارا واقعہ بھی سنایا۔ مہتمم صاحب نے مولانا سے تو کچھ نہیں کہا البتہ مولانا کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کچھ اس انداز سے کی کہ مولانا موصوف ان کو اپنا پہلا سیاسی استاذ مانتے ہیں۔ مہتمم صاحب مولانا کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے سیاسی رموز و نکات بھی سمجھایا کرتے اور بزرگوں کے سیاسی حالات سے بھی مطلع کیا کرتے۔

سیاسی زندگی کی ابتدا:

دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں مولانا کو اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ چند اہم بزرگوں کی سیاسی سرپرستی بھی حاصل رہی ۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی سے روابط مولانا لدھیانوی کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوتے رہے ۔ طالب علمی کے آخری دور میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی رفاقت حاصل رہی اور ان کے ساتھ ہندوستان کے مختلف سیاسی اور مذہبی پروگراموں میں شرکت کی ، یہ تحریک خلافت کا ابتدائی دور تھا ۔ مولانا لدھیانوی کی سیاسی زندگی کا عملی آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے ۔ مولانا اپنے اس دور کے متعلق تحریر کرتے ہیں :

> ''۱۹۱۹ء کے شروع میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ سیاسی جلسوں میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی اجازت اور شاہ صاحب کے ارشاد پر جانے لگا ۔ والد صاحب تک جب یہ خبر پہونچی تو وہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے میرے سیاسی کام کرنے کے بارے میں بات کی ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا ، کہ آپ کے صاحب زادے حبیب پھانسی سے تو بچ گئے ہیں ، لیکن جیل سے نہیں بچ سکتے ۔ اس لیے اب انہیں سیاسی کام سے روکنا مناسب نہیں ۔ اس طرح میری سیاسی زندگی کا آغاز ہوا'' [۱]

سول نافرمانی:

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس ، مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امرتسر میں ہوا ۔ جلیاں والا باغ کا خونی حادثہ کچھ ہی پہلے پیش آیا تھا ، اس لیے تمام رہنماؤں نے آپسی اختلافات کو ختم کر دیے اور کچھ وقت کے لیے اپنے فروعی مذہبی اصول اس حد تک نظر انداز کر دیے کہ غیر ملکی سامراج کو اپنی موت دکھائی دینے لگی ۔ امرتسر اتحاد کا مرکز بن گیا ۔ ہندوؤں ، مسلمانوں اور سکھوں نے مل کر ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کا احترام کرنے کا عہد کیا ۔ آزادی وطن کے لیے باہم اشتراک اس حد تک بڑھا کہ انگریزوں کو اس سیلاب

---

[۱] رئیس الاحرار ، عزیز الرحمٰن جامعی ، ص : ۱۰۲

کے آگے بند باندھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ بلا کسی ہنگامی تحریک کے وائسرائے ہند نے اچانک ایک آرڈی ننس جاری کیا کہ:

''جو شخص خلافت، کانگریس اور جمعیۃ علماء کا والنٹیر بنے اس کو چھ ماہ قید اور جو والنٹیر بنائے گا اس کو تین سال قید کی سزا دی جائے گی''

حکومت کے اس اعلان نے کانگریس کے رہنما مہاتما گاندھی کو موقع دیا کہ اس نے سارے ملک میں اسی ایک بنیاد پر سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ گاندھی جی کی طرف سے یہ اعلان ۱۹۲۱ء میں ہوا اور ملک کے مختلف حصے سے لوگ والنٹیر بننے اور بنانے کے جرم میں گرفتار ہوتے رہے۔ دوسری جگہوں کے بہ نسبت پنجاب میں لوگوں کی گرفتاری زیادہ عمل میں آئی۔

پہلی گرفتاری:

اس تحریک کی ابتدا میں مولانا حبیب الرحمٰن کو والنٹیر بننے اور بنانے کے جرم میں ۲۲/دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ان کے گھر سے گرفتار کر لیا گیا اور تھوڑے دنوں بعد چھ ماہ کی قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ مولانا لدھیانوی اپنی خودنوشت تحریروں میں اس واقعہ کا تذکرہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

''یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو میری تقریر پر ہندو، مسلمان اور سکھ، مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے سب ہی سول نافرمانی کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنی تقریر میں لوگوں کو دو نعرے لگانے کی تلقین کی۔ ہندو مسلم بھائی بھائی۔ انقلاب زندہ باد۔ جلسہ ختم ہوا تو گورنمنٹ نے مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی، لیکن ۲۱/دسمبر ۱۹۲۱ء تک مقامی حکومت کو موقع نہ ملا کہ وہ مجھے خاموشی سے گرفتار کر سکے۔ جب انگریز ڈپٹی کمشنر اپنے منصوبے میں ناکام رہا تو ۲۱/دسمبر ۱۹۲۱ء کی رات کو شہر میں مسلح پولیس لگا دی گئی، میرے گھر کی سڑک سے لے کر جیل تک دس دس قدم پر مسلح سپاہی کھڑے کر دیے گئے۔

۲۲/دسمبر ۱۹۲۱ کو صبح آٹھ بجے مسلح افسر میرے گھر آئے۔ مجھے انہوں نے والنٹیر بننے اور بنانے پر گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ میں بخوشی پولیس کے ساتھ باہر سڑک پر آیا۔ پولیس افسران

چاہتے تھے کہ مجھے بلا ہتھکڑی لگائے جیل لے جائیں، مگر میں نے بلا ہتھکڑی لگائے جیل جانے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً پولیس کو اپنی پالیسی کے خلاف ہتھکڑی لگانی پڑی.....''۔ [۱]

لدھیانہ جیل میں:

مولانا کو ہتھکڑی لگانے پر پورے شہر میں ایک جوش پھیل گیا۔ ہزاروں کی تعداد آن کی آن میں والنٹیر بن گئے۔ شہری عوام پر پولیس کو قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ ان حالات کے پیش نظر مولانا کا مقدمہ جیل ہی میں چلایا گیا، ایک ہندوستانی مجسٹریٹ نے چھ ماہ سخت قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی، اس وقت مولانا کو لدھیانہ جیل میں ہی رکھا گیا۔ شہر کے چار مشہور لیڈر مہاشہ گھسیٹا رام، ماسٹر تاج الدین انصاری، ڈاکٹر سید یسین اور مولانا کے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب بھی وہاں قیدی کی حیثیت سے پہونچے۔ مولانا کے مخلص رضا کاروں میں دو نام بہت اہم ہیں ایک عبدالرحمٰن عرف ''مانا'' [۲] دوسرے حافظ مشتاق احمد یہ دونوں حضرات کم عمر تھے اور ان کے بارے میں مولانا نے ''جاں نثار رضا کار'' کہا ہے۔ یہ دونوں بھی وہاں پہونچ گئے۔ قیدیوں کی تعداد تقریباً تین ہزار افراد پر مشتمل تھی۔

انبالہ جیل میں:

۳ر جنوری ۱۹۲۲ء کو رات کے بارہ بجے ہلٹن ڈپٹی کمشنر لدھیانہ اور مسٹر سگروگی ایس پی لدھیانہ کرنل حکومت رائے کے ساتھ جیل میں مولانا کے پاس آئے اور بتایا کہ آپ کو آپ کے بھائی محمد یحییٰ اور ماسٹر تاج الدین انصاری کو اسی وقت انبالہ جیل میں تبدیل کیا جائے گا۔ لہذا مولانا اور ان کے ساتھیوں کا سامان باندھا گیا اور اسٹیشن پہونچا دیا گیا، مولانا اور ان کے ساتھیوں کے اسٹیشن پر پہونچتے ہی ہزاروں کی تعداد میں شہر کے لوگ اسٹیشن پر آ گئے اور زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔ مشتعل عوام پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ پولیس عوام کی بھیڑ دیکھ کر گھبرا گئی۔ بڑی مشکل سے مولانا کو انبالہ جیل کے لیے ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ کیا گیا۔ [۳]

---

[۱] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۰۵

[۲] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۸۱

[۳] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۰۷

میانوالی جیل میں:

۶/جنوری ۱۹۲۲ء کی شام کو مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ میاں والی جیل پہونچے۔ انبالہ سے میاں والی سفر کے دوران مولانا کے والد محترم مولانا محمد زکریا صاحب ساتھ رہے اور لالہ موسیٰ اسٹیشن تک گئے۔ چوں کہ مولانا کے والد کو اس تبادلہ کا علم ہوگیا تھا اس لیے وہ لدھیانہ اسٹیشن پہونچے اور مولانا کے ہمراہ ہوگئے۔ کچھ دنوں تک مولانا اور ان کے ساتھیوں کو الگ الگ رکھا گیا۔ کسی کو کسی کے متعلق معلوم نہ ہوسکا کہ فلاں کس جگہ پر رکھے گئے ہیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد تینوں حضرات کو پولٹیکل قیدیوں میں پہونچادیا گیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ: ''میاں والی جیل اس وقت پولٹیکل قیدیوں کے لیے کالاپانی کا بدل بنایا گیا تھا۔ اس جیل کا جیلر بہت سخت تھا اور سپرنٹینڈنٹ نرم'' سول نافرمانی میں ماخوذ ہوئے چند افراد پہلے تشریف لاچکے تھے ان میں مولانا سید حبیب صاحب مدیر سیاست لاہور، مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند اور محترم عبدالعزیز انصاری وغیرہ۔

مولانا لدھیانوی کے جانے کے بعد جو حضرات تشریف لائے ان میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا اختر علی خاں، مولوی لقاء اللہ، عبدالمجید سالک، لالہ دیش بندھو گپتا اور مولانا داؤد غزنوی وغیرہ تھے۔ چند ہفتوں میں میاں والی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہوگئی اور جیل کی زندگی ہنسی خوشی، تعلیم وتفریح میں گذرنے لگی۔

دھرم سالہ جیل میں:

میاں والی جیل میں مولانا تقریباً پانچ ماہ رہے، وہاں کی زندگی مولانا کے لیے بہت اہم تھی اس لیے کہ ملک کے مایہ ناز شخصیات اس وقت وہاں موجود تھیں، جن سے مولانا کا ملکی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہتا اور تعلیم وتفریح بھی، کہ اچانک ۱۸/جون ۱۹۲۲ء کو حکومت پنجاب کی جانب سے یہ حکم نامہ پہونچا کہ حبیب الرحمٰن کو فوری دھرم سالہ جیل میں تبدیل کیا جائے۔ مولانا اس حکم سے بہت دل برداشتہ ہوئے کہ اچھے ساتھیوں کی صحبت ومعیت اور علمی مجالس کی پرلطف بحثوں سے محروم ہوجاؤں گا۔ لیکن قہر درویش بجان درویش مجبوراً دھرم سالہ جیل جانا پڑا۔ میاں والی جیل سے رخصت ہوتے وقت طبیعت پر انتہائی بوجھ محسوس کررہے تھے،

لیکن جب دھرم سالہ جیل پہونچے تو طبیعت کا بوجھ ہلکا ہوا اور یک گونہ مسرت حاصل ہوئی، کیوں کہ وہاں پنجاب کے مشہور سیاسی رہنما لالہ لاجپت رائے موجود تھے۔ لالہ جی بوڑھے اور مولانا جوان العمر تھے۔ لہذا مولانا نے لالہ جی کی خدمت شروع کردی۔ وطنی تعلق اور مولانا کی خدمت نے لالہ جی پر خاصا اثر کیا اور وہ مولانا کے دوست بن گئے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ ''لالہ جی سے پولیٹکل معاملات پر اکثر تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا، بہت سی مفید معلومات مجھے ان سے حاصل ہوئیں.....''

پھر لدھیانہ جیل میں:

دھرم سالہ جیل میں رہتے ہوئے ابھی تین ماہ ہی گذرے تھے کہ پھر مولانا کو لدھیانہ جیل میں منتقل کردیا گیا۔ چوں کہ مولانا کی سزا چھ ماہ تھی اور یہ مدت ختم ہونے جارہی تھی اس لیے مولانا کو لدھیانہ جیل واپس لاکر ایک اور وارنٹ گرفتاری کی تعمیل کرائی گئی۔

دوسری گرفتاری:

۸/اگست ۱۹۲۲ء کو مولانا کی رہائی کا دن تھا اور بظاہر انہیں اس غرض سے دھرم سالہ جیل سے لدھیانہ جیل میں منتقل کردیا۔ لیکن اسی روز بجائے رہائی کے ایک دوسرے مقدمے کے لیے دفعہ ۱۰۸ کے تحت وارنٹ دکھلا کر پھر جیل میں رکھ لیا گیا۔ ایک ہفتہ کے بعد ایک سال قید کی مزید سزا کا حکم سنادیا گیا اور ۲۰/اگست ۱۹۲۲ء کو مولانا کو پھر دوبارہ دھرم سالہ جیل میں پہونچادیا گیا، جہاں مولانا کی ملاقات پہلی مرتبہ شیخ حسام الدین صاحب سے ہوئی اور مولانا شیخ صاحب اور لالہ لاجپت رائے کے ساتھ بقیہ مدت اسیری گزار کر ۱۶/اگست ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے۔

گھر کی نیلامی:

۱۹۲۱ء میں جب پہلی مرتبہ مولانا کو گرفتار کیا گیا اور چھ ماہ قید کے ساتھ ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا

بھی سنائی گئی۔ مولانا نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا تو حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا اس وقت مولانا کے گھر میں اہلیہ اور چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا وارنٹ تھا جو آپ کی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو اپنی کارروائی کرنے کی اجازت دے دی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتی کہ روزانہ استعمال کے برتن بھی اٹھا لیے، زنانہ پولیس کے ذریعہ آپ کی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں، اگلے دن صبح کو یہ تمام سامان کوتوالی کے سامنے نیلام کر دیا گیا۔ ۱۶/اگست ۱۹۲۳ء کو جب آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے اور لدھیانہ پہونچے تو گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آ رہی تھی۔ بارش سے گھر کی چہار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی۔ سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسّی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے، کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دو سال گذار دیے۔ گھر میں پہلے ہی کیا تھا، مولانا نے واپسی پر کچھ دوستوں کی مدد سے اپنے گھر کو کچھ حد تک درست کیا تا کہ رہنے کے لائق ہو سکے اور بے پردگی ختم ہو جائے۔ [۱]

پنجاب خلافت کمیٹی:

۱۹۲۳ء میں رہائی کے بعد مولانا لدھیانوی کو پنجاب خلافت کمیٹی کا ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ لہذا مولانا بطور ناظم اعلیٰ اپنے کام میں مشغول ہو گئے، لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ پنجاب کے لوگ مولانا آزاد کی رہنمائی کو مانتے تھے، جس پر علی برادران پنجابی رہنماؤں سے ناراض ہو گئے غازی امان اللہ خاں کی حکومت پر بچہ سقہ کی حملہ کی وجہ سے مرکزی خلافت کمیٹی سے اختلافات کی خلیج اور وسیع ہو گئی۔ پنجاب کے تمام خلافتی رہنما غازی امان اللہ خاں کی امداد پر کمر بستہ ہو گئے۔ سینٹرل خلافت کمیٹی کی پالیسی اس بارے میں پنجابی رہنماؤں کے خلاف تھی۔

محترم جانباز مرزا اپنی کتاب کاروان احرار میں مولانا لدھیانوی اور مولانا شوکت علی کے نظریہ کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[۱] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۷۶

''فرنگی سیاست دانوں نے ہندوستان کے باہمی اتحاد کی عمارت میں آگ لگا کر افغانستان کے شاہ غازی امان اللہ کو بھی اس کو اس جرأت کی سزا دینی چاہی کہ اس نے تحریک ہجرت کے موقع پر ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو اپنے ہاں کیوں پناہ دی۔ چنانچہ افغانستان کے چند نام نہاد مولویوں نے انگریزی سیاست کے پس منظر میں امان اللہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس موقع پر مولانا حبیب الرحمٰن پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنہوں نے شاہ افغانستان کے حق میں آواز بلند کی اور صحافت میں ہندو اخبارات کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار روزنامہ زمیندار نے ان کے بیان کو شایع کیا۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے جنرل سیکریٹری ہونے کی حیثیت سے مولانا کا یہ بیان مرکزی خلافت کمیٹی کو پسند نہ آیا۔ جب کہ مولانا شوکت علی نے بچہ سقہ کے حق میں فری پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

''باغی افغانستان میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسلامی احکام کی عزت ہے اور مغربی تہذیب کے خلاف ایک شرعی جہاد ہے اور غازی امان اللہ کو ان کی بے دینی کی وجہ سے تخت سے علیحدہ کیا گیا ہے''

مولانا شوکت علی کے اس بیان کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن نے حسب ذیل فتویٰ علماء ہندوستان کو بھیجا:

(۱) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ شاہ امان اللہ غازی والئی افغانستان نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کی تھیں، کیا وہ ان کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا؟

(۲) (الف) کیا ان اصلاحات کا اجراء شاہ امان اللہ کے خلاف بغاوت کی شرعاً اجازت دیتا ہے؟

(ب) جو جماعت ان اصلاحات کی بنا پر بغاوت کرنا چاہتی ہے، اس قسم کی جماعت کی معاونت کرنا کسی مسلمان کے لیے شرعاً جائز ہے؟

(۳) جو لوگ ان اصلاحات کے اجراء کی وجہ سے شاہ امان اللہ کو کافر کہتے ہیں کیا وہ حق پر ہیں؟

(۴) جب کہ دشمنان اسلام مختلف ذرایع سے سلطنت افغانستان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات

میں شاہ امان اللہ کی امداد کرنا ہر مسلمان پر شرعاً فرض نہیں ہے؟'' [۱]

آپس کے ان اختلافی بیان کے نتیجے میں مرکزی خلافت کمیٹی کے سیکریٹری مولانا محمد عرفان نے ۱۷ر جولائی کو مولانا لدھیانوی کے پاس ایک خط کے ذریعہ اطلاع دی کہ پنجاب خلافت کمیٹی کے سارے نظام کو توڑ دیا گیا ہے۔

خط درج ذیل ہے۔

''.....حسب تجویز مرکزی خلافت کمیٹی آپ کی موجودہ خلافت کمیٹی پنجاب کا الحاق مرکزی کمیٹی سے توڑ دیا گیا ہے اور حسب ہدایت مرکزی خلافت کمیٹی پنجاب میں صوبہ کی جدید خلافت کمیٹی قائم ہوگئی ہے۔ لہٰذا آپ سابق پنجاب خلافت کمیٹی کا سارا ریکارڈ جدید خلافت کمیٹی کے حوالے کر کے ان سے رسید لے لیجیے تا کہ جدید خلافت کمیٹی باضابطہ کام کر سکے'' [۲]

پنجاب خلافت کمیٹی کے تحلیل ہونے کی مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ ایک وجہ اور تھی اور وہ یہ کہ ۱۸ر اگست ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں آل پارٹی کنونشن ڈاکٹر انصاری کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی، جس میں پنڈت موتی لال نہرو نے ''نہرو رپورٹ'' پیش کی۔ مولانا شوکت علی اس رپورٹ سے متفق نہ ہوئے۔ لیکن پنجاب خلافت کمیٹی کے تمام ارکان نے مخلوط انتخاب سیٹوں کے تعین کے بغیر منظور کرلیا۔ یہ بھی اختلاف کی ایک اہم وجہ تھی جو سبب بنا پنجاب خلافت کمیٹی کے تحلیل ہونے کا۔

باغیانہ مضامین کی اشاعت:

۱۹۲۴ء میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ارشاد پر خواجہ محمد یوسف صاحب نے ہفتہ وار اخبار ''انیس'' نکالا۔ انیس اخبار نے حکومت ہند پر آزادانہ نکتہ چینی شروع کی۔ اس اخبار میں ہر ہفتہ رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی کے باغیانہ مضامین شایع ہوتے، ان مضامین کی وجہ سے حکومت کے لیے یہ اخبار ناقابل برداشت ہوگیا۔ اخبار کو بحق سرکار انگریزی ضبط کرلیا گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر انیس الرحمٰن

---

[۱] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۱۳۱

[۲] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۲۷

امروہوی کو دو سال کی قید ہوئی۔ خواجہ محمد یوسف صاحب کا پریس ضمانت نہ دینے کی سزا پر ضبط کرلیا گیا۔ پریس کی مالیت کم وبیش دس ہزار کی تھی۔ [۱]

دربار کا بائیکاٹ:

۱۹۳۵ء میں گورنر پنجاب نے جب لدھیانہ میں گورنری دربار کرنا چاہا، تو مولانا لدھیانوی نے دربار کے بائیکاٹ کا اعلان کیا اور پنجاب کے مشہور رہنما لالہ لاجپت رائے کو تار دے کر لدھیانہ بلایا۔ گورنر کے مقابلہ میں لالہ جی کا جلوس شاندار طریقے سے نکالا۔ لدھیانہ میں صبح آٹھ بجے گونر پنجاب پہونچ رہا تھا، عین اسی وقت لالہ لاجپت رائے موٹر کے ذریعہ صبح آٹھ بجے لدھیانہ پہونچ گئے۔ لدھیانہ بڈھے نالا کے پل پر پچاس ہزار آدمیوں نے لالہ جی کا استقبال کیا۔ میونسپل کمیٹی کے اصغر علی ہال کو جہاں گورنر پنجاب میونسپل کمیٹی میں نہ آسکا ان کی جگہ لالہ لاجپت رائے نے مولانا لدھیانوی کی صدارت میں اسی اسٹیج پر تقریر کی جس پر گورنر پنجاب کو دربار کرنا تھا۔ [۲]

تیسری گرفتاری:

ابھی ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد اٹھائی جارہی تھی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک دلوں کی جن بھٹیوں نے انسانی وقار کو مجروح کیا تھا، ان کی راکھ کرید کر راستے کی میل صاف کی جارہی تھی، کہ انہی راہوں پر خون کے چند ایسے قطرے گرے کہ انسانیت کے سنورنے کی راہیں ازسرنو مسدود ہوگئیں۔ ہندو اور مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

۱۹۲۷ء کے وسط میں لاہور کے ایک ہندو ناشر راج پال نے ایک کتاب شایع کی، جس میں خاتم الانبیاء حضور سرور کائنات ﷺ کے دامن اطہر پر ایسے گندے چھینٹے ڈالے کہ پنجاب کا مسلمان بے قرار ہوگیا۔ اس کے خلاف ۴۔۵ جولائی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو لاہور دہلی دروازہ سے باہر ایک اجتماع ہوا جس

---

[۱] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۷۳

[۲] حوالہ: ایضاً

میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ نے چودھری افضل حق کی صدارت میں تقریریں کیں۔ مولانا لدھیانوی نے اپنی تقریر میں خاص طور پر کہا کہ: ''یا تو سننے والے کے کان نہ رہیں یا کہنے والے کی زبان نہ رہے'' اِن ہی تقریروں کے اثرات تھے کہ غازی علیم الدین نے راج پال کا قتل کر دیا۔

۱۵/اگست ۱۹۲۷ء کو مولانا لدھیانوی کی تقریر قابل اعتراض سمجھ کر حکومت نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ عدالت نے ایک سال کے لیے ضمانت طلب کی لیکن مولانا نے ضمانت دینے کے بجائے ایک سال جیل میں رہنا منظور کیا۔ جیل میں مولانا کو تنہا رکھا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری پریشانیاں سامنے آئیں۔ جیل کے خراب کھانے کی وجہ سے پیچش جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوئے جس سے ہمیشہ کے لیے معدہ کا نظام خراب ہو گیا۔ بالآخر ۱۴/اگست ۱۹۲۸/کو مولانا پوری ایک سال کی قید ختم کر کے رہا ہوئے۔[۱]

پنڈت موتی لال نہرو سے روابط:

۱۹۲۸ء میں آل انڈیا مسلم کشمیر کانفرنس لدھیانہ میں ہوئی۔ اس کی صدارت کے لیے مولانا لدھیانوی نے خواجہ محمد یوسف صاحب کے ذریعہ پنڈت موتی لال نہرو کو کشمیر کانفرنس کا صدر بنایا۔ کانفرنس میں بڑے بڑے مسلمان کشمیری تاجروں نے پنڈت موتی لال کی گاڑی اپنے ہاتھ سے کھینچی۔ ایک لاکھ ہندو اور مسلمان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ نہرو رپورٹ کی وجہ سے پنجاب میں پنڈت موتی لال نہرو کی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ لیکن مولانا لدھیانوی کی تدبیر سیاست نے ہوا کا رخ پلٹ دیا، پنجاب کے عام ہندو، مسلمان اور سکھوں نے پنڈت جی کی تعریف کرنا شروع کی۔ پنجاب کے اخبارات کا رخ بھی بدل گیا۔ پنڈت جی مولانا کی اس تدبیر سیاست سے بہت خوش ہوئے اور جب تک زندہ رہے مولانا لدھیانوی کو اپنے دوستوں اور خاص مشیروں کی فہرست میں رکھا۔[۲]

یوم آزادی:

۲۶/جنوری ۱۹۲۹ء کو کانگریس کی سرپرستی میں یوم آزادی پورے ملک میں منایا گیا۔ ہر جگہ حلف

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، در حدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۷۷

[۲] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۷۴

نامے پڑھے گئے۔ کہیں سے کوئی پرتشدد واقعات سامنے نہیں آئے، لیکن ہندوستان بھر میں صرف لدھیانہ ہی ایسا شہر تھا جہاں انگریز ڈپٹی کمشنر نے دفعہ ۱۴۴ لگادی۔ تاکہ عوام وخواص اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق کوئی کام انجام نہ دے سکیں۔ مولانا لدھیانوی اوران کے ہمنواؤں نے اس کے باوجود یوم آزادی منایا۔ اس سے قبل ڈپٹی کمشنر سے مولانا کی جو گفتگو ہوئی اسے تحریر کیا جاتا ہے جو دل چسپی سے خالی نہیں مولانا فرماتے ہیں:

''میں نے اعلان کیا کہ یوم آزادی کا حلف نامہ شاہی مسجد لدھیانہ [1] میں پڑھا جائے گا۔ اس پر ڈپٹی کمشنر بہت پریشان ہوا اور اس نے مجھ سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ خواجہ محمد یوسف کی کوٹھی پر ڈپٹی کمشنر سے ٹیلیفون پر بات ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے کہا کہ مسجد ایک بہت مقدس جگہ ہے، آپ اس میں یوم آزادی کا اعلان کیوں پڑھ رہے ہیں۔ عبادت گاہوں کو سیاسی اکھاڑہ نہیں بنانا چاہیے۔ میں نے جواب میں کہا آپ کب سے مفتی اسلام بن گئے ہیں۔ میں مذہب اور سیاست کو آپ سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ آپ کی مذہبی رہنمائی کی مجھے ضرورت نہیں۔ اس جواب پر ڈپٹی کمشنر نے ٹیلیفون رکھ دیا اور شہر میں زیادہ سختی شروع کردی۔ میرے چچا مولانا مفتی محمد نعیم صاحب نے سٹی کانگریس کے صدر کی حیثیت سے غازی عبدالرحمٰن عرف مانا، مسٹر مظہر جمیل اور کانگریس کے رضا کاروں کے ساتھ شاہی مسجد متصل کمیٹی باغ میں ہزاروں ہندو اور مسلمانوں کے سامنے حلف نامہ آزادی پڑھا اور میں نے کانگریس کا جھنڈا لہرایا'' [2]

چوتھی گرفتاری:

گاندھی جی نے جب ۱۲/ مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا اور پورے ملک میں لوگوں نے

---

[1] یہ مسجد احمد شاہ ابدالی کے پوتے شجاع الملک نے بنوائی تھی جو ۱۸۳۶ء میں انگریزی سیاست کا شکار ہوکر لدھیانہ میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ اس چھوٹی سی مسجد کو جس کا صحن بہت بڑا ہے شاہی مسجد کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ شاہ شجاع الملک کا مکان مسجد سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا جس میں آج کل جنرل پوسٹ آفس بنا ہوا ہے۔ اس پوسٹ آفس کی عمارت پر شاہ شجاع الملک کے نام کا ایک پتھر اب بھی لگا ہوا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں شاہی مسجد پر قادیانیوں نے قبضہ کرلیا تھا، اس پر شہر میں بہت ہنگامہ ہوا۔ فروٹ منڈی کے تاجر جو اس منڈی کے نگراں تھے، انہوں نے قادیانیوں کو نکال کر اس مسجد کی تولیت مولانا لدھیانوی کے سپرد کی۔ مگر افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اسے گرا کر اس پر گوردوارہ تعمیر کردیا گیا ہے۔

[2] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۳۰

گاندھی جی کی آواز پر اس تحریک میں شمولیت اختیار کی تو پنجاب کا علاقہ اس میں کیوں کر پیچھے رہ سکتا تھا۔ اس لیے پورے پنجاب اور خاص طور پر لدھیانہ میں اس تحریک میں شامل ہونے کی تیاریاں ہونے لگی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گاندھی جی نے ۱۳/ مارچ کو نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا، لیکن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اس سے دو روز پیشتر لدھیانہ۔ کے ہزاروں عوام کی موجودگی میں دریائے ستلج کے کنارے نمک بنا کر انگریز کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ حکومت کے نزدیک مولانا کا یہ عمل قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ لہٰذا ۲۳/ اپریل ۱۹۳۰ء کو دفعہ ۱۰۸/ اور دفعہ ۱۲۴/ کے تحت مولانا کو ان کے مکان سے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ۲۷/ مئی ۱۹۳۰ء کو لدھیانہ جیل میں لالہ ودّیا ساگر مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں مولانا نے حسب ذیل بیان دیا:

''جب میں نے اپنے مقدمہ میں حکومت کو پریشان پایا کہ وہ مجھ پر الزامات ثابت کرنے سے قطعاً قاصر ہے، جو اس نے مجھ پر لگائے ہیں۔ اور لدھیانہ کی کسی تقریر پر مجھے سزا نہیں دے سکتی تو لاہور کے گواہوں سے مدد لی گئی، مگر لاہور کے گواہوں کی شہادت بھی مفید ہونے کے بجائے گورنمنٹ کے خلاف گئی، تو میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے عقیدے اور یقین کا غیر مشتبہ الفاظ میں اظہار کروں اور انگریزی حکومت کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو صاف بیان کروں، جس کو میں اپنی بے شمار تقریروں میں بیان کر چکا ہوں۔ سچائی اور ایمان داری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے دلی جذبات کا اظہار بلا کسی خوف کے عدالت میں کیا جائے۔ اگر اقرار جرم پر پھانسی کے تختے پر بھی لٹکا دیا جاؤں تو سزا کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ کیوں کہ جس چیز کو حکومت جرم قرار دیتی ہے، میرے نزدیک وہی سچائی اور ایمان ہے۔

عام طور پر بیان طلب انصاف اور برأت کی نظر سے دیے جاتے ہیں۔ مگر میں اپنا بیان استغاثہ کی امداد کے لیے دے رہا ہوں۔ اس کٹہرے میں پیش ہونے کا مجھے پہلا ہی اتفاق نہیں، دسمبر ۱۹۲۱ء کو مجھے دفعہ ۱۰۸/ کے تحت گرفتار کیا گیا اور جیل میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا، مگر مقدمہ کے دوران میری دفعہ ۱۰۸/ بدل کر ۱۲۴/ الف کر دی گئی۔ اس دفعہ کے تحت مجسٹریٹ نے مجھے چھ ماہ کی قید اور ایک ہزار جرمانہ کی سزا دی، پھر اس جیل میں جب میری رہائی کے تین دن باقی رہ

گئے تو حکومت نے دفعہ ۱۰۸ر کے تحت مجھ پر از سر نو مقدمہ چلا کر ایک سال کی سزا دی۔

میں نے ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو شاہی مسجد میں قومی جھنڈا لہرایا اور حکومت کی تمام تدبیریں اور دفعہ ۱۴۴ر ناکام ہوگئی۔ شکست فاش کھانے کے بعد مقامی حکومت میری گرفتاری کا بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۳۰ء کو لدھیانہ میں میں نے اپنے پروگرام کے مطابق سول نافرمانی شروع کر دی۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۳۰ء کی شب خوردہ حکومت نے کانگریس کے پرامن جلوس پر دل کھول کر ڈنڈے برسائے اور سینکڑوں بے گناہ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو زخمی کیا۔ جب اس تشدد اور ظلم سے بھی کام نہ چلا اور تحریک سول نافرمانی تیز ہوگئی تو حکومت کو مجھے گرفتار کرنے کے سوا چارہ کار نظر نہ آیا۔

میں حکومت انگریز کو ایک ایسی غیر ملکی حکومت سمجھتا ہوں، جس نے اپنی چال بازیوں اور طاقت کے بل پر ہندوستان کو غلام بنائے رکھا۔ میں اپنے لیے اور ہندوستانیوں کے لیے یہ فرض سمجھتا ہوں کہ انگریز گورنمنٹ کو جس ممکن طریق سے بھی ہم نکال کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ اس بارے میں جو سزا بھی ہم کو ملے، ہم اسے بخوشی قبول کریں۔ انگریزی حکومت نے جو نہ صرف غیر ملکی حکومت ہے بلکہ ظالم اور ہندوستانیوں کا خون چوسنے والی حکومت ہے۔ اس لیے حکومت کے مشینری کو ناکام بنانا اور انگریزی مال کا بائیکاٹ کرنا ہر ہندوستانی کا اولین فرض ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ سچائی کے اجلے دامن پر برطانوی حاکمیت و طاقت ایک سیاہ داغ ہے اور اس داغ کو دھونا اگر جرم ہے تو میں اقرار جرم کرتا ہوں اور قانونِ عدالت کو اپنی منشا پوری کرنے کی اجازت دیتا ہوں'' [۱]

مولانا لدھیانوی کا یہ بیان تحریری شکل میں تھا۔ اس بیان کے بعد مولانا کو ایک سال قید کی سزا ہوئی اور انہیں لدھیانہ جیل سے گجرات جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

گجرات جانے کے بعد مولانا کو ڈاکٹر انصاری کے ساتھ رہنے کا موقع ملا اور یہیں سے ڈاکٹر صاحب سے مولانا کے تعلقات بڑے گہرے ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ جیل میں حضرت مفتی کفایت اللہ

---

[۱] کاروانِ احرار، جانثار حسین، ج ۱، ص: ۱۳۴

صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب سے ملاقات ہوئی۔

گاندھی ارون پیکٹ اور مولانا کی رہائی:

گاندھی ارون پیکٹ کے تحت جب عفو عام کا اعلان ہوگیا، تو مولانا کے سوا تقریباً تمام قیدی رہا کردیے گئے۔ مولانا کی رہائی کے لیے ڈاکٹر انصاری نے اپنے جیل سے باہر آنے کے بعد بہت کوششیں کیں اور گاندھی جی کو بھی اس طرف متوجہ کیا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور مولانا گاندھی ارون میثاق کے تحت بھی رہا نہ ہوسکے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے رہائی کے سلسلہ میں حکومت ہند کا نظریہ واضح کرتے ہوئے مولانا کو ایک خط تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے:

''مولانائے مکرم زادلطفہٗ

میں نہ آپ کی طرف سے مطمئن تھا اور نہ لاپرواہی برتی، بلکہ کما حقہ سعی رہائی کی کی۔ بعد کو مایوس ہوکر اپنے اور آپ کے جذبہ خودداری پر بھروسہ کرگیا۔ ہوم ممبر صاحب اور دیگر ذمہ داروں سے جاکر تبادلہ خیالات اکثر اوقات کرتا رہا۔ لیکن گورنمنٹ پنجاب کی رپورٹ پر آپ کی تقریر تشدد آمیز پر جوش ہوتی ہے۔ ہمارے لیے فوراً سوال خودداری پیدا ہوگیا۔ اس لیے اب اس سے زیادہ گر کر التجا کو آپ کے ایثار کے منافی اور خودداری کی ضد سمجھا اور مناسب جانا کہ دو ہفتوں کی قید پورا کرکے بمنت غیر آپ وطن آئیں گے اور جلد از جلد مجھ سے ملاقات ہوگی۔

بعض اہم امور کے تئیں آپ سے جلد ملاقات ہونا ضروری ہے۔ فوراً آزادی کے بعد آجائیں تو بہتر ہے۔ میں نو تک دہلی میں مسلسل ہوں اور اس کے بعد بھوپال اور سترہ کو رام پور ہوں گا۔

فقط والسلام　　مخلص۔ مختار احمد انصاری

اس طرح مولانا نے اپنی مدت اسیری مکمل کی اور مئی ۱۹۳۱ء کو رہا ہوئے۔

مولانا جب گھر پہونچے تو ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط پہونچا جو اس طرح ہے:

''مکرمی جناب حبیب الرحمٰن صاحب۔ السلام علیکم۔ دلی مبارک باد

اپنی مدت قید پوری کر کے چھوڑی، ہاں کیوں کسی کا احسان لیجیے۔ مردان خدا ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ وسبحان اللہ۔ میں آج رام پور جا رہا ہوں۔ آپ کی ملاقات نہایت ضروری ہے۔ ایک وقت کے لیے اگر آپ ۲ر جون کو آ جائیں تو معاملات طے ہو سکیں گے۔ باقی عند التلاقی۔

فقط والسلام　　مخلص مختار احمد انصاری [1]

مجلس احرار اسلام کی صدارت:

مجلس احرار اسلام کے قیام ۱۹۲۹ء کے بعد احراری رہنما کانگریس کی طرف سے شروع کردہ تحریک سول نافرمانی میں مشغول ہو گئے اس سے بہ ظاہر مجلس احرار دب گئی لیکن جب ۱۹۳۱ء کے شروع میں احراری رہنما جیلوں سے رہا ہوئے تو انہوں نے از سر نو مجلس احرار کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا اور پہلے صدر کی حیثیت سے مولانا لدھیانوی کا نام پیش ہوا، جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ اس طرح مولانا لدھیانوی مجلس احرار اسلام کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک مولانا لدھیانوی مجلس احرار اسلام کے صدر رہے۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں طویل نظر بندی کی وجہ سے مجلس احرار مولانا لدھیانوی کی صدارت سے محروم ہو گئی۔ اس طرح رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی دس سال تک مجلس احرار کے صدر رہے۔ مولانا کے زمانہ صدارت میں تحریک کشمیر، تحریک کپورتھلہ، تحریک بہاول پور، تحریک قادیان اور تحریک شہید گنج کو مولانا کی فکری اور عملی رہنمائی حاصل رہی۔

رئیس الاحرار جماعت احرار کو پورے نظم وضبط کے ساتھ چلاتے رہے۔ صوبہ یوپی اور صوبہ سرحد، بہار، بمبئی، اور بنگال تک مجلس احرار کے نظام کو پھیلایا اور منظم کیا۔ اپنے دور صدارت میں ہندوستان کے سیاسی جماعت کے لیڈروں سے سیاسی مسائل پر ہمیشہ ایسی بات چیت کرتے رہے، جس سے جماعت احرار کے وقار میں اضافہ ہو۔

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۳۸-۱۳۹

جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جمعیۃ علماء کے قیام ۱۹۱۹ء سے ہی رکن بنے۔ احرار کے نظام کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء کا بھی کام کرتے رہے۔ جمعیۃ علماء کے تمام اجلاس اور مجلس مشاورت میں خصوصی دعوت پر شریک ہوتے۔ احرار اور جمعیۃ میں انہوں نے کبھی اختلاف کی خلیج حائل نہ ہونے دی۔ احرار کو جمعیۃ کے ساتھ اور جمعیۃ کو احرار کے ساتھ ملائے رکھنا مولانا کی سیاسی تدبّر کا ثبوت تھا۔ جماعت احرار میں جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کے اثرات کو قائم رکھنے میں ہمیشہ اپنے ذاتی اثر ورسوخ سے کام لیا اور اپنے زمانہ صدارت میں احرار، جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس سے ہمیشہ اشتراک وتعاون کرتے رہے۔

پانچویں گرفتاری:

تحریک کشمیر ۳۰/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو شروع کیا گیا تھا۔ (تحریک کشمیر کی مکمل روداد مجلس احرار کی خدمات کے تحت آخری باب میں تحریر کیا جائے گا) اس سے قبل لندن میں دوسری گول میز کانفرنس شروع ہوگئی تھی جس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے گاندھی جی ۲۹/اگست ۱۹۳۱ء کو لندن گئے تو احرار رہنما مولانا لدھیانوی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے ساحل بمبئی پر انہیں منع کیا، لیکن وہ نہیں مانے۔

گول میز کانفرنس شروع ہونے سے قبل قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے گاندھی جی کے سامنے اپنے مشہور چودہ نکات رکھے جسے گاندھی جی نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا ''میں اپنی ذاتی حیثیت سے ہر چیز منظور کرنے کو تیار ہوں لیکن کانگریس کی طرف سے کوئی منظوری نہیں دے سکتا''۔

یہ عجیب بات تھی کہ کانگریس نے اپنے متفقہ مشورے سے گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔

ان حالات کے پیش نظر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے تحریک کشمیر کے دوران مجلس احرار کے تیسرے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے ۱۲/نومبر کو پریس کو حسب ذیل بیان دیا۔

''یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے چودہ مطالبات منظور نہیں کیے

جائیں گے۔ کیوں کہ حکومت ہند۔ ہندو اور کانگریس سے خائف ہے..... انگریز سمجھتا ہے کہ ہندو ہمارے نظام حکومت کو درہم برہم کردے گا..... اور مسلمانوں کی نسبت انگریز کے دل میں یقین پیدا ہوگیا ہے کہ ان میں کوئی ایسی سرفروش جماعت نہیں جو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے انگریزی نظام حکومت سے ٹکر لے..... یہ خبر اخبارات میں آچکی ہے کہ وائسرائے نے گورنمنٹ برطانیہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی پرواہ کیے بغیر ہندو لیڈروں سے صلح کرلے ..... بنابریں میں ہندوستانوں کے مسلمان کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ حالات پر بہادری اور دیانت داری سے غور کریں.....'' [1]

چوں کہ تحریک کشمیر کا آغاز ہو چکا تھا اور اس کے فوراً بعد مولانا کا یہ بیان اخبارات میں شایع ہوا۔ انہی وجوہات کی بنا پر مولانا کو ۱۲ر نومبر ۱۹۳۱ء کے دن دفعہ ۱۴۱-۱۴۳- اور ۱۰۸ر کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ مولانا کے دفتر (مجلس احرار اسلام کا صدر دفتر) کی تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں کر کے دفتر کو مقفل کردیا۔

مولانا کی گرفتاری کے بعد مجلس احرار نے تحریک کشمیر کو جاری رکھا۔ جس سے حکومت کشمیر کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس لیے حکومت نے احرار سے صلح کی کوشش کی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید سے احرار رہنماؤں کی لاہور بورسٹل جیل میں گفتگو کرائی۔ اس گفتگو میں مولانا لدھیانوی کے علاوہ اور بھی احراری رہنما شریک ہوئے۔ مگر یہ گفتگو کامیاب نہ ہوسکی اور تمام احراری قیدی واپس اپنی اپنی جیلوں میں بھیج دیے گئے۔ اس طرح مجلس احرار نے اپنی تحریک جاری رکھی اور مولانا ۲۲ر فروری ۱۹۳۳ء کو رہا ہوئے۔

رئیس الاحرار کو اس مرتبہ نیو سنٹرل جیل ملتان میں رکھا گیا تھا۔ مولانا کے قیدی ساتھیوں میں اس وقت ہندوستان کی چند مایہ ناز شخصیات تھیں۔ جن میں مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب نکودری، شیخ حسام الدین امرتسری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر جمعیۃ علماء ہند) اور مولانا احمد سعید دہلوی (ناظم جمعیۃ علماء ہند) وغیرہ تھے۔

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۱۹

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جب ملتان سینٹرل جیل سے رہا ہوئے تو رہائی سے دوروز قبل جیل کے تمام ساتھیوں کے ایک مجمع میں مولانا لدھیانوی کی شان میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے ایک نظم پڑھی جس میں مولانا کی زندگی، اخلاق و عادات، فکر وتدبّر، جرأت و دلیری، تحمل وبردباری، بڑے چھوٹوں کی عزت وتکریم اور انکساری و عاجزی۔ غرض کہ تمام اوصاف زندگی بیان کردیے ہیں۔

نظم کا خلاصہ درج ذیل ہے:

اے صدیق محترم لدھیانوی — لو تمہاری بھی رہائی آگئی
اے شفیق قوم رحماں کے حبیب — آگئی تیری جُدائی آگئی
دوستوں کو چھوڑ کر تو بھی چلا — آہ کیسی شاق ہے فرقت تری
تو رہا جب تک تو اپنی قید کو — قید سمجھا ہی نہیں کوئی کبھی
جیل کیا تھا محفل احباب تھی — اور تو تھا اس کی رونق روشنی
گرچہ باہر صدر تھا احرار کا — پرنہ برتی جیل میں کچھ برتری
زیب دیتی ہے قیادت بھی اسے — جو رہے زنداں میں بن کر لشکری
قیدیوں کی ہر طرح کی خدمتیں — تونے کیں اے مستحق افسری
کچھ نہ سمجھا فرق خویش وغیر میں — سب کی یکساں دل سے خدمت تونے کی
سب کو یاد آئیں گی تیری خدمتیں — تیرا ایثار اور جودِ حاتمی !
شکر ہے اللہ کا اے خوش خصال — حق نے کی تجھ کو عطا نیک اختری
حسن صورت حسن سیرت خوش دلی — خوش کلامی خوش مزاجی دل لگی
تو فقیری میں ہے دل کا بادشاہ — تجھ پہ قرباں شوکت شاہنشہی
قیدیوں میں چوں کہ اقدم تو ہی ہے — اس لیے حاصل ہے تجھ کو برتری
ایک طرف فرقت کا ہے تیری ملال — دوسری جانب خوشی بھی ہے بڑی
قید مظلومی کی تھی صبر آزما — ختم اطمینان وراحت سے ہوئی

ہے یہ استقلال و ہمت کا ثبوت — آن جیسی تھی تری ویسی رہی
ہے دعا میری یہ صدق سوز سے — اجر کامل دے تجھے ربِّ غنی
ملک و ملّت کے لیے قربانیاں — ہوں تری مقبول باصد خرمی
ہو تری اولاد صالح اور سعید — اور حاصل ہو اسے علم علیؓ
دے اسے اللہ اپنے فضل سے — شوکت صدیقؓ و فاروقؓ وغنیؓ
اور ہو دنیا میں ان کا نصب عین — اتباع سنّتِ پیغمبری
جیل سے جانا مبارک ہو تجھے — تہنیت لے مخلصانہ اور دلی
یاں سے جاکر بھول مت جانا ہمیں — ہے یہی بس التماسِ آخری [1]

مسجد شہید گنج کا معاملہ:

۲۹ رجون ۱۹۳۵ء کو جب سکھوں کے ذریعہ مسجد شہید گنج مسمار کرایا گیا تو مسلمانوں میں ایک ہیجان کی صورت پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کی طرف سے حکومت پنجاب اور سکھوں کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حالات یہ ہوگئے کہ کچھ جگہوں پر پولیس نے لاٹھیاں برسائیں اور گولیاں بھی چلائی گئیں، جس کے نتیجے میں جانی نقصان ہوا اور بے شمار لوگ زخمی بھی ہوئے۔

کچھ ناعاقبت اندیش رہنماؤں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنا ووٹ بینک بنانے میں مشغول ہوگئے۔ مجلس احرار نے اس معاملے میں ہنگامہ آرائی مناسب نہیں سمجھا اور کنارہ کشی اختیار کرلی۔ احرار کا نظریہ تھا کہ لڑائی جھگڑوں سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا ہے بلکہ آپسی گفتگو سے ہی اس کا صحیح حل نکالا جاسکتا ہے۔ احرار کے پاس اس ضمن میں مضبوط دلیلیں تھیں۔ (آخری باب میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے)

مجلس احرار کے صدر کی حیثیت سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے کہا کہ! ''میں مسجد شہید گنج گرانے کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ڈالتا ہوں۔ اگر حکومت چاہے تو مسجد صبح نمودار ہونے سے پہلے مل سکتی ہے۔ اگر حکومت مجھے گرفتار کرے تو میں گرفتار ہونے کو تیار ہوں، تاکہ بات صاف ہوجائے۔ مسجد کا ملنا نہ ملنا حکومت کی مرضی پر منحصر ہے۔ باقی بات میں عدالت میں

---

[1] پندرہ روزہ الحبیب، مئی ۱۹۶۲ء ص: ۳۸

کروں گا اور ثابت کروں گا کہ مسجد گرانے میں حکومت کا کیوں کر ہاتھ ہے۔ حکومت اگر مجھے گرفتار کرنا چاہے تو میں اپنے دفتر میں اس کا انتظار کروں گا'' [1]

بہ ظاہر مسجد سکھوں کے ہاتھوں شہید کرائی گئی، لیکن یہ حکومت کی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کیا گیا تھا۔ اس لیے مولانا نے سکھوں پر مسجد گرانے کی ذمہ درای نہ ڈال کر حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور فرمایا کہ اگر حکومت اس سلسلے میں پوچھے گی تو میں جواب دے سکتا ہوں۔ ساتھ ساتھ مولانا نے حکومت کو دعوت دی کہ اگر حکومت چاہے تو مجھے گرفتار کر لے میں اپنے دفتر میں انتظار کروں گا۔

مولانا کا یہ آخری فقرہ سن کر مخالفین ششدر رہ گئے، مولانا نے رات کے دو بجے تک پولیس کا انتظار کیا لیکن کوئی بھی نہ آیا۔

مولانا کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت:

۲۶/اپریل ۱۹۳۶ء تاریخ برّصغیر میں مسلمانان ہند کے لیے نایاب دن تھا۔ جب کانگریس کے مقابلہ ملّت اسلامیہ کا فعال گروہ دہلی میں جمع ہوا۔ اگر صیاد کی نظر اس نومولود پودے کو نہ کھا جاتی تو ممکن تھا کہ یہی پودا تناور درخت بن کر برصغیر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا باعث ہوتا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی دعوت پر ہندوستان کے سیاسی جماعتوں کے تقریباً سبھی رہنما ۲۶/اپریل کو امپریل ہوٹل دہلی میں ان سے ملے اور یہ ملاقاتیں ۲۸/اپریل تک جاری رہیں۔ ۱۹۳۷ء میں ہونے والے الیکشن اور ملت اسلامیہ کی صحیح راہنمائی اس تمام گفتگو کا محور تھا۔

مولانا لدھیانوی جب محمد علی جناح سے ملاقات کے لیے گئے تو مختلف حالات پر گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران قائداعظم نے مولانا کو مسلم لیگ میں آنے کی دعوت دی۔ قائداعظم سے مولانا کی اس ملاقات کا تذکرہ عزیز الرحمٰن جامعی اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''اسی دوران میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب سے گفتگو شروع کی اور اس گفتگو میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو خاص طور سے مدعو کیا گیا۔ مسٹر جناح

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۲، ص: ۲۷

دہلی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اسی ہوٹل میں سر فیروز خان نون بھی تھے۔ صبح کو ۹ بجے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جناح صاحب سے گفتگو کرنے کے لیے گئے تو سر فیروز خان نون نے مولانا سے طنزاً کہا کہ جناح صاحب کو کامیاب کرائیے ..... مسٹر جناح نے بڑی کوشش کی کہ احرار کسی طرح مسلم لیگ میں آ جائیں۔ مسٹر جناح نے مولانا حبیب الرحمٰن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ مجھ سے مل جائیں تو میں ان سرکار پرستوں کو سزا دے سکتا ہوں۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ میدان عمل میں ٹھہر نہ سکیں گے اور ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ سیاست میں کسی پر سولہ آنہ یقین کرنا نہ صرف نادانی ہے، بلکہ سیاسی عدم تدبر کا ثبوت ہے'' [1]

قائد اعظم اس سے قبل بھی احرار رہنماؤں کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دے چکے تھے، لیکن احراریوں کی ایک شرط تھی کہ مسلم لیگ سے مرزائیوں کو جب تک الگ نہیں کیا جا سکتا احرار مسلم لیگ کا تعاون نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں قائد اعظم کا کہنا تھا کہ احرار مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں تو مرزائی خود بخود بھاگ جائیں گے۔

ایک نئی شق کا اضافہ:

۱۹۳۷ء کے الیکشن کی تیاریاں زوروں پر تھی۔ مسلم لیگ نے ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا، جس کے تحت تمام مسلم جماعتیں الیکشن لڑنے کو تیار تھیں۔ الیکشن میں بطور امیدوار حصہ لینے کے لیے حلف نامے بھی تیار کیے گئے۔ ان حلف ناموں میں دوسری شقوں کے علاوہ اسلامی اوقاف کی حفاظت اور مسجد شہید گنج کی واگذاری کو بھی شامل رکھا گیا۔ لیکن جب مجمع کے سامنے تمام حلف نامہ پڑھ کر سنایا گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اعتراض اٹھایا کہ اس میں ایک اور شق بڑھا دیا جائے کہ:

''مسلم لیگی امیدوار کو اقرار صالح کرنا چاہیے کہ وہ اسمبلی میں جا کر مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج کرا کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کی پوری کوشش کرے گا''

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۱۹۴

اس موقع میں مسلم لیگی پارلیمنٹری اجلاس میں کیا ہوا؟ اس کی روداد عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب اقبال کے آخری دو سال میں تحریر کرتے ہیں:

''سچی بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن نے نئی شق پیش کر کے ہمیں حیران ہی نہیں پریشان کر دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی شخص مرزائیت یا غیر مرزائیت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مسلم لیگ جیسی قومی اور سیاسی جماعت سے توقع رکھنا کہ مرزائیت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کرے، ایک لایعنی بات تھی''

اس اجلاس کی صدارت زماں مہدی خان کر رہے تھے۔ انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن سے کہا کہ بے سود جھگڑا نہ کیجیے۔ یہ نئی شق پیش کرنے کا یہاں کیا موقع محل ہے؟ اس پر مولانا حبیب الرحمٰن نے کہا، جس طرح مسجد شہید گنج کی بازیابی آج پنجاب کے تمام مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے، اسی طرح یہ بھی متفقہ مطالبہ ہے کہ مرزائیوں سے مسلمانوں کو خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں، تو چلیے اسی وقت ہم موچی دروازہ کے باغ میں ایک جلسہ عام کر کے مسلمانوں سے استصواب کرا لیتے ہیں۔

مولانا کی یہ رائے درست تھی۔ احرار نے سالہا سال کے پروپیگنڈے سے عام مسلمانوں میں مرزائیت کے خلاف سخت نفرت پیدا کر دی تھی۔ اگر اس امر سے متعلق کسی جلسہ عام میں استصواب کیا جاتا تو مسلمان یقیناً مرزائیت کے خلاف رائے دیتے۔ چنانچہ مجبوراً غلام رسول خاں کو حلف نامہ میں ایک نئی شق کا اضافہ کرنا پڑا۔ یعنی

''میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کی انتہائی کوشش کروں گا''۔ [1]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں، اقبال کے آخری دو سال، عاشق حسین بٹالوی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۸ء، طبع سوم، ص: ۲۴۲

چھٹی گرفتاری:

صوبہ پنجاب میں کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کے آپسی اتحاد اور مجلس احرار اسلام کے خلاف دونوں جماعتوں کے ہم آہنگ ہونے پر احرار رہنما خاموش نہ رہ سکے اور میدان میں آ گئے۔ کانگریس اور اس کی ہمنوا پارٹی کی طرف سے جگہ جگہ کھلے عام مجلس احرار پر نکتہ چینی کی جارہی تھی جس سے عوام میں اضطراب پھیلنے لگا۔ کانگریس کی تحریک مسلم ماس کنٹیکٹ کے راستے میں احرار آہنی دیوار تھی۔ جس کا توڑنا کانگریس کے لیے بے حد ضروری تھا۔

انہی وجوہات کے پیش نظر پنجاب کی یونینسٹ گورنمنٹ نے مجلس احرار پر لگام لگانا چاہا۔ اور سب سے پہلے حملہ کرتے ہوئے مجلس احرار اسلام کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کو لدھیانہ میں دفعہ ۱۵۳-۲۲۴ رتعزیرات ہند کے تحت حسب ذیل الزام لگاتے ہوئے گرفتار کرایا۔

(۱) فوجوں کے درمیان بغاوت

(۲) ہندوستان میں بغاوت

(۳) برطانوی حکومت کے خلاف نفرت

مولانا کے خلاف کیس کو مضبوط کرنے کے لیے مولانا کی تقریر کا وہ حصہ بھی عدالت میں پیش کیا گیا جو حکومت اور فوج میں بھرتی دینے کے متعلق تھا۔

ذیل میں مولانا کی تقریر کا خلاصہ دیا جاتا ہے، جس سے مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک خاکہ سامنے آتا ہے۔

> ”میری تقریر کی جو رپورٹ عدالت میں پیش کی گئی ہے وہ غلط ہے، اس میں بے ربط اور بے ترتیب جملے لکھے گئے ہیں۔ جس سے کوئی مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ میں مجلس احرار اسلام ہند کا صدر ہوں، میں عدم تشدد پر یقین رکھتا ہوں اور پورے بیس سال میں نے عدم تشدد کی تلقین کی ہے اور میرا یہ بھی یقین ہے کہ عدم تشدد کے ذریعہ سے ہی ہم مکمل آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ میرا یہ فرض

ہے کہ بطور مذہبی عالم کے مسلمانوں کو شرعی احکام بتادوں اور میرا پولیٹکل فرض یہ ہے کہ لوگوں کو سیاسی طور سے بیدار کروں۔ جمعۃ الوداع ۳۰ر ستمبر ۳۷ء اور عید الفطر ۵ر دسمبر ۳۷ء کے موقع پر میں نے تقریریں کی ہیں۔ یہ فقرہ جات غلط اور غیر مرتب ہیں۔ اصل فقرے یوں ہیں۔

۱۔ مسلم لیگ کے ممبر جو تم کو کانگریس کے نام پر الگ ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جنہوں نے پچھلی جنگ میں تم کو فوج میں بھرتی کرا کر ترکوں سے لڑایا تھا..... اس لیے یہ مسلمان جھوٹے ہیں تم ان کا مت اعتبار کرو۔

۲۔ تم یہ کہتے ہو کہ مجھے کانگریس نے روپیہ سے خرید لیا ہے۔ سب سے زیادہ روپیہ انگریز کے پاس ہے اور اس کے بعد مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد جناح اور راجہ محمود آباد کے پاس ہے۔ اگر میرا ایمان بازار میں بک سکتا ہے تو انگریز کو کہو کہ وہ میرے ایمان کو خرید لے، اگر وہ خرید سکتا ہے۔ انگریزوں کی ساری دولت ہی نہیں بلکہ ساری کائنات میرے ایمان کی قیمت نہیں ہوسکتی اور انگریز کی دولت کو تو میں جوتے کے تسمہ کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔

۳۔..... سنو! جو کچھ تم پیدا کرتے ہو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچتا، تم اپنے کھیت میں سونا پیدا کرتے ہو۔ لیکن یہ سونا تمہارے کام نہیں آتا، بلکہ ان لوگوں کے کام آتا ہے، جن کو تمہارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ وائسرائے سے لے کر ایک چپراسی تک کی تنخواہ تم پیدا کرتے ہو۔ اگر تم کو سمجھ آجائے کہ ووٹ کس طرح استعمال کیا جائے تو یہ سونا تمہارے بھی کام آنے لگے۔ میں تمہاری بھوک اور ننگے ہونے کا علاج نہیں کرسکتا، نہ کانگریس کرسکتی ہے۔ بلکہ جو قوت ووٹ ہم نے تم کو لے دی ہے اب وہی تمہارا علاج کرسکتی ہے.....۔

۴۔..... مجلس احرار کی اس لیے ضرورت ہے کہ تمام دنیا میں مسلمان بستے ہیں۔ اس لیے تمام دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردی کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے..... جب میں کانگریس میں ہوں تو صرف ہندوستانی ہوں اور جب میں مسلما ہوں تو بین الاقوامی ہوں۔

۵۔ میں اب آپ کے سامنے مسئلہ فلسطین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ فلسطین اس جگہ کو کہتے ہیں

جہاں بیت المقدس ہے۔ جہاں پر نبی ﷺ نے معراج کیا اور جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ یہ علاقہ بارہ سو برس تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، تم مسلمانوں نے گذشتہ جنگ میں ہلال کا جھنڈا اتار کر وہاں صلیب کا جھنڈا لگایا..... انگریز کی قوت اور یہود کی دولت یہ دونوں مل کر وہاں عربوں کو ہمیشہ کی غلامی پر مجبور کر رہے ہیں۔ ان کی ہمدردی کے لیے ہم کیا کریں .....ہم فلسطین کی امداد تین طریقے سے کر سکتے ہیں (۱) دربار تاج پوشی کا مقاطعہ (۲) انگریزی مال کا مقاطعہ (۳) آئندہ جنگ میں ہر قسم کی امداد کا مقاطعہ۔ اس لیے تمہیں فوج میں کبھی بھرتی نہیں ہونا چاہیے.....۔

سنو! تم مجھے کہتے ہو کہ میں کانگریس اور جواہر لال کو چھوڑ دوں اس لیے کہ جواہر لال دہریہ اور لامذہب ہے۔ جواہر لال دہریہ کہتا ہے فلسطین کے مسلمانوں کے خلاف بھرتی مت دو اور بیرونی مسلمانوں کے غلام بنانے کے لیے انگریزوں کی مدد نہ کرو۔ اور تمہارا بنایا ہوا مسلمان وزیر اعظم (پنجاب) لاہور میں وائسرائے کو بلا کر دربار کرتا ہے کہ ہم نے پچھلی جنگ میں پانچ لاکھ کے قریب بھرتی دی اور کہا کہ ہم آئندہ جنگ میں زیادہ سے زیادہ بھرتی دینے کو تیار ہیں ..... یہ لوگ اپنے آپ کو ہندو اور کانگریس کا دشمن کہتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے باہر اسلامی حکومتیں ہیں۔ جن کو تم غلام بنانے کے لیے جاؤ گے! وہاں ہندو اور سکھ نہیں بستے ہیں .....پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ ایک مومن جو ہم پر ہتھیار اٹھاتا ہے۔ وہ ہم میں سے نہیں۔

۶۔ تم ہندوؤں سے ڈرتے ہو کہ ہمیں کھا جائیں گے۔ ارے جو مرغے کی ایک ٹانگ نہیں کھا سکتا وہ تمہیں کیا کھا جائے گا۔ ڈرنا ہندوؤں کو چاہیے کہ تم سے کمزور ہیں۔ وہ صرف چھ صوبوں میں ہیں۔ تمام سرحدات پر تم رہتے ہو..... تمہارا دشمن ہندو نہیں ہے، بلکہ وہ ہے جس نے ہندوستان کی حکومت تمہارے ہاتھ سے چھین لی۔ اب اس حکومت کو واپس لینا بھی تمہارا فرض ہے۔

۷۔ اٹلی میں مسولینی، جرمن میں ہٹلر جو کہ دونوں میں سے ایک لوہار کا بیٹا اور ایک بڑھئی کا ہے۔ اگر جمہور کی امداد سے وہ ملک کے ڈکٹیٹر ہو سکتے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ تم میں سے کوئی

ایسا نکل آئے ۔ اپنے آپ کو عاجز ،نکما اور ذلیل مت خیال کرو ۔ممکن ہے تم میں ہٹلر اور مسولینی موجود ہو! پہلے خیال کو بلند کرو پھر عمل کا وقت آئے گا!۔

۸۔.....اگر تم مسلمان ہو تو کم از کم موجودہ حکومت سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرو اور اعلان کردو کہ ہم انگریزی حکومت سے خوش نہیں ہیں ۔تم کہتے ہو کہ یہ حکومت اسلام میں مداخلت نہیں کرتی ۔کیا شراب کی علانیہ فروخت ،زنا کی عام اجازت ،اسلام کے حکم کی مطابق ہے..... انگریزی حکومت کا یہ کہنا کہ ہم نے مذہب کی آزادی دے رکھی ہے غلط ہے ، بلکہ اس نے مذہب سے آزادی دے دی ہے۔

۹۔ انگریز پرست مسلمان ہر طرف یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے دشمن ہندو ہیں ۔ حالاں کہ اسلام اور مسلمان حکومت کو تباہ کرنے والی انگریز حکومت ہے ۔فلسطین پر آج کون ظلم کر رہا ہے ۔عراق کو کس نے تباہ کیا ہے ۔قبرص اور عمان پر کس کا قبضہ ہے ۔ایران وافغانستان کس سے تنگ آئے ہوئے ہیں ۔ترکی حکومت کو کس نے تباہ کیا ہے ۔صرف انگریز حکومت نے ۔مگر تمہاری مدد اور تمہارے روپیہ سے ۔ اگر تم ہندوستان کے مسلمان صرف خاموش ہو جاتے ۔یعنی بیرونی مسلمانوں کی نہ مخالفت کرتے نہ امداد ،تب بھی دنیائے اسلام انگریزی دست برد سے بچ جاتی .....۔

عدالت نے مولانا سے سوال کیا کہ یہ مقدمہ آپ پر کیوں چلایا گیا ہے اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

''میں موجودہ وزارت کے خلاف دوٹروں میں پروپیگنڈا کرتا ہوں ۔کیوں کہ میں اس وزارت کو ملک اور اسلام کے لیے خطرناک سمجھتا ہوں ۔اس قسم کی تقریریں میں نے پہلے بھی کی ہیں اور دوسرے صوبوں میں بھی کی ہیں ۔لیکن ان کے خلاف کوئی نوٹس نہیں لیا گیا ، میں اپنا قانونی حق سمجھتا ہوں کہ اس وزارت کے خلاف پروپیگنڈا کروں ۔ کیوں کہ جمہوری حکومت کو اس کے سوا بدلنے کا کوئی طریقہ نہیں'' [1]

---

[1] رئیس الاحرار ،عزیز الرحمٰن جامعی ،ص:۲۰۷-۲۰۲

رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی کے متذکرہ بالا بیان سن کر مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۲۴ر ختم کردی اور دفعہ ۱۵۳الف رہنے دی۔ اور مولانا کو ضمانت پر رہا کردیا۔

مجسٹریٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ:

فوجوں کی دفعہ اس وقت جائز سمجھی جاتی ہے، جب کوئی شخص فوج کے اندر جا کر فوج کو بغاوت کے لیے کہے۔ لیکن مولانا کی تقریر عوام میں ہے اور اس میں مذہبی رنگ زیادہ غالب ہے۔ مولانا کو مذہبی اور سیاسی طور پر اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا دفعہ ۱۵۳ر کے تحت آئندہ مقدمے کی سماعت ہوگی۔

مجسٹریٹ کے اس فیصلے کے خلاف حکومت پنجاب نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ جو خارج کردی گئی۔

بالآخر اس مقدمے میں مولانا اور ان کے صاحبزادے ۶ر اگست ۱۹۳۸ء کو بری کردیے گئے۔

آرمی بل کی مخالفت:

حکومت ہند نے برطانیہ کی امداد کے لیے آرمی بل پاس کیا۔ جس میں دوسری شقوں کے علاوہ ایک شق یہ بھی تھی کہ جو بھی فوج میں بھرتی کی مخالفت کرے اسے مجرم سمجھ کر دو سال کی سزا تجویز کی جائے۔ اس آرمی بل کی موافقت کرنے والوں میں جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے رہنما شامل تھے، وہیں مولانا لدھیانوی نے اس کی پرزور مخالفت کی اور پورے پنجاب میں ہنگامی دورے کیے۔ مولانا کے ساتھ احرار کارکن بھی اس عمل میں شریک تھے۔ حکومت پنجاب کی اطلاع کے مطابق تقریباً ۲۸۰ر جلسے منعقد کیے گیے۔ حکومت پنجاب (یونینسٹ گورنمنٹ) نے حکومت ہند کے پاس یہ اطلاع دی کہ مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کی جماعت مجلس احرار اس آرمی بل کی مخالفت میں پیش پیش ہے۔

مولانا لدھیانوی نے اس الزام کو قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''برطانوی حکومت اور اس کے حاشیہ نشینوں کو مطلع کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک بل نہیں، ایسے ہزار بل احرار رضا کاروں کے ایمان کو متزلزل نہیں کرسکتے اور نہ ہی مسلمانان ہندوستان کو

فوجی بھرتی کے خلاف اس کے ارادوں سے باز رکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ متوقع جنگ اقوام یورپ کی ہوس ملک گیری کی جنگ ہوگی، جس کا ہندوستان سے اور خاص کر ہندوستان کے مسلمان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

میں ایشیا اور مڈل ایسٹ کے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی بدحالی کو دیکھتے ہوئے بلا ہچکچاہٹ یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر یورپ میں دوسری جنگ عظیم ہوئی تو ہندوستان اور خصوصاً پنجاب کے مسلمان سے اس کا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہوگا''۔ [۱]

مولانا لدھیانوی نے مجلس احرار کے صدر ہونے کی حیثیت سے ۹ر ستمبر کو آرمی بل کے خلاف احتجاجی دن منانے کے لیے احراریوں کو حکم دیا۔ اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ فوری طور پر آرمی بل کو واپس لے لے۔

چنانچہ ۹ر ستمبر کو مجلس احرار کی طرف سے ملک بھر میں آرمی بل کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اور مولانا لدھیانوی کے مشورے پر احراریوں نے اپنے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھ کر آرمی بل کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

ساتویں گرفتاری:

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے پنجاب کے قریہ قریہ میں آرمی بل کے خلاف جس طرح ہنگامی دورے کیے اور حکومت کے خلاف لوگوں میں بیداری پیدا کی، یقینی تھا کہ حکومت مولانا پر اپنا شکنجہ تنگ کرتی۔ چوں کہ آرمی بل کی منظوری سے پنجاب زیادہ متاثر ہوا تھا۔ حکومت جانتی تھی کہ یہ صوبہ ہمارے لیے فوجی کھاد ہے۔ یہاں کے نوجوان پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کے کام آئے اور انہیں کی بدولت بلاد اسلامیہ پر یونین جیک لہرایا گیا۔ اس لیے حکومت اس راہ میں کسی رکاوٹ کو کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ خاص طور پر مولانا لدھیانوی کو جن کا انگریزوں سے ایک صدی سے جھگڑا چل رہا تھا۔

آرمی بل کے خلاف تقریر کرتے ہوئے مولانا نے جو رُخ اختیار کیا، اس سے سرکاری حلقوں میں

---

[۱] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۳، ص: ۳۸۷

اضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں یکم نومبر کو مولانا کو لدھیانہ سے ۱۲۴الف کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔

بظاہر حکومت نے اس گرفتاری کے جواز میں کہا:

''چوں کہ مولانا حبیب الرحمٰن کو ۱۹۳۷ء میں عدالت نے بری کر دیا تھا اور اس فیصلے کے خلاف حکومت نے اپیل کر رکھی تھی، اس کے منظور ہونے پر انہیں دوبارہ گرفتار کیا گیا ہے''

جب کہ حقیقت یہ نہیں تھی، کیوں کہ پچھلی مرتبہ جب مولانا کو رہا کیا گیا تو مجسٹریٹ نے رہا ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ مولانا نے فوج میں جا کر فوج کے خلاف تقریر نہیں کی بلکہ عوام کے سامنے تقریر کی تھی۔ اور بعینہ یہی صورت اس وقت بھی تھی۔ لیکن اس وقت فیصلہ کرنے والے حکومت کے آدمی تھے نہ کہ کوئی انصاف پرور مجسٹریٹ۔

دراصل مولانا کو آرمی بل کے خلاف بیان دینے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ لیکن حکومت کے پاس ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی بنا پر پچھلے مقدمہ کا سہارا لیا گیا۔ اس وقت مولانا تقریباً ایک سال جیل میں رہے۔

سول نافرمانی کے لیے ہندوستان کے عظیم رہنماؤں سے ملاقات:

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء کے شروع ہونے سے قبل ہر احرار رہنماؤں نے ہندوستان میں فوج میں بھرتی دینے کے خلاف جگہ جگہ جا کر کوششیں کی۔ اس سلسلے میں احرار کے بڑے بڑے لیڈران کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی گرفتاری کا واقعہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد مولانا لدھیانوی نے احرار کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور احرار ورکنگ کمیٹی کی پاس کردہ تجویز کے تحت سول نافرمانی کے لیے مولانا نے ہندوستان کے عظیم رہنماؤں سے ملاقات کی اور ان پر سول نافرمانی سے متعلق احرار کا نظریہ اور ہندوستان کی صورت حال ظاہر کی۔

اس سلسلے میں مولانا نے سب سے پہلے دہلی میں سبھاش چندر بوس سے ملاقات کی اور ان کے بعد مہاتما گاندھی سے ملے، جب وہ دہلی سے بمبئی کے لیے سفر کر رہے تھے تو مولانا دہلی سے فرید آباد تک

گاندھی جی کے ساتھ گئے اور ان کو احرار سول نافرمانی کا حال بتایا۔ گاندھی جی نے تحریک سول نافرمانی سے ہمدردی ظاہر کی۔ اس سفر میں مولانا نے گاندھی جی سے کہا۔ آپ کی وائسرائے سے بار بار ملاقات ہندوستان کی تحریک آزادی کو نقصان پہونچائے گی۔ جواب میں گاندھی جی نے فرمایا کہ میں وائسرائے کو اور انگریزی حکومت کو ایسی پوزیشن میں ڈالنا چاہتا ہوں کہ تحریک سول نافرمانی کا تمام الزام انگریز کے سر رہے۔ انتہائی نرم شرائط پر بھی اگر انگریز صلح کرنے پر تیار نہ ہوگا تو کانگریس سول نافرمانی کرنے میں حق بجانب ہوگی۔

مولانا لدھیانوی دہلی سے لوٹ کر لاہور پہونچے اور مولانا محمد داؤد غزنوی سے سارے مسئلے پر گفتگو کی۔ مولانا داؤد غزنوی نے چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر سے جیل میں ملاقات کی اور یہ بات طے ہوئی کہ گاندھی جی کی رہنمائی میں سول نافرمانی کی تحریک چلائی جائے۔ اس سلسلے میں مولانا لدھیانوی اور مولانا داؤد غزنوی واردھا جا کر مہاتما گاندھی، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے بات چیت کریں۔ چنانچہ حسب پروگرام دونوں حضرات نے واردھا پہونچ کر مولانا آزاد اور جواہر لال سے کانگریس احرار سول نافرمانی کی متحدہ محاذ کے متعلق تفصیلی گفتگو کی۔ پنڈت جی اور مولانا آزاد نے اس کی تائید کی اور ایک فارمولا بنایا، جس میں طے پایا کہ احرار سول نافرمانی مہاتما جی کی رہنمائی میں دے دی جائے اور مہاتما جی اعلان کریں کہ احرار کی سول نافرمانی جس میں ہزاروں والنٹیر جیل میں جا چکے ہیں وہ میرے پروگرام کے مطابق کانگریس کی سول نافرمانی سمجھی جائے۔

واردھا کے قیام کے دوران میں جب کہ آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ دونوں رہنماؤں نے کوشش کی کہ کسی طرح گاندھی جی سے ملاقات ہو جائے۔ مگر گاندھی جی کے سکریٹری نے گاندھی جی سے ملنے کا وقت نہ دیا اور مولانا آزاد نے جو فارمولا بنایا تھا اسے بھی گاندھی جی کو دکھانے سے انکار کر دیا۔

گاندھی جی سے ملاقات میں ناکامی کے بعد احرار کے دونوں رہنما لاہور پہونچے اور احرار کے رہنماؤں سے صلاح و مشورہ کے بعد مولانا لدھیانوی مولانا آزاد سے ملنے کے لیے الہٰ آباد گئے۔ جہاں مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور مولانا لدھیانوی کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا لدھیانوی

نے مولانا آزاد کے سامنے احرار کی طرف سے بنایا گیا فارمولا پیش کیا جسے مولانا آزاد نے منظور کرلیا اور یہ بات طے پائی کہ یکم جنوری ۱۹۴۱ء تک مولانا آزاد اور گاندھی جی احرار سول نافرمانی کے حق میں اعلان کردیں گے۔ اس اعلان کے بعد گاندھی جی کے پروگرام کے مطابق احرار رضا کار سول نافرمانی کریں گے۔ یہ گفتگو ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو ختم ہوئی اور انگریزی اخبارات میں اس گفتگو کا جو خلاصہ چھپا وہ یہ تھا۔

''حبیب آزاد کانفرنس الہ آباد میں احرار کی تحریک سول نافرمانی کے متعلق نہایت ہی اہم فیصلے ہوئے ہیں۔ احرار نے اپنی سول نافرمانی گاندھی جی کے ماتحت کردی ہے اور آئندہ پنجاب میں احرار گاندھی جی سے پروگرام لے کر سول نافرمانی کریں گے'' [1]

آخری گرفتاری:

تحریک سول نافرمانی کے سلسلے میں مولانا آزاد کے مذکورہ بالا بیان کے بعد حکومت ہند نے سوچا کہ اگر گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستانی مسلمانوں نے سول نافرمانی شروع کردی تو اس تحریک کو سنبھالنا ناممکن ہوجائے گا اس لیے فوری طور پر اس کے خلاف عملی قدم اٹھایا اور مولانا آزاد کو الہ آباد میں ۱۴ر دسمبر کو اور رفیع احمد قدوائی کو لکھنؤ سے گرفتار کیا۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو مولانا لدھیانوی، مولانا عبید اللہ سندھی، چودھری افضل اور ڈاکٹر عبدالقوی لقمان سے بات چیت میں مشغول تھے کہ پولیس کی ایک لاری آئی اور نظر بندی قانون کے تحت مولانا کو گرفتار کرکے منٹگمری جیل میں قید تنہائی میں بند کردیا۔ منٹگمری کے دوسرے سیاسی قیدیوں کو ایک عرصہ تک پتہ نہ چلا کہ مولانا بھی اس جیل میں آچکے ہیں۔

مولانا لدھیانوی کے جیل میں آنے کا واقعہ شورش کاشمیری جو منٹگمری جیل میں قید تھے تحریر کرتے ہیں:

''ایک اخلاقی قیدی جو ہماری خدمت پر مامور تھا، کمرہ میں دوڑا آیا اور کہا: لیجیے افغانستان کے ایک بڑے وزیر بھی قیدی بن کر آگئے ہیں ..... ہم سب نے تقریباً اس کی بات سنی ان سنی کردی ..... یوں بھی یہ بات کچھ جچتی نہیں تھی کہ افغانستان کا وزیر یہاں کیوں؟ بہرحال ایک بات تھی ہوگئی۔ کچھ دن گذرے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ بھئی آپ لوگوں کو مولانا حبیب الرحمٰن

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۲۲۹-۲۱۴

سلام کہتے ہیں۔احسن عثمانی نے جلدی میں پوچھا کیا ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں؟ کہا نہیں وہ تو ہفتہ عشرہ سے سرکاری مہمان ہیں۔''سرکاری مہمان ہیں''''جی ہاں'' یہیں سے یہ عقدہ کھلا کہ افغانستان کے وزیر ہونے کا اشتباہ بھی آپ ہی پر کیا گیا تھا'' [۱]

مولانا کی یہ نظر بندی مسلسل پانچ سال تک رہی۔اس دوران مختلف پریشانیاں سامنے آئیں۔ گورنمنٹ نے مولانا کے ساتھ اس مدت اسیری میں جس طرح کے ناروا سلوک کیے اور جس طرح کی پابندیوں اور سختیوں میں مولانا کو رکھا یہ حکومت ہند کے ظالمانہ فعل کا ایک بین ثبوت ہے۔مولانا کے ساتھ یہ امتیازی سلوک انتقامی جذبے کے تحت حکومت پنجاب کر رہی تھی۔

مولانا کے خاندان کے افراد جب ملنے کے لیے آتے تو انہیں ملاقات کے لیے جس طرح پیش کیا جاتا،اس کا ذکر عزیز الرحمٰن جامعی اس طرح کرتے ہیں:

''مولانا کے بچے جب جیل میں ملنے جاتے یا ان کے اہلیہ یا پردہ دار لڑکیاں ملنے جاتیں تو یہ ملاقات اس طرح ہوتی کہ ایک طرف گورنمنٹ کا سی آئی ڈی بیٹھا ہوتا،ایک طرف داروغہ جیل اور بیچ میں مولانا کی کرسی ہوتی اور سامنے مولانا کی اہلیہ اور لڑکیاں بیٹھی ہوتیں'' [۲]

مولانا کے گھر سے جو خطوط آتے اسے بھی صحیح حالت میں مولانا کے پاس پہونچنے نہیں دیا جاتا۔ ابتدا میں صرف السلام علیکم۔امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔بقیہ مضمون تراش لیا جاتا اور آخر میں ہم بھی خیریت سے ہیں۔والسلام۔کچھ دنوں بعد مولانا نے اس طرح کے خط لینے بند کر دیے اور حکومت پنجاب کو لکھ دیا کہ مجھے ایسے خطوں کی ضرورت نہیں گورنمنٹ ان خطوں کو تسکین قلب کے لیے اپنے ہی فائلوں میں رکھ لیا کرے۔مولانا کے اس عمل کے بعد سی آئی ڈی والوں نے خطوط کے کچھ فقروں کو تراش کر مولانا کو دینا شروع کیا مثلاً ایک خط اس طرح ہے۔

۷/اکتوبر ۱۹۴۱ء　　محترمی قبلہ والد صاحب　　السلام علیکم

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔معلوم ہوا تھا کہ آپ کو.....ہم سب دعاء کرتے ہیں کہ

---

[۱] درحدیث دیگراں،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۱۴۳

[۲] رئیس الاحرار،عزیز الرحمٰن جامعی،ص:۲۳۲

اللہ تعالیٰ ..... کچھ چیزیں جو آپ نے منگوائی تھیں وہ ارسال خدمت ہیں اور ..... والدہ صاحبہ کی طبیعت ٹھیک ہے لیکن ..... دادا صاحب قبلہ سلام کہتے ہیں اور انہوں نے آپ کی خدمت میں ..... آپ کے جواب آنے پر میں ..... آپ کے خط بھی ..... امید ہے آپ جواب دیں گے۔[1]

آپ کا بیٹا عزیز الرحمٰن

منٹگمری جیل میں مولانا تقریباً دو سال رہے۔ اس دوران مولانا کی صحت گرتی چلی گئی جس کی وجہ سے مجلس احرار کے کارکنوں نے آواز اٹھائی کہ مولانا کو وہاں سے تبدیل کیا جائے۔ حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ دو سال گذر جانے کے بعد پھر مولانا کو دھرم سالہ جیل میں منتقل کر دیا گیا، جہاں جا کر مولانا کی صحت مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ اس وقت بھی احراریوں نے احتجاجی خطوط لکھے۔ قراردادیں پاس کیں لیکن حکومت پنجاب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ حکومت کے اس رویہ کے خلاف جمعیۃ علماء ہند نے بھی اپنے اجلاس ۲۰، ۲۱، ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء میں ایک قرارداد پاس کی جو اس طرح ہے:

''یہ جلسہ خصوصیت کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی سابق صدر احرار اسلام کی نظر بند کے خلاف پرزور صدائے احتجاج بلند کرتا ہے، کیوں کہ وہ صحت کی خرابی اور آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا ہیں، حکومت کا فرض ہے کہ وہ مولانا کو جلد از جلد ان تکالیف سے آزاد کر کے اپنی نیک نیتی اور انسانی ہمدردی کا ثبوت بہم پہونچائے''[2]

اس موقع پر جب مجلس احرار نے ''یوم مولانا حبیب الرحمٰن'' منانے کا اعلان کیا تو حکومت پنجاب نیند سے بیدار ہوئی۔ لیکن مولانا کو آرام و راحت دینے کے بجائے ایک سوال نامہ بھیجا جو درج ذیل ہے۔

''(مولانا) آپ پرانے عادی مجرم ہیں۔ آپ کا پرانا ریکارڈ بتاتا ہے کہ آپ کئی دفعہ جیل کاٹ چکے ہیں۔ اس لیے حکومت ہند کیوں نہ مستقل طور پر آپ کو نظر بند رکھے ..... آپ کے تشدد پسندانہ طرز عمل سے ہمیشہ امن عامہ کو خطرہ رہا ہے۔ ملک معظم کی رعایا۔ فوج اور پولیس کے خلاف آپ نے ہمیشہ منافرت پھیلائی ہے۔ اس لیے بھی آپ کی نظر بندی ضروری ہے۔

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۲۳۲

[2] جمعیۃ علماء ہند، پروین روزینہ، ص: ۷۵۷

ان وجوہات کے خلاف اگر کوئی صفائی دینا چاہیں تو حکومت اس صفائی پر غور کر سکتی ہے''

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اس کے جواب میں فرمایا:

''میں حکومت کو مجرم سمجھتا ہوں۔ حکومت ہندوستانیوں کو گذشتہ سو سالوں سے تباہ کرتی چلی آئی ہے۔ غیر ملکی غلامی اور غیر ملکی تشدد کے خلاف بغاوت پھیلانا میرا فرض رہا ہے اور یہ میرا فرض حکومت کی نظر میں جرم ہے۔ میں نے ملک کی آزادی کے لیے بارہا جیل کاٹی ہے اور اب بھی ملک کی آزادی کے لیے نظر بند کیا گیا ہوں۔ جیل کا ایک قیدی خود حکومت ہندوستان کو غلام رکھنے کا عادی مجرم سمجھتا ہے۔ میں نے کبھی غیر ملکی حکومت کو حکومت تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی غیر ملکی حکومت کے بادشاہ کو بادشاہ تسلیم کرتا ہوں۔ فوج اور پولیس کو یہ بتانا میرا فرض رہا ہے کہ غیر ملکی حکومت کے لیے کام کرنا ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرنا ہے۔ امن عامہ کی تباہی کی ذمہ داری حکومت ہند پر ہے، جو ہندوستان سے زبردستی جنگ میں امداد لے رہی ہے۔ ہندوستان کا کوئی شہری جنگ میں امداد دینا پسند نہیں کرتا''

مولانا کے مذکورہ جواب پر حکومت پنجاب نے مولانا کو لکھا کہ آپ کا جواب نہایت گستاخانہ ہے۔ مولانا نے حکومت پنجاب کو پھر جواب دیا کہ:

''حکومت پنجاب کا سوال نامہ میرے جواب سے زیادہ گستاخانہ تھا''[1]

مولانا لدھیانوی کا خاندان ان کی بے میعاد نظر بندی سے سخت پریشان تھا۔ مولانا بیمار تھے اور بیماری ہی کے باعث دھرم سالہ جیل میں رکھے گئے تھے۔ ان دونوں مولانا کے گھریلو حالات بھی کچھ بہتر نہ تھے۔ ہر طرف سے کوششیں کی جارہی تھیں کہ مولانا کو رہا کر دیا جائے۔ لیکن سی آئی ڈی کی تیار کردہ رپورٹ کی بنا پر رہائی مانع رہی۔ احرار پر مولانا مظہر علی کا قبضہ تھا جن کے دل میں مولانا کی طرف سے گرہ پڑی ہوئی تھی۔ مولانا کے گھر والوں کا الزام تھا کہ مولانا کی نظر بندی میں طوالت کے ذمہ دار مولانا مظہر علی ہیں اور مولانا مظہر علی کہتا تھا کہ مولانا کی طویل نظر بندی کے ذمہ داران گھر والے ہیں، دوسرے وہ احرار کی وجہ سے نظر بند نہیں ہوئے، بلکہ ان کی نظر بندی مولانا آزاد کی وجہ سے ہے۔

---

[1] رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۲۳۵

اس طرح کے آپسی اختلافات نے مولانا کی نظر بندی کو مزید طویل کر دیا۔ بالآخر مولانا کے والد محترم مولانا محمد زکریا صاحب نے اپنے پوتے مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کو ایک دستی خط دے کر مولانا آزاد کے پاس بھیجا جو اس وقت شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے وہاں موجود تھے۔ مولانا آزاد نے خضر حیات صاحب سے گفتگو کی نتیجتاً ان کی رہائی کے احکام صادر ہو گئے۔

مولانا دھرم سالہ جیل سے رہائی کے بعد لدھیانہ جا رہے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر شورش کاشمیری اور دوسرے احرار رضا کار امرتسر اسٹیشن پر ان سے ملے۔ مولانا نے ہر ایک سے معانقہ کیا۔ سرگوشی فرمائی۔ مولانا مظہر علی نے کہا۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا ہے لاہور چلیں۔ مولانا لدھیانوی نے جواباً فرمایا کہ مولانا آزاد نے رہا کرایا ہے کل ان کا شکریہ ادا کرنے شملہ جا رہا ہوں۔

مولانا جب لدھیانہ اسٹیشن پر پہونچے تو زبردست استقبال کیا گیا۔ ایک جم غفیر امڈ آیا تھا، مولانا نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''آپ کی محبت کا شکریہ، مولانا ابوالکلام آزاد میرے مذہبی اور سیاسی پیشوا ہیں۔ میں شملہ جا رہا ہوں، ان سے مشورہ کے بعد ہی اس قابل ہوں گا کہ آپ سے کچھ کہہ سکوں.....''[1]

اس موقع پر مولانا آزاد نے مولانا عزیز الرحمٰن کے معرفت ایک خط مولانا زکریا کو بھیجا، جس میں مولانا لدھیانوی کی طویل نظر بندی اور ان کی قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''حبی فی اللہ۔ آپ کا خط ملا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی قربانیوں اور استقلال سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس دفعہ کی طویل نظر بندی میں تو وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اب وہ دو تین دن میں ہی رہا ہو جائیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ دفتر وکیل اخبار امرتسر کے بعد کلکتہ میں بھی ملے تھے۔ مجھے آپ کی ملاقات سے ہمیشہ مسرت ہوئی۔[2]

ابوالکلام۔ ۳؍جولائی ۱۹۴۰ء شملہ''

---

[1] بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل، شورش کاشمیری، ص: ۳۲۹

[2] صبح امید، عزیز الرحمٰن، ص: ۵

اب جب کہ مولانا پانچ برس کی نظر بندی کے بعد رہا ہو کر آئے تھے۔ مولانا کسی جماعت کے باقاعدہ ممبر نہیں بنے بلکہ آپ کی حیثیت مسلمانوں میں مختلف جماعتوں کے مخلص و معتمد مشیر کی رہی۔ ہندوستان جو کہ آزادی کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا ایسے نازک دور میں ہر جماعت کے لوگ مولانا سے ملتے اور اپنی اپنی جماعتوں کے لیے خاص مشورے لیتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں جب وزارتی مشن ہندوستان آیا اس وقت مولانا لدھیانوی نے احراری زعماء کے ساتھ مختلف ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں کیں تا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح صورت حال وزارتی مشن کے سامنے پیش کی جا سکے اور جب لارڈ ویول نے مسلم لیگ سے مایوس ہو کر کانگریس کو جمہوری بنیادوں پر حکومت بنانے کی دعوت دی تو کانگریس ہائی کمانڈ نے عارضی حکومت کی کیبنٹ میں احرار کی نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی۔ مولانا لدھیانوی اس شرکت کے لیے تیار تھے لیکن دوسرے احرار رہنما تیار نہیں ہوئے۔

استعفیٰ:

اب گرچہ مولانا مجلس احرار کے صدر نہیں تھے لیکن احرار کے پروگرام کے تحت کام کر رہے تھے۔ مولانا کی حیثیت اس وقت نائب صدر کی تھی کہ اچانک مولانا نے نائب صدارت اور احرار کی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ دینے کی وجوہات بظاہر کیا تھی یہ راز راز ہی رہا اور اس سلسلے میں مولانا لدھیانوی نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام جو خطوط تحریر کیے ہیں اس سے بھی کوئی اہم بات کھل کر سامنے نہیں آتی ہے۔ خطوط کا خلاصہ درج ذیل ہے:

> ''۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء کو مجلس احرار ہند کی مجلس عاملہ نے جس میں ۲۱ ممبران میں سے ۷ حاضر تھے، جس طریقہ کار کا اعلان کیا اور جس طریقہ سے اس کی تشریحات غیر ذمہ دارانہ طور پر اخبار آزاد کے ذریعہ سے کی گئی ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں ایسے حالات میں مجلس احرار کے دوستوں سے مل کر کام کرنے سے معذور ہوں، لہٰذا مجلس احرار کی نائب صدارت اور ابتدائی رکنیت سے علیحدہ ہوتا ہوں۔
>
> ماسٹر تاج الدین صاحب سے اس سلسلہ میں میں نے جو گفتگو کی تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ

اب تمہارے لیے استعفیٰ دینا ہی مناسب ہے۔ جن دوستوں اور جس جماعت کے لیے اپنی زندگی کی ہر متاع خرچ کردی، مجھے دکھ ہے کہ آج انہیں دوستوں نے مجھے جماعت سے علیحدہ ہونے پر مجبور کردیا''

دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''برادر مکرم ومحترم شاہ صاحب: السلام علیکم

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مجھے یاد ہے کہ سیاست میں آنے سے پہلے میرے اور آپ کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۴ء سے شروع ہوئے تھے۔ ۱۹۱۴ء سے آج تک میں نے پوری سچائی اور نیک نیتی کے ساتھ آپ کی دوستی کو نبھایا اور یہ کبھی امید نہ رکھی کہ دوست میرے متعلق آپ کو کیا کچھ کہتے رہے جس سے آپ کبھی متاثر ہوئے اور کبھی شدت کے ساتھ میرے مخالف دوستوں کی زبان بند کی۔

.....میں آپ سے جدا ہو رہا ہوں اس حال میں مجھے انتہائی دکھ اور رنج ہے، لیکن میں اپنی سیاسی رائے اور معلومات کی بنا پر ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا۔ مجھے مجلس احرار کے دوستوں سے نہ کوئی ذاتی گلہ ہے نہ رنج، بلکہ میں نے اپنی تشریحی چٹھی میں جو کچھ لکھا ہے وہ مجلس احرار کی مجموعی پالیسی اور احرار دوستوں کی بعض ایسی سیاسی آرا کی مخالفت کی ہے جن سے مجھے کسی حال میں بھی اتفاق نہیں ہوسکتا تھا۔

کاش اب یہ دوست آپ کے ساتھ رہیں، یا آپ ان کو اپنے ساتھ چلا سکیں، کیوں کہ میں واقعات کی بنا پر جانتا ہوں کہ زیادہ دنوں تک احرار کی گاڑی نہ چل سکے گی''۔

ماسٹر تاج الدین صاحب بھی دیرینہ دوست ہیں۔ انہوں نے اپنے مقاصد میں جس وقت مجھے چاہا مجھ سے کام لیا اور اب جب وہ خود آگے بڑھ کر کام کرنے لگے تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ مجھے مستعفی ہونے کا مشورہ دیں۔ مجھے ماسٹر صاحب کے اس طرز عمل پر کوئی شکوہ نہیں، وقت اور حالات خود بتادیں گے کہ ان کا طرز عمل صحیح تھا یا غلط۔

.....مجلس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی میرے اور آپ کے ذاتی تعلقات میں کمی نہ ہوگی اور

ہمیشہ یہ امید کروں گا کہ آپ بھی ذاتی تعلقات کو فراموش نہ کریں گے۔ والسلام [1]

مولانا کا یہ استعفیٰ نامہ ۳۱/ مارچ ۱۹۴۷ء کا تحریر کردہ ہے، اس کے بعد بھی مولانا قوم وملت کے لیے لگے رہے، خاص طور پر ۱۹۴۷ء کے وقت جو حالات پنجاب کے ہوئے اس وقت مولانا نے وہاں کے مسلمانوں کے لیے اہم خدمات انجام دیں۔ لیکن یہ خدمات سیاسی نہیں تھے بلکہ ملی اور قومی جذبے کے تحت کیے گئے تھے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی سیاسی زندگی جو دارالعلوم دیوبند سے شروع ہوئی تھی ۳۱/ مارچ ۱۹۴۷ء پر جا کر ختم ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

---

[1] درحدیث دیگراں، عزیز الرحمٰن جامعی، ص: ۳۴۷

باب پنجم

مولانا لدھیانوی اپنے مکاتب کی روشنی میں

کسی شخص کے افکار ونظریات اور ذاتی رجحانات اور اس کی حقیقی زندگی سے واقف ہونے کے لیے اس کی وہ تحریریں جو وہ اپنے اعزاء، رفقاء اور معاصرین کو مکتوب یا مراسلہ کی صورت میں لکھتا ہے اہم ذریعہ ہیں۔

خط وکتابت انسان کی حقیقی شکل وصورت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ خطوط کے ذریعہ اس کی ذاتی، گھریلو، معاشرتی اور سماجی زندگی اور سیاسی، مذہبی افکار کی عکاسی ہوتی ہے۔ خطوط کے ذریعہ انسان کے ان قلبی احوال اور کیفیات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے کسی ذریعہ سے ممکن نہیں، کیوں کہ وہ خطوط میں نہایت بے باکی یا بے تکلفی کے ساتھ اپنے احوال کو سپرد قلم کرتا ہے۔

چوں کہ لکھنے والے کو کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات وامکانات کبھی منظر عام پر آئیں گے، پھر ان میں بہت سے ایسے مکتوب الیہ ہوتے ہیں جو اس کے محرم اسرار اور عزیز دوست ہوتے ہیں، جن سے کوئی پردہ نہیں رہتا، اس لیے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس وپیش حوالہ قلم کر جاتا ہے، اس لیے آئینہ میں انسان ایسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ در حقیقت ہے۔

اردو میں غالب اور مولانا آزاد کے خطوط اور فارسی میں مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات اس صنف ادب میں تقدم زمانی کے ساتھ ساتھ حسن قبول کے اعتبار سے بجا طور پر سرفہرست ہیں، اس کے بعد متعدد اکابر ملت ومشاہیر ادب کے خطوط کے مجموعے شایع ہو کر مقبول عام ہوئے۔

مولانا لدھیانوی کی زندگی بے شک پاک وپاکیزہ تھی۔ بچپن، لڑکپن، نوجوانی، بھرپور جوانی اور بڑھاپے کے دور سے ہر ایک گذرتا ہے، ان کو بھی گذرنا پڑا کبھی طالب علم تھے، مضمون نگار ہوئے، پھر خطیب ومقرر ہوئے، مناظر اور متکلم اسلام ہوئے اور مکمل طور پر سیاسی، سماجی وملّی رہنما ہوئے۔ نشیب و فراز، پیچ وخم، جس طرح کہ بشری زندگی کا جزو ہوتے ہیں، اسی طرح ان کی پوری عکاسی ان کے خطوط میں

جا بجا موجود ہے۔نوجوانی کی عمر سے بڑھاپے کے سال تک جتنی منزلیں طے کی ہیں، سب کے نقشے ان میں آ گئے ہیں۔غم وغصّہ، صدمات، خانگی وعائلی زندگی، شوخی وظرافت، معاصرانہ چھیڑ چھاڑ، نوک جھونک، دینی حرارت، علمی سنجیدگی ومتانت، ناگواری، طنز، سیاسی وملّی چاشنی اور رزم وبزم، سب کی جھلکیاں مختصراً ان اوراق میں ملیں گی۔

مولانا کے تعلقات بہت وسیع تھے، اس لیے مراسلت کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا، وہ خطوط کے جواب پابندی اور مستعدی سے دیا کرتے تھے، اکثر وبیشتر خطوط بہت طویل ہوا کرتے اور خط لکھنے میں پہل بھی کیا کرتے تھے۔ بزرگوں، استاذوں، دوستوں، معاصروں، دینی وسیاسی رہنماؤں اور اپنے عزیزوں کو برابر خط وکتابت کے ذریعہ اپنے حالات سے آگاہ کرتے اور ان سے خیریت طلب کرتے۔ کسی کو صلاح و مشورہ، کہیں کسی کو ملک وملت کی فلاح وبہبودگی سے متعلق اور کہیں خانگی وعائلی زندگی جیسے اہم مسائل سے متعلق گفتگو کرتے۔ان میں بیش تر خطوط ضائع ہوگئے جو بچے وہ کتابوں کی زینت ہے۔

یہ باب مولانا لدھیانوی کے علمی وادبی وسیاسی خطوط اور تعزیت ناموں پر مشتمل ہے۔ان میں ان کا منفرد طرز نگارش اور انشاپردازی کا رنگ وآہنگ، نیز رعایت لفظی کا اہتمام پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ خطوط اس لحاظ سے بھی دلچسپ ہیں کہ مولانا اور مشاہیر سیاست داں، استاذ وشاگرد، پیر ومرید کے درمیان جو بے تکلف روابط وتعلقات تھے ان پر روشنی پڑتی ہے، تو دوسری طرف ان خطوط کی ادبی اہمیت بھی اجاگر ہوکر سامنے آتی ہے۔

مولانا کے اساتذہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی شخصیت ایسی ہے جن سے ان کو شاگردی کا شرف بھی حاصل رہا، ساتھ ہی سیاست کے گُر بھی برابر سکھلاتے رہے، عزت واحترام کے باوجود بعض مواقع پر تلخیاں، ناگواری اور نکتہ چینی کے نمونے خط سے عیاں ہیں۔ ان کو اپنے علم وبصیرت کے مطابق ان میں بہت سی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں اس کا اظہار انہوں نے اپنے خط میں کیا ہے۔

مولانا کے تعلقات گاندھی، نہرو، لیاقت علی خاں، جناح جیسے سیاسی رہنماؤں سے بڑے خوش گوار اور مخلصانہ تھے۔ان لوگوں سے سیاسی باتوں میں برابر اتار چڑھاؤ، نشیب وفراز ہوتا رہا، کبھی بڑے شگفتہ و مخلصانہ انداز میں اور کبھی ان کے برعکس بھی ہوا کرتا تھا۔ حالاں کہ وہ سیاست میں مدت العمر کانگریسی

رہے۔ پاکستان بننے کے شدید مخالف تھے، لیکن پاکستان بن جانے کے بعد وہاں کے رہنماؤں کو برابر صلاح ومشورہ والے خطوط لکھتے رہے۔

مولانا کو اپنے شیخ سے کامل محبت تھی، وہ بھی شیخ کامل حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری جن کی زندگی سنت مطہرہ کی پابندی میں گذری (ان سے بیعت کے بعد اطاعت واتباعِ شیخ میں ایسے غلو ہوئے کہ خود کو گویا شیخ میں فنا کردیا اور اپنے کو عامی مقلد کے درجہ پر رکھنے لگے) حالاں کہ مقام ومرتبہ کے لحاظ سے واقعتاً وہ بزرگ اور پیرومرشد تھے، مگر جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے گفتگو کرتا ہے، اسی طرح اپنے شیخ سے بھی خط وکتابت میں ہر قسم کی گھریلو باتیں کرتے اور ادبی، سیاسی، علمی ودینی بحثیں بھی اسی بے تکلفی اور گھریلو انداز میں ہوا کرتی تھیں۔

اخلاق وکردار میں مولانا شروع ہی سے بڑے سلیم الطبع، حلیم المزاج، سادگی پسند، قانع، منکسر و متواضع اور آخر میں ایک پیکر شرافت انسان بن کر رہ گئے تھے، مگر عقائد وخیالات اہل سنت والجماعت اور مسلک میں اپنے کو حنفی کہلانا پسند کرتے تھے۔

زیر نظر خطوط میں انہی باتوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، جس سے مولانا کے نظریات کے ساتھ ساتھ تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی کے مکتوبات:

مولانا شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز استاذ، مفسّرِ قرآن اور مسلم لیگ کے ہر دل عزیز تاسیسی رکن تھے، ان کی خدمات جلیلہ برصغیر کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی دارالعلوم کے فرزند رئیس الاحرار بھی تھے۔ آپ کی تعلیم وتربیت مولانا عثمانی سے ہوئی، پھر ہندوستانی سیاست کے روح رواں بنے، اس طرح اپنی زندگی شاگردی کے سانچے میں ڈھال کر اس کا حق بھی ادا کیا۔ ابتدا میں استاذ وشاگرد کا نظریہ یکساں تھا کہ کسی طرح ہندوستان کو غلامی کی طوق سے نکال کر آزاد اور ہندو مسلم اتحاد واتفاق پیدا کیا جائے، مگر جوں جوں ہندوستان کی آزادی قریب ہوتی نظر آئی استاذ وشاگرد کے نظریات میں بھی تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔ مولانا عثمانی مسلم لیگ کے حامی اور زبردست ترجمان بنے اور مولانا لدھیانوی

کانگریس کے اصول ونظریات کی حامی اور رکن رہے۔

اصول نظریات میں تبدیلی کی ایک خاص وجہ تھی۔ مولانا عثمانی چاہتے تھے کہ پاکستان کی صورت میں ایک ایسی اسلامی حکومت کا قیام ہو جہاں اسلامی قانون نافذ ہو اور مسلمان آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کرسکیں، بقول مولانا شبیر احمد عثمانی:

''آپ لوگوں نے اپنی قوم کا ساتھ دینے اور ان کی غلط کاریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے کھلم کھلا ایسا رویہ اختیار کرلیا جو قوم سے بے وفائی اور احکام شرعیہ سے لاپرواہی کی طرف مشعر ہے اور اپنے قوم کے بہترین احساسات اور صحیح نصب العین کو نہایت لاپرواہی سے بے سوچے سمجھے ٹھکرا رہے ہیں، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مستقبل میں آپ لوگوں کی مہلک غلطیوں کا خمیازہ حامل دین کو بھگتنا پڑا، تو میری ذات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے گی، کاش آپ سب حضرات دین داری اور سرفروشی کے سچے جذبے کے ساتھ اس سیاسی ادارے میں داخل ہوکر، جس کا دروازہ ہر مدعیٔ اسلام کے لیے ہر وقت کھلا ہوا ہے، سچائی کی طاقت اور جمہور مسلمین کی پشت پناہی سے اس پر قبضہ کرلینے اور بھیڑ بکریوں کے گلے کو بھیڑوں کی پاسبانی میں چھوڑ کر دوسری طرف نہ بھاگ جاتے تو اللہ کے فضل سے اس روزِ سیاہ کے دیکھنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا، جس کے تصور سے آپ گھبرا رہے ہیں.....''

مولانا عثمانی اپنے نظریات کے ثبوت میں بے شمار نظائر و دلائل پیش کررہے ہیں جو درجہ ذیل ہیں:

''وہ جماعت جو بے شمار سنّی مسلمانوں، قلیل التعداد شیعوں اور بزعم خود دعوائے اسلام رکھنے والے اور کلمہ پڑھنے والے ملحدوں یا زندیقیوں پر مشتمل ہوتے ہوئے، مسلم قوم کے استقلال اور کلمہ اسلام کی سربلندی کے نام پر لڑ رہی ہے، کیا اس کے مقابلے میں آپ اس جماعت کا تسلط واقتدار بڑھا کر اسلام کو سربلند اور مسلمانوں کو معزز اور علماء کو مؤقر بنائیں گے، جس میں اکثریت غالباً ان افراد کی ہے جو کلمہ اسلام سے اعلانیہ بے زار، حکومت الٰہیہ کے شدید ترین مخالف اور مسلمانوں کے قومی وسیاسی استقلال کے بدترین دشمن ہیں جن کی اسلام دشمنی برملا اور مکبّرات وقرأت ظاہر ہوچکی ہے اور اب بھی ظاہر ہورہی ہے، پھر وہاں دہریے بھی ہیں،

بلکہ ایک دہریہ ہی (پنڈت جواہر لال نہرو) آج کل اس پر مسٹر گاندھی کے بعد اقتدار رکھتا ہے اور قادیانی، شیعہ، مشرقی مغربی کسی کے لیے اس کا دروازہ بند نہیں .....''

مولانا عثمانی مسلم لیگ کا دفاع اور مسٹر جناح کی قیادت کا برملا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جناح عالم نہ سہی، خوش عقیدہ نہ سہی، محدث و مفسر نہ سہی، لیکن جو آئینی کشتی لڑی جارہی ہے اس کے داؤ پیچ سے خوب واقف ہے..... وہ اپنی دماغی قابلیت یا دوسرے تکونی اسباب کی بنا پر مسلم اکثریت کے قائد بن گئے'' (احقر کی رائے میں سیاست میں عالم دین اور غیر عالم دین کی جانشینی کی باتیں نہیں ہوتی بلکہ جس شخص میں قابلیت ہوگی وہ ہیرو اور قائد بن سکتا ہے) آخر حضرت شمویلؑ نبی کی موجودگی میں بنی اسرائیل کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو امیر لشکر بنایا تھا اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور دوسرے صحابہ کرام نے یزید بن معاویہ کی قیادت میں مدینہ وقیصر پر وہ چڑھائی کی جس کی بشارت صحیح بخاری میں آئی ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ آج کسی مفسر قرآن کی موجودگی میں مسٹر جناح کو قائد بنادینے سے کیا قیامت ٹوٹ پڑی ..... اس کی تاسیس کرنے والوں کی نیت کیا تھی اور اندرونی احوال کیا تھے، اس کا مجھے کوئی علم نہیں''

آگے مولانا عثمانی مولانا لدھیانوی کو ناصحانہ الفاظ میں کچھ اہم جملے تحریر کرتے ہیں:

''میرے بھائی! اپنے کو حد سے زیادہ ذہین وفہیم اور دوسروں کو بالکل الّو نہ سمجھیے۔ کسی ایک چیز غائب کو حاضر سے بہتر سمجھ لینا ہے۔ میں جس چیز کو پورے غور وفکر کے بعد بحمد اللہ شریعت کی روشنی میں صحیح سمجھتا ہوں، جب تک اس بنیادی اصول کی غلطی مجھ پر ظاہر نہ ہو، زوائد سے مطمئن نہیں ہوسکتا..... ایک آپ ہی کے خط کے ہر ہر لفظ اور سطر پر بحث کی جائے، تو خاصی کتاب تیار ہوجائے۔ یہ چند سطور قلم روک کر لکھی گئیں۔ امید ہے اسے پڑھ کر قدیم تعلقات کی نسبت کوئی برا اثر نہ لیں گے اور اگر یکسوئی کی ساعتوں میں ٹھنڈے دماغ سے غور کریں تو کیا بعید ہے کہ موجودہ حالات کے اعتبار سے صحیح راستہ سمجھ میں آجائے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کا قول ہے ''سچائی کا عاشق ایک دن میں سو مرتبہ بدل سکتا ہے اور ریاکار ایک ہی حالت پر سو برس جما رہتا ہے.....''

مولانا لدھیانوی کے جوابات:

رئیس الاحرار مولانا لدھیانوی نے اپنے خیالات ونظریات کو واضح کرنے کے ساتھ مولانا شبیر احمد کی تمام باتوں کا مفصل و مدلل جواب دیا ہے۔ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ تمام علماء دین کو ملک کی آزادی کے لیے کانگریسی کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے جان توڑ کوشش کرنی چاہیے، اس سے اتحاد بھی ہوگا اور قوت بھی بڑھے گی اور مسلمانوں میں جو انتشار و افتراق پیدا ہو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اپنے حقوق کو منوانے میں بھی آسانی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ تقسیم ہند کا نظریہ سرے سے غلط ہے۔ اس سے مسلمان ٹکڑے ٹکڑے میں بٹ جائے گا۔ اور جگہ جگہ مسلم آبادی خالی اور ویران ہو جائیں گی۔ ہماری مسجدیں غیروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی اور ہندوستان میں باقی ماندہ مسلمان ہل ہل جائیں گے۔ مزید یہ کہ مسلم لیگیوں کا ساتھ دینا سیکڑوں احباب کو بے گناہ قتل کرنے کے مترادف ہے۔

ذیل میں مولانا لدھیانوی کے خطوط کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں:

"آپ نے مجھ ہی کو نہیں بلکہ اپنے سیکڑوں بے غرض محبت کرنے والوں کو بے گناہ قتل کر دیا۔ جناح کی قیادت کا اعلان اور پاکستان کی حمایت سوائے قتل کے فتوے سے اور کن الفاظ سے تعبیر کروں۔ حضرت غور سے سنیے! یہ مسلم لیگی طبقہ کسی بھی عالم کا وقار اور اس کی عزت کو برداشت نہیں کر سکتا، یہ صرف اپنے اقتدار کو بڑھانے کے لیے اور مذہب کو مٹانے کے لیے مذہب کے نام پر آپ سب حضرات سے کام لے رہا ہے۔ یہ لوگ بس اتنا چاہتے ہیں کہ ملا مسجد کا امام ہو سکتا ہے اور قرآن کا ترجمہ و تفسیر بیان کر سکتا ہے، لیکن وہ سیاسی رہنما نہیں بن سکتا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ابوالکلام کانگریس کے صدر ہو کر بھی مذہب اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کانگریس کی صدارت سے لے کر دہریوں اور تمام غیر مذاہب ہی پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے اس غیر اسلامی ذہن رکھنے والے طبقے پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کا عالم اور صرف قرآن کا عالم جو جناح کی موجودہ تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، وہ اس دنیا میں بڑی سے بڑی سیاسی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں کہ جناح کو ہندوستان کا سیاسی لیڈر تسلیم کر لیا جائے، اس سے بڑا

دکھ ہوا ہے، گویا ہندوستان کے قرآن کے سب سے بڑے مفسر نے انگریزی داں طبقے کے سامنے اقرار کرلیا ہے کہ مولوی سیاست نہیں جانتا اور یہ بھی اقرار کرلیا کہ، وقت کی سیاست کو قرآن کا مفسر نہ چلاسکتا تھا، نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ علماء کے قتل کا فتوی نہیں تو اور کیا ہے..... آپ نے لفظ بدلحاظی کا تحریر فرما کر مجھے بہت دکھ پہونچایا۔ میری بدلحاظی کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے سہارنپور کے جلسے میں آپ کے اس بیان کا ذکر کرتے ہوئے یہ لفظ کہے ہیں کہ ''میں علامہ شبیر احمد صاحب کے جوتوں کو اپنے سر پر رکھنا باعث فخر سمجھتا ہوں'' آپ نے مجھے جناح خیال فرمالیا ہے کہ میں اپنے سے اختلاف رکھنے والے کو گالی دوں اور ان کی بے عزتی کروں۔ میں نے آج تک اپنی تقریر میں معمولی سے معمولی لیگی کے متعلق سخت بات نہیں کہی چہ جائیکہ آپ جیسی بزرگ ہستی کے متعلق کوئی بات کہوں یا دل میں بھی لاؤں.....''

حقیقت یہ ہے کہ دونوں زعماء، قوم وملت کے مخلص بہی خواہ تھے، دونوں کی نیتیں بھی درست تھیں، مگر اختلافات کی اصل بنیاد تقسیم ہند اور مسلم لیگی قیادت کو تسلیم کرنا تھا۔ چوں کہ مولانا عثمانی کا اجتہاد یہ تھا کہ دوقومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیم ہند کی آواز اٹھا کر پاکستان کا مطالبہ کرنا بالکل درست ہے۔ اس سے یہاں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جاسکے گا۔ حالاں کہ ہندو انتہا پسند طبقہ بھی یہی چاہتا تھا، جن میں سردار پٹیل وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت اگر کوئی شخص تبدیل کرسکتا ہے تو وہ صلاحیت صرف جناح کے اندر موجود ہے، اس لیے تحریک پاکستان کے قائد کی حیثیت سے جناح کو تسلیم کرلیا جائے اور جناح کو ایک چھوٹا سا علاقہ دے کر پورے طور پر ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کرلی جائے۔

جہاں تک مسلم لیگی اور جناح کی قیادت سے متعلق مولانا لدھیانوی کا یہ فرمانا کہ یہ جماعت علماء کو ضرورت کے تحت اپنے قریب لاتی ہے، کانگریس پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کہ کانگریس نے بھی مسلم رہنماؤں یا علماء کرام کی عزت و وقعت اس وقت تک سمجھی جب تک کہ ان کو ضرورت تھی، مولانا لدھیانوی جناح کی قائدانہ صلاحیت کے منکر نہیں تھے، وہ بھی ان کو لیڈر تسلیم کرتے تھے، مگر اختلاف دراصل تقسیم ہند کے مسئلہ پر تھا۔ اس بارے میں ان کا نظریہ بالکل دوٹوک اور واضح تھا، کہ اگر پاکستان بنا تو ہندوستانی

مسلمان کمزور ہوکر ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے اور ہندوستان میں اقامت کرنے والے مسلمانوں کے لیے اپنی شناخت باقی رکھنا دشوار ہوجائے گا۔ آزادی ہند کے بعد سے جو حالات ہندوستان میں وقتاً فوقتاً رونما ہورہے ہیں وہ مولانا کے خیالات ونظریات کی پوری تائید کرتے ہیں''۔

مولانا لدھیانوی اور گاندھی جی کے درمیان خط وکتابت:

ذیل میں دونوں عظیم رہنماؤں کے مابین تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے متعلق جو خط وکتابت ہوئی ہیں اسے تحریر کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی کا خط:

بھائی حبیب الرحمٰن۔

''آپ کا خط اور اخبار کی کٹنگ ملی۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ میرے لکھنے کا غلط مطلب نکال کر لکھا ہے۔ ہریجن پڑھیے تو آپ کو خود معلوم ہوجائے گا کہ میں نے دراصل کیا لکھا ہے''

آپ کا م۔ک۔گاندھی''

مولانا لدھیانوی کا جواب:

''محترم مہاتما جی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ جن دعاؤں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا وہ دوسرے پرچہ پر ارسال ہیں۔ کل آپ کا بیان پڑھا کہ آپ مسٹر جناح کو پھر پاکستان دینے کو تیار ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کو جناح سے گجراتی ہم وطن ہونے کی وجہ سے بہت محبت ہے، اس لیے آپ ان کو بھول نہیں سکتے ..... جب سے پاکستان کا ریزولیشن مسلم لیگ نے منظور کیا ہے، اسی وقت سے آپ یہ فرمارہے ہیں کہ۔ اگر مسلمان چاہیں تو ان کو پاکستان دیا جائے گا..... آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان صوبے الگ ہوجائیں اور ہندو سات صوبوں کی مضبوط گورنمنٹ آسانی سے بن سکے، تاکہ مسلمانوں کے مطالبات کا قصہ ختم ہوجائے .....حالات کی مجبوری نے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا کردیا۔ خدائے پاک ہم سب کو صحیح

سوچنے اور سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے .....''

گاندھی جی کے خط سے کوئی بات آشکارا نہیں ہوتی ، البتہ مولانا لدھیانوی کے خط میں اس بات کی نشاندہی موجود ہے کہ گاندھی جی دوقومی نظریہ کے بانی مسٹر جناح کو سب سے بڑا لیڈر تسلیم کرتے ہوئے ان کے مطالبات کے سامنے بے بس ہوجاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مولانا لدھیانوی کا یہ فرمانا کہ آپ کو جناح سے گجراتی ہم وطن ہونے کی وجہ سے بہت محبت ہے یہ کہنا تو صحیح ہوسکتا ہے مگر اس کا تقسیم ہند سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ ہاں مولانا کا یہ الزام کہ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان صوبے الگ ہوجائیں اور مسلمانوں کے مطالبات کا قصہ ختم ہوجائے یہ بالکل درست ہے اور اسی نظریہ کے تحت گاندھی جی نے مسٹر جناح کے مطالبات پاکستان کی شکل میں پورے کیے۔

مولانا آزاد کے نام خطوط:

مولانا آزاد کانگریس کے صدر اور ہر دل عزیز رہنما تھے۔ اور مولانا لدھیانوی مجلس احرار اسلام کے صدر اور کانگریس کے اہم رکن رکین تھے۔ اس لیے مولانا لدھیانوی نے مولانا آزاد سے اپنے خطوط میں کانگریس کے مسائل کے ساتھ ساتھ مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔ چوں کہ مولانا لدھیانوی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر مولانا آزاد سے پیش آمدہ مسائل پر گفتگو کی جائے تو مولانا آزاد ان مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ذیل میں ان امور سے متعلق مولانا لدھیانوی کے خطوط کے اہم اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

(۱) پنجاب میں رشوت ستانی پہلے سے زیادہ ہے۔ محکمہ سول سپلائی۔ اور محکمہ راشنگ میں بھی تو رشوت خاص طور پر بڑھ گئی ہے۔

(۲) مولانا عبدالرحمٰن میانوی پر جو ظلم ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ ان پر ایک جھوٹا فرضی کیس چلایا گیا لیکن کسی کانگریسی نے ان کی شنوائی نہیں کی۔

(۳) جالندھر شہر میں تین مسجدوں کے بیچ سینما ہال بننے کی اجازت دی گئی۔

(۴) کانگریسی مسلمان جو ۱۹۳۵ء کی کانگریسی تحریک میں شامل ہوکر تباہ و برباد ہوگئے، ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے ایسے لوگوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔

(۵) لدھیانہ شہر میں عید کے دن جو واقعہ پیش آیا اگر وہ دس سال پہلے پیش آتا تو بغاوت ہو جاتی۔ کانگریسی وزراء یہ سمجھتے ہیں کہ حصول حکومت کے بعد ان کو اپنے پرانے سیاسی دوستوں کی ضرورت نہیں رہی، نئے ٹوڈی ان کو مل گئے ہیں۔

مولانا لدھیانوی ان مسائل کو لکھنے کے بعد پھر مولانا آزاد کو مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اگر سرحدی وزراء کی طرح حکومت میں اپنے دوستوں سے مشورہ لیا جائے تو تمام مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے اور تمام کام آسانی سے ہوسکتے ہیں۔ ان تمام واقعات پر آپ کی فوری مداخلت کی ضرورت ہے، اگر آپ نے اس پر توجہ نہ فرمائی اور افسران کو سزا نہ ملی تو آزاد خیال علماء بالخصوص اور آزاد خیال عوام کو بالعموم عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے گا۔

مولانا لکھتے ہیں:

(۶) کانگریس کے اندر اب آپ کی پالیسی کیا ہے۔ عام خیال کیا جاتا ہے کہ آپ سوشلسٹوں کے ساتھ ہیں۔ کانگریس کی صدارت کے لیے آپ کے نام کا پیش ہونا اور جے پرکاش نرائن کی تائید کرنا اور باقی کانگریسی ورکنگ کمیٹی کے ممبران کا خاموش رہنا خصوصاً پنڈت نہرو کا.....۔

مولانا آزاد کے نزدیک مولانا لدھیانوی کے خطوط کی بہت اہمیت تھی، یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد ان خطوط کے جوابات فوری دیتے، جس میں ہندوستان کے مختلف مسائل زیر غور ہوتے، بعض مسائل پر مولانا لدھیانوی سے مشورہ بھی لیتے، بعض اہم امور کو مولانا کی صواب دید پر چھوڑ دیتے اور بعض چیزوں کے متعلق مشورہ بھی دیتے رہتے۔ ذیل میں مولانا آزاد کے خطوط تحریر کیے جاتے ہیں جس میں مولانا لدھیانوی کے خطوط کے جوابات بھی ہیں اور بعض امور سے متعلق مشورہ بھی:

''خیال تھا کہ لاہور میں آپ سے ملاقات ہوگی، سرِ دست لاہور کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا، اب ستمبر کے آخر میں قصد کروں گا۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔

آپ نے پنجاب کانگریس کی جو حالت لکھی ہے وہ میں بھی محسوس کر رہا ہوں، لیکن بحالت موجودہ اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ نئی کمیٹیوں کے بننے کا انتظار کیا جائے۔

آپ کے سامنے جو بھی صورت حال ہو وہ بلا تامل لکھتے رہیے، حتی الوسع کوشش عمل میں آئے گی،

نیز انشاء اللہ بوقت فرصت میں آپ کو بعض امور کی نسبت لکھوں گا جو پیش نہاد خاطر ہیں''

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی چوں کہ ایک عالم دین اور سیاسی رہنما تھے ان کا خط بڑا تفصیلی اور مدلل ہوا کرتا تھا۔ لیکن مولانا آزاد ایک منجھے ہوئے سیاسی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا جواب دو چار لفظوں میں ہوا کرتا، مگر بات مکمل ہو جاتی۔ مولانا لدھیانوی کے تحریر کردہ مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں رہنماؤں کا مزاج الگ اور نقطہ نظر و نقطہ نگاہ تقریباً ایک ہی تھا۔ کوئی بھی علم دوست آدمی خواہ کہیں بھی تھا وہ ملک کی بہبودی اور حیات ملی کے بارے میں اپنی فہم و فراست کے متعلق ایک ہی رائے رکھتا تھا۔ یہی حال دونوں رہنماؤں کا تھا۔

پنڈت نہرو اور مولانا حبیب الرحمٰن کے خط و کتابت:

مولانا لدھیانوی نے سیاسی حالات اور ملک و قوم کی بہی خواہی کے لیے پنڈت نہرو کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں ایک طرف مولانا کا سیاسی کردار، حالات حاضرہ پر گہری واقفیت اور دینی علوم سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف کانگریس کا رویہ کانگریسی مسلمانوں کے تئیں کس طرح کا تھا اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کی کانگریس کے لیے بارہا قربانیوں کے باوجود جس طرح سے ہنگامہ آرائی کی جارہی تھی کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس ہنگامہ کے پیچھے کیا اسباب ہیں، اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ پھر پنڈت نہرو کی طرف سے لگائے گئے الزامات جو مجلس احرار کے سلسلے میں ہے، اس کے بھی جواب دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی کانگریس کے تئیں اپنا نظریہ بھی پنڈت جی پر واضح کرتے ہیں۔ ذیل میں مولانا کے خطوط کے کچھ اہم حصے نقل کیے جاتے ہیں تاکہ مولانا کے سیاسی سوجھ بوجھ پر روشنی پڑ سکے:

''پیارے پنڈت جی۔ تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ پہونچا، یاد آوری کا شکریہ۔ آپ نے اپنے خط میں مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کے مجھے آپ کے کس طرز عمل سے شکایت ہے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں، البتہ آپ جیسے حضرات جو ہندوستان کی آزادی کے علم بردار ہیں، بے ضرورت غلطیاں کرتے ہیں تو مجھے دکھ ضرور ہوتا ہے، ..... ہندوستان میں یہ شور مچایا جارہا ہے کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس ہنگامے کے دو مقاصد

ہیں۔ انگریز دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہ رہا ہے کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے اور ہندو اس لیے کہہ رہا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کو آزادی کی لڑائی میں برابر شریک رکھیں، لیکن جب ملکی حقوق کی بازیابی اور تقسیم کا وقت ہو تو ہم ان سے یہ کہیں کہ مسلمان نے وطن کی آزادی میں حصہ نہیں لیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہندوؤں کی ان تمام غلط کاریوں کے باوجود مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کانگریس میں شریک رکھیں۔ حالاں کہ میرے لیے وطن کی آزادی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

فرقہ وارانہ تصفیہ کے خلاف جو پروپیگنڈہ ہو رہا ہے اسے پڑھ کر حیرت ہوئی۔ لکھنؤ میں نہرو رپورٹ کی صورت میں جو تصفیہ ہوا، مگر گاندھی جی نے سکھوں اور دیگر فرقوں کو خوش کرنے کی غرض سے اس کو دریائے راوی میں پھینک دیے۔ حالاں کہ مسلم عوام وعلماء نے اس تصفیہ کے وقت اپنے فرقوں سے بازاروں میں پتھر کھائے (اشارہ احرار کارکن کی طرف ہے) گالیاں سنیں، مگر ان کو پھینکتے وقت مشورہ تک نہیں لیا۔ گاندھی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حصہ لینے لندن گئے، اس وقت لوگوں نے اور ہم نے بھی منع کیا، مگر وہ دنیا میں نہ کسی کی سننے والے ہیں اور نہ ماننے والے۔..... بہر حال جو نقصان ہونا تھا وہ ہوا..... پنڈت مالویہ جی سے لے کر ان کے پارٹی کے تمام اراکین اور اخبارات نے یہ کہا کہ پنجاب اور بنگال میں اسلامی راج ہوگا۔ میرا یقین تو یہ تھا کہ آپ اس خیال سے علاحدہ رہیں گے، کیوں کہ جو شخص ہندوستان کے لیے مکمل آزادی چاہتا ہے اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے، انگریز ہندوستان کو کیا دیتا ہے کیا نہیں۔ اس کا تو ایک ہی کام ہے کہ بدیشی طاقت کسی طرح یہاں سے چلی جائے۔

آپ سے یہ صدمہ پہونچا ہے کہ آپ نے کمیونل ایوارڈ کے سلسلے میں کانگریس میں تبدیلی پیدا کی اور اس کے سامنے جھکے جو وطن کی آزادی کے ساتھ ہندو راج کا خواب دیکھ رہی ہے۔ اس ایوارڈ کے مسترد کرنے کے کیا معنی ہیں، آیا ہم انگریز سے کہیں کہ وہ دوبارہ ہمارے لیے کوئی تصفیہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اقوام ہند کسی باہمی تصفیہ پر پہونچیں۔ اگر بدیشی حکومت کوئی فیصلہ کرتی ہے تو وہ ہندوستانی مفاد کے خلاف ہوگا اور اگر ہم تصفیہ کریں تو وہ پہلے

ہو جانا چاہیے۔..... سچے کانگریسی کا یہ فرض ہے کہ عوام الناس میں سچی آزادی کی تڑپ پیدا کرے۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں وطن کی آزادی کے لیے مسلمانوں کو ہندو راج پر بھی راضی کرلوں۔ کیوں کہ میرے نزدیک ہندوستان میں کون سی اسلامی حکومت ہے، جو ہندو راج کے ہونے سے چلی جائے گی.....''

دوسرے خط میں مولانا اپنی پارٹی مجلس احرار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ نے اپنی کتاب میں احرار پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں کی ایک بہترین جماعت تھی، لیکن کراچی کانگریس میں ایک مسلمان کے ورکنگ کمیٹی ممبر بنانے پر یہ جماعت کانگریس سے الگ ہوگئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی تہہ میں کچھ اور بھی تھا۔ جو کچھ بھی آپ نے ہمارے متعلق لکھا وہ غلط اطلاعات پر مبنی ہے، مجلس احرار ۱۹۲۹ء میں کانگریس کیمپ لاہور میں بنائی گئی تھی۔.....جس مسلمان کی مخالفت کی گئی تھی وہ کسی ذاتی اغراض یا شخصی عداوت پر نہیں، بلکہ پارٹی دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتی تھی کہ یہ شخص اس کا اہل نہیں..... پنجاب میں کانگریس کے الیکشن ہوئے اس میں ہماری جماعت سے بڑھ کر کسی نے کام نہیں کیا۔.....انتخاب کے سلسلہ میں میں اور میری جماعت نے مسلسل اور صاف طور پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف جانے کا مشورہ دیا.....پنجاب میں کانگریس کمیٹی کا سالانہ انتخاب جس انداز پر ہوتا ہے یا ممبر بنائے جاتے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے کہ نہ اخباروں میں اعلان ہوتا ہے اور نہ اطلاع دی جاتی ہے، حالاں کہ ممبری کے کچھ شرائط ہونی چاہیے، بلکہ مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ جب میں نے ممبری کے فارم مانگے تو کانگریسی ممبر فارم تک مجھے نہیں دیے.....''

مزید ایک خط میں مولانا نیشنلسٹ مسلمانوں کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''آپ نے اپنی کتاب ''میری کہانی'' میں لکھا ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان آہستہ آہستہ مٹ گئے، مگر آپ نے کبھی غور کیا کہ اس کو کس نے ختم کیا.....آپ نے مسلم لیگ اور رجعت پسند طاقتوں کو مسلمانوں کا نمائندہ سمجھ کر ہمیشہ ان سے بات کی۔ آپ نے مسلم لیگی کی پارٹیاں لیں، جس کی بنا پر عام مسلمان اور حکومت یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ مسلمانوں کی نمائندہ

مسلم لیگ ہے، جمعیۃ علماء، مجلس احرار اور آزاد خیال مسلمان نہیں۔

حافظ ابراہیم کے الیکشن میں آپ نے ہم سب کو بلایا اور کامیابی کے بعد نواب اسماعیل کے جواب میں آپ نے یہ لکھا کہ انتخاب میں جو سخت کلامی یا زیادتی ہوئی ہے وہ احرار اور جمعیۃ کے کارکنوں نے کی ہے''

مولانا لدھیانوی کا خط نواب زادہ لیاقت علی خان کے نام:

مولانا لدھیانوی کے تعلقات لیاقت علی خان سے بڑے گہرے تھے، اسی گہرے تعلقات کی بنا پر مولانا انہیں بعض اصولوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انہیں حل کروانے کی جدوجہد بھی کرتے ہیں۔ لیاقت علی خان (وزیر اعظم پاکستان) اپنے وفود کے ساتھ جب ہندوستان کے دورے پر آئے تو مولانا کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اظہارِ تشکّر کے ساتھ لکھتے ہیں

''آپ جس مشن پر ہندوستان آئے ہیں خدا کرے وہ کامیابی کی منزلیں طے کرے، اس لیے بیان کرنے کے واسطے مجھے الفاظ نہیں ملتے، آپ کے ہاتھوں میں کڑوروں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہونا ہے، بحیثیت ایک مسلمان کے میرا دل چاہتا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لیے ہر قیمت پر عملی طور پر ایسا امن و انصاف قائم ہو جائے جس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اسلام اور ظلم کی حکومت دو مترادف الفاظ ہیں، اگر کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ اسلامی حکومت میں ظلم و زیادتی ہے تو میرا دل و جگر زخمی ہو جاتا ہے، میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ اسلامی حکومت امن و انصاف اور رحمت کی حکومت ہے۔ آپ وہاں ہندوؤں کو اسلامی عدل و انصاف کے مطابق ایسے حقوق دیں جس سے یہاں کی غیر مذہبی حکومت رشک کرنے لگیں۔

ہندوستان اور پاکستان مل بیٹھ کر ایک ایسا لائحۂ عمل تیار کریں کہ دونوں ملک برِّ صغیر کی رہنمائی کر سکیں اور جنوب و مشرق کے ممالک کو تیسری جنگ عظیم سے بچا سکیں، اس ضمن میں چند نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔

ا۔ موجودہ معاہدے اور فیصلے کے بعد یہاں سے یا پاکستان پہونچ کر مغربی پنجاب سندھ سرحد کے ان

غیر مسلموں کے متعلق بھی جو ۱۹۴۷ء میں تباہ و برباد ہوئے تھے، ایک ہمدردانہ بیان دیں جس سے مستقبل قریب میں ان غیر مسلموں کو بھی پاکستان آنے جانے کی امید پیدا ہو جائے۔

۲۔ ہندوستان میں رہنے والے لاکھوں شرنارتھی ایسے ہیں جو صدق دل سے پاکستان کو اپنا وطن بنانے پر راضی ہیں۔ ان میں نہ شرارت کا جذبہ ہے اور نہ بغاوت کا۔

۳۔ پاکستان میں ہندوستان کے ملے جلے دوستانہ مشنوں کے خیر مقدم کی فضا پیدا کی جائے۔

۴۔ پاکستانی پریس اسلامی طرز اختیار کرے اور دنیا کے ہر شخص کے لیے امن چاہے۔

۵۔ آپس میں جنگ نہ کرنے کا اعلان اسی دوستانہ فضا میں اگر ہو جائے تو دونوں ملکوں کے لیے باعث رحمت ہے۔

۶۔ کشمیر مسئلہ اسی طرح دوستانہ کانفرنس بلا کر حل کیا جائے۔

۷۔ پاکستان اگر ہندوستان کی دوستی حاصل کرے تو وہ دنیا کی تاریخ بدل سکتا ہے۔

۸ پاکستان میں اسلام کے نام پر اقلیت کے لیے ایسے حقوق و اختیارات دینے کا اعلان کیا جائے، جس سے دنیا کے غیر اسلامی ممالک بھی رشک کریں۔

۹۔ ہندوستان و پاکستان میں آزادانہ تجارت کا معاہدہ فوری ہونا چاہیے۔

۱۰۔ پرمٹ سسٹم کی بجائے پاسپورٹ کا طریقہ رائج کیا جائے.....۔

۱۱۔ نکاسی جائیدادوں کے بارے میں ایسا واضح اعلان کر دیا جائے جس سے مغربی پنجاب، سرحد سندھ کے پناہ گزین اپنی جائیدادوں کے بارے میں مطمئن ہو جائیں۔

۱۲۔ ہندوستان اور پاکستان مل کر ایشیا کی تب ہی رہنمائی کر سکتے ہیں جب دونوں حکومتیں اپنی اندرونی سرحدات کے خطرات سے نجات حاصل کریں۔

۱۳۔ پاکستانی اخبارات اور پریس سے آپ اپیل کیجیے، بلکہ اپیل کے بعد حکم نافذ کیجیے کہ وہ غیر مسلموں کو تحریر و تقریر، نظم و نثر میں کفر اور کافر کا طعنہ دینے سے پرہیز کریں، کیوں کہ کفر اور کافر کا طعنہ اسلام کی تبلیغی شان کے بھی خلاف ہے اور پھر اس کے جواب میں دنیا سے وہ سب سننا پڑتا ہے جس کے سننے کے لیے کوئی بھی مسلمان تیار نہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری معروضات کی طرف ضرور توجہ دیں گے..... میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے دردمند دل کی آواز ہے جس کو آپ تک پہونچانا ضروری سمجھا۔ آخر میں میری دعا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے دوستانہ اتحاد کا یہ آغاز ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے اور دونوں حکومتیں ایشیا میں اپنے وقار کے مطابق پھلیں اور پھولیں''۔

والسلام مخلص: حبیب الرحمٰن لدھیانوی

موجودہ وقت میں جو حالات ہندو پاک کے درمیان پیش آ رہے ہیں یا ماضی میں پیش آ چکے ہیں۔ اسے دیکھنے اور جاننے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے جس طرح مذکورہ خط میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے مولانا کی دور اندیشی کا پتہ چلتا ہے۔

مندرجہ بالا خطوط عزیز الرحمٰن جامعی صاحب کی کتاب ''درحدیث دیگراں'' سے لیا گیا ہے، مصنف موصوف نے اس کے علاوہ بھی بہت سے خطوط مذکورہ کتاب میں نقل کیے ہیں، لیکن یہاں صرف ان خطوط کو نقل کیا گیا ہے، جس میں مولانا کی سیاسی زندگی پر روشنی پڑتی ہو۔

☆ ☆ ☆

باب ششم

مجلس احرار اسلام ہند
مقاصد اور خدمات

غدر کے بعد مسلمانانِ ہند کو حکمراں طبقہ نے اس بری طرح کچلا کہ وہ بہت عرصہ تک سر نہ اٹھا سکے، ان کے دلوں میں خوف سما گیا۔ دوسری اقوام کے مقابلے میں تعلیمی میدان کے ساتھ اقتصادی دوڑ میں بھی پیچھے رہ گئے تھے۔ سرسید مرحوم نے ان کو سیاست سے الگ رہنے کا سبق پڑھایا اور ان کے دوسرے ہمنوا بھی سیاست کو شجر ممنوعہ بتا کر مسلمانوں کو سیاست ملکی سے بالکل بے تعلق اور بے بہرہ کر دیا تھا۔ ادھر مسلمانوں کی غفلت اور بے حسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزا غلام احمد قادیانی نے دعوائے نبوت اور مہدیت کر کے اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا اور مذہب اسلام میں تغیّر و تبدل کا آغاز کر کے مسئلہ جہاد کو غیر ضروری قرار دے دیا، جس کی وجہ سے حکومت کی ہمدردی اور اعانت بھی حاصل ہوگئی اور مرزا صاحب کا پروانۂ خوشنودی جو ایک مسلمان متلاشیٔ روزگار کو متاع ایمان کی نذر دے کر حاصل کرنا پڑا تھا، فوراً سرکاری ملازمت دلا دیتا تھا۔

یہ سب مسلمانوں کے سیاست ملکی سے الگ رہنے کے نتائج تھے، لیکن اب آئندہ کے لیے تو یہ غفلت بہت ہی خطرناک تھی۔ مسلمانوں پر اس تعلیم کا جو سیاست سے الگ رہنے کی دی گئی تھی بہت گہرا اثر تھا۔

لیکن اسی دوران ہندوستان کے چند علماء نے خاموشی کے ساتھ ایک اہم کارنامہ انجام دیا اور وہ تھا سرزمینِ دیوبند میں مدرسہ کا قیام جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں ہوا، جس کے جیالوں نے بعد کے وقتوں میں تنظیمیں قائم کر کے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں بیداری پیدا کی، مثلاً ''۱۸۷۹ء میں ثمرۃ التربیت، ۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار اور ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف جیسی تنظیموں اور جماعتوں کا قیام عمل میں آیا''۔ [۱]

---

[۱] علماء حق، مولانا محمد میاں، پرنٹنگ ورکس دہلی، ۱۹۴۶ء، ج نمبر ۱، ص: ۱۲۸۔۱۳۰۔۱۳۵

مگر یہ تنظیمیں ملکی سطح پر بہت حد تک کامیاب نہ ہوئیں۔البتہ تحریک خلافت مسلمانوں میں بہت حد تک بیداری پیدا کردی۔ پھر اس تحریک کے سلسلہ میں چند ناخوشگوار واقعات نے مسلمانوں کے دلوں پر برا اثر کر کے ان کو سیاست سے دل برداشتہ کر دیا تھا۔

مجلسِ احرار کا قیام:

مسلمانوں کے کارکن جو زیادہ تر تحریک خلافت کے پیدا کیے ہوئے تھے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے تھے،اس کے کارکن کچھ کانگریس میں ، کچھ سوشلسٹ وکمیونسٹ جماعتوں میں اور کچھ مسلم لیگ جیسی جماعتوں میں براہ راست شامل ہوگئے ۔لیکن پنجاب کے کارکنان خلافت نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے سے ایک نئی تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام مجلس احرار رکھا گیا۔

مجلس احرار کے قیام کی ایک دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے جانباز مرزا اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

> ''آخر یہ ہوا کہ ۲۸/دسمبر ۱۹۲۹ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس نے لاہور دریائے راوی کے کنارے اپنے سالانہ اجلاس میں سکھوں کی ناراضگی کا بہانہ تراش کر نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کے سپرد کر کے ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کرایا۔نہرو رپورٹ کے خاتمے سے ان مسلمانوں کو بے حد صدمہ ہوا جنہوں نے ملت اسلامیہ کی ناراضگی کے باوجود صرف آزادیٔ وطن کے لیے نہرو رپورٹ پر دستخط کیے تھے۔لیکن کانگریس رہنماؤں نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کرتے وقت ان سے مشورہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا اور ایسی بے اعتنائی کا ثبوت دیا کہ بہی خواہان وطن کو کانگریس کی اس بے وفائی پر دلی رنج ہوا۔ اسی لمحے ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے اپنی الگ تنظیم کا وجود شدت سے محسوس کرتے ہوئے ۲۹/دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے اسی پنڈال میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے پر مجلس احرار کا قیام عمل میں لایا گیا'' [۱]

---

[۱] کاروان احرار/جانباز مرزا،تجارت پرنٹر لاہور،۱۹۷۵،ج ا ص:۸۲

مصنفین کی رائے:

''۱۹۲۹ء کے کانگریس کے اجلاس میں ۲۹ء دسمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا آزاد کے مشورہ پر آل انڈیا کانگریس کے اسٹیج پر چودھری افضل حق صاحب کی صدارت میں مجلس احرار اسلام کا پہلا جلسہ ہوا۔ اس کی مجلس مشاورت میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ عبد الرحمٰن غازی شامل تھے۔ آپسی مشورہ میں مولانا آزاد نے اس کا نام مجلس احرار رکھا۔ مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری مجلس احرار کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ اور پھر مجلس احرار کے پورے پنجاب میں ضلع وار اور شہری علاقوں میں اس کے دفاتر قائم ہوئے''۔ [۱]

''ابتدا ۱۹۲۹ء میں چودھری افضل حق کی صدارت میں مجلس احرار اسلام کی بنیاد پڑی ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مظہر علی اظہر نہ صرف اس کے مشورے میں شامل تھے بلکہ ان کے متفقہ فیصلے سے قدم آگے بڑھایا گیا۔ یہ نام بھی مولانا آزاد ہی کا تجویز کردہ تھا ،جس کا پہلا اجلاس لاہور کانگریس کے موقع پر ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اسی پنڈال میں ہوا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صدر منتخب ہوئے'' [۲]

''مولانا آزاد، مولانا مظہر علی اظہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے متفقہ مشورہ سے چودھری افضل حق کی زیر صدارت مجلس احرار اسلام قائم ہوئی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری جماعت احرار کے روح رواں تسلیم کیے گئے،، [۳]

ڈاکٹر پی۔ این چوپڑا مجلس احرار کے قیام کے متعلق لکھتے ہیں:

''خلافت کے خاتمہ کے اعلان کے بعد اس کے لیے خلافت کمیٹی کے وجود کا کوئی جواز بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا شوکت علی نے ذاتی عداوت کی بناء پر پنجاب کی خلافت کمیٹی تحلیل

---

[۱] ہندوستانی مسلمانوں کا جنگ آزادی میں حصہ، سید ابراہیم فکری، لبرٹی آرٹ پریس نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۹۴

[۲] حیات ابوالکلام آزاد، عبد القوی دسنوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۰، ص: ۶۲۰

[۳] مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری/اثر بن یحی، نورانی پریس مالیگاؤں، ۱۹۸۲ص: ۲۲۳

کردی تھی، جس کی وجہ سے مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا ظفر علی خان وغیرہ نے خلافت کمیٹی سے استعفیٰ دے کر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں ۲۹ دسمبر کو چودھری افضال الحق (افضل حق) کی صدارت میں ایک میٹنگ کر کے مجلس احرار کی بنیاد رکھی''[۱]

بہر حال ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے اسی پنڈال میں مجلس احرار اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا اور اسی پنڈال میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی صدارت میں اپنا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ:

''ہندوستان کی آزادی کا سہرا دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے سر پر بھی رہنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں سے گلو خلاصی کے لیے مسلمانوں کی حریت پسند تنظیم کا ہونا نہایت اہم ہے''[۲]

احرار کا نظریہ:

ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسئلہ خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد مجلس خلافت جب بے مقصد ہو کر اندرونی تضادات کا شکار ہو گئی تو اس کے کارکن مختلف گروہ میں تقسیم ہو گئے تھے۔

ایک گروہ ایسا تھا جو حکومت پر کامل اعتماد رکھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اسی کی سرپرستی میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ گروہ مسلم لیگ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس پر قبضہ جمائے تھا۔

دوسرا گروہ وہ تھا جو کانگریس کے احکام پر بلا چوں و چرا عمل کرتا اور برادران وطن کے جذبۂ عمل اور طاقت سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں اگر مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کو خوش رکھیں، اس کے سہارے کے بغیر زندگی غیر ممکن ہے۔

ایک تیسرا گروہ بھی تھا جو نہ ہندو پر اعتماد کرنے کے لیے تیار تھا اور نہ انگریزوں پر، صرف اپنے زور بازو پر اعتماد، یہ گروہ نہ ہندو سے امداد کا طالب، نہ انگریز سے، خدا سے امداد کا خواہاں اور اس کی امداد پر بھروسہ رکھتا تھا، اسی گروہ نے مجلس احرار قائم کی اور برابر مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے رہے کہ جو تم کو مساویانہ

---

[۱] انڈین اسٹریگل فار فریڈم، رول آف ایسوسی ایشن موومنٹ، ڈاکٹر پی، این چوپڑا، آگھم پرکاش، ۱۹۸۵ء، ج:۲، ص:۳۴۶

[۲] کاروان احرار، جانباز مرزا، ص:۸۲

دررجہ دے تم اس کو مساویانہ درجہ دو، جو تم کو ذلیل سمجھے یا تم سے نفرت کرے تم اس کو ذلیل سمجھو، کسی غیر اللہ کے سامنے مت جھکو، کسی غیر اللہ کی امداد پر بھروسہ نہ رکھو۔

اس گروہ کا خیال تھا کا مسلمانوں کو ایسی انجمن یا تنظیم کی ضرورت ہے جو منظّم اور طاقت ور ہونے کے علاوہ ملک کی کامل آزادی پر عقیدہ اور اسلامی مفاد کے لیے ہر ایک مخالف طاقت سے ٹکرانے کی قوت رکھتی ہو، جو خدمت خلق کے ان زرّیں اصولوں پر کار بند ہو کر ملک کی خدمت کرے جو آج سے چودہ سو برس پہلے بنائے گئے تھے، اسی گروہ نے مجلس احرار اسلام قائم کی۔

اغراض ومقاصد:

کسی تنظیم یا جماعت کو عمل میں لانے سے پہلے اس کے اغراض ومقاصد کے متعلق سوچا جاتا ہے، جس پر کار بند ہو کر ہی تنظیم کو کامیابی کی راہ ملتی ہے۔ چوں کہ ۱۹۲۹ء میں ہندوستانی مسلمان جنگ آزادی میں انگریزوں سے مختلف طریقوں سے نبرد آزما تھی، اس وقت ضرورت ایسے مسلمان قائدین کی تھی جو انگریزوں کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح راہ نمائی کر سکیں، لہذا مجلس احرار اسلام کے اغراض ومقاصد بھی کچھ اس طرح تجویز کیے گئے:

الف: پرامن ذرائع سے ہندوستان کے لیے آزادی حاصل کرنا۔

ب: سیاسیات ہند میں مسلمانوں کی صحیح سیاسی راہ نمائی کرنا۔

ج: مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے کوشش کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ ذرائع رکھے:

الف: تمام ہندوستان میں مجالس احرار قائم کرنا۔

ب: ہر جگہ جیش مجلس احرار اسلام منظّم کرنا۔

ج: مزدوروں اور کاشتکاروں کو اقتصادی اصول پر منظّم کرنا۔

د: دیسی صنعتوں کو ترقی کے لیے اور سودیشی اشیاء کی ترویج کے لیے کوشش کرنا۔

ہ: قیام مجلس احرار کے لیے سرمایہ فراہم کرنا اور دیگر ایسے وسائل اختیار کرنا جو وقتاً فوقتاً ضروری خیال کیے جائیں۔[1]

اغراض ومقاصد کے متعلق ڈاکٹر پی۔این۔چوپڑا تحریر فرماتے ہیں:

''مجلس احرار کے اغراض ومقاصد میں ہندوستان کی آزادی، دوسری سیاسی تنظیموں سے اشتراک، مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی پسماندگی کو دور کرنے کی سعی اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرنا شامل تھے''[2]

نمک ستیہ گرہ اور سول نافرمانی:

میدان کارزار گرم ہو تو غیر مسلم افراد یا قومیں شکست کھا جاتی ہیں۔ میدان ہمیشہ انہی کے ہاتھ رہا جن کے مقاصد بلند، ہاتھوں میں تلوار، سینے پر زرہ بکتر اور ارادے متزلزل نہ ہوں۔ لیکن متحدہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اپنی نوعیت کی منفرد لڑائی تھی۔ اس میدان میں ایک غیر ملکی حکمراں اپنی مسلح افواج، جیل خانے، پھانسی کا رسّہ اور عبور دریائے شور کی سزاؤں سے لیس تھے۔ مقابل میں غیر مسلح رعایا۔ اگر کوئی چیز ان کے پاس تھی تو وہ جذبہ آزادیٔ وطن تھا اور بس!۔ دنیا اس لڑائی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ توپ اور بندوق کے مقابل سینہ تانے ہوئے لوگ موت کی آغوش میں تو جا سکتے ہیں، مگر اپنی منزل کو کیوں کر پا سکتے ہیں؟ لیکن مصلحت اندیش ہی ایسا سوچ سکتے ہیں اور جنہیں معلوم ہو کہ موت کے بغیر زندگی کا سراغ نہیں مل سکتا وہ بے دریغ توپ اور بندوق سے لڑ جاتے ہیں اور یہی ان کی منزل ہوتی ہے۔

خالق کی ہر شئے اس کی مخلوق کے لیے ہے۔ اس پر نہ تو کسی حکمراں کو ملکیت کا حق پہونچتا ہے اور نہ ہی کسی قانون کی کوئی قدغن اس پر زیب دیتی ہے۔ نمک لندن یا یورپ کے کسی شہر سے درآمد نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ فطرت نے انسانی ضرورت کے لیے ہندوستان میں اس کے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں۔ لیکن غلام ہندوستان کے غیر ملکی آقاؤں نے اس ملک کی ہر چیز کو اپنی جاگیر سمجھ کر اس پر اس قدر ٹیکس یا محصول عائد کیا

---

[1] مجلس احرار اسلام کی ضرورت واہمیت، محمود علی خان کیلاش پوری، ہمدرد پریس سہارن پور، ص:۹

[2] ڈاکٹر پی۔این۔چوپڑا۔ متذکرہ بالا۔ ص:۳۴۸

کہ نمک ایسی عوامی ضرورت کی چیز بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

چالیس کروڑ (۱۹۲۰ء میں متحدہ ہندوستان کی آبادی اسی قدر تھی) غلاموں کا یہ دیش انگریزی سامراج کو دنیا کے غلام رکھنے کی قوت فراہم کر رہا تھا۔ چناں چہ ان حالات کے پس منظر میں کانگریس کی تحریک سے ہندوستان کے مسلمانوں کا تعاون یا اس میں شمولیت کو نہایت ضروری سمجھا گیا۔ پھر جبکہ دوسری جماعتیں اس پرامن لڑائی میں خاموش اور علیحدگی اختیار کیے ہوئے تھیں اور بھی اہم ہو گیا۔ کیوں کہ حقوق کے بٹوارے میں جب قومیں ترازو لے کر بیٹھتی ہیں تو گفتار سے کہیں زیادہ کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس دوڑ میں جیت بھی انہیں کی ہوتی ہے جو بجائے گفتار کے کردار کے غازی ہوں۔

ان وجوہ کی بناء پر مجلس احرار کے رہنماؤں نے اپنی نئی تنظیم (مجلس احرار) کی سرگرمیوں کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دیا اور کانگریس کے ساتھ ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لیے انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے۔

احرار رہنماؤں کے اس فیصلے نے ہندوستان کے حریت پسندوں کو متاثر کیا اور وہ بھی انگریزی سامراج سے آخری جدو جہد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ نمک ستیہ گرہ کی تحریک آگ کی طرح سارے ہندوستان کو اپنے لپیٹ میں لے رہی تھی۔ احرار رہنما مسلمانان ہند کی رہنمائی میں سارے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ جگہ جگہ گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں احرار رہنماؤں کی شمولیت سے ہندوستان کے مسلمانوں میں توانائی محسوس ہونے لگی۔ آزادئ وطن کے لیے ایثار و قربانی کے میدان میں وہ برادران وطن کے ہمدوش آگے بڑھتے گئے۔ احرار رہنماؤں کے اس عمل کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور سراہا گیا۔

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے:

> ''۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان سول نافرمانی کی تحریک میں احراری کارکن کانگریس کے ساتھ شامل رہے، انہوں نے بہت محنت سے کام کیا۔ بہت ساری قربانیاں دیں اور نیشنلزم کے لیے کوششیں کیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس وقت پنجاب کے بہت سارے مسلم کانگریسی کارکن کانگریس کو چھوڑ کر احرار پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس پارٹی نے بہت سارے مسلمان

رہنماؤں اور کارکنوں کو اپنے کاموں کے ذریعہ اپنی طرف متوجہ کیا، بشمول غیر مسلموں کے وہ بہت سے لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ کانگریس پارٹی نے بہر حال اس کے اثر انداز ہونے کو سراہا''[۱]

ڈاکٹر پی این چوپڑا لکھتے ہیں:

''مجلس احرار کا کانگریس سے بھی رابطہ تھا، کیوں کہ جب گاندھی جی نے انفرادی ستیہ گری ۱۹۳۰ء میں شروع کیا تو اسی تحریک سول نافرمانی کی ہمنوا مجلس احرار بھی تھی۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو مجلس احرار کا جھنڈا لاہور کی شاہی مسجد میں پھہرا دیا گیا تھا''[۲]

کاروان احرار کے مصنف اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:

''احرار رہنماؤں کے کندھوں پر یہ بوجھ اس لیے بھی آن پڑا کہ جون ۱۹۳۰ء کو حکومت نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے بعد نئے کارکن آگے بڑھے، جیسے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد احرار رہنما چودھری افضل حق کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا اور انہوں نے دہلی میں اپنی گرفتاری سے پیشتر تک سارے ملک کی تحریک سول نافرمانی کو کنٹرول کیا اور آخر کو مولانا سید عطاء اللہ بخاری دیناج پور (بنگال) سے گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانہ سے شیخ حسام الدین امرتسر سے۔ مولانا مظہر علی اظہر بٹالہ اور مولانا محمد داؤد غزنوی لاہور سے پابند سلاسل کیے گئے''[۳]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے تعلقات پنڈت موتی لال نہرو سے بہت اچھے تھے، جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک مرتبہ الٰہ آباد تشریف لے گئے تو موتی لال نہرو نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اس موقع پر فرمایا: ''کانگریس کے ستیہ گرہ کی کامیابی حقیقت میں انکی (احرار پارٹی) ہی کی وجہ سے ہے''[۴]

---

۱ موڈرن اسلام ان انڈیا، ویلفر ڈسینٹ ویل اسمتھ، اوشا پبلیکیشنز نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص: ۲۷۰

۲ ڈاکٹر پی۔ این۔ چوپڑا، متذکرہ بالا، ص ۳۴۸

۳ کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ا، ص: ۲۹۵ ۴ ڈاکٹر پی۔ این۔ چوپڑا، متذکرہ بالا، ص ۳۴۸

۴ ڈاکٹر پی این چوپڑا، متذکرہ بالا، ص: ۳۵۶

کانگریس سے علیحدگی:

یہ درست ہے کہ پولیٹیکل دوڑ میں قومیں کبھی معاف نہیں کرتیں اور کرنا بھی نہیں چاہیے۔لیکن غلامی سے آزادی کے سفر میں ہمسایہ قوموں سے بگاڑ نے منزل کو اس قدر دور کر دیا کہ جو راستے ۱۸۵۷ء کو ختم ہو جانے چاہیے تھے ان کے لیے مزید ایک صدی انتظار کرنا پڑا۔

چودھری افضل حق جنہیں ۱۹۳۱ء میں کانگریس کمیٹی کے خلاف قانون ہونے پر مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی گرفتاری کے بعد آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا اور وہ خلاف قانون ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شمولیت کے بعد گرفتار ہوئے تھے ،جب رہا ہو کر کراچی کانگریس کے اجلاس میں شامل ہوئے تو کانگریس ہائی کمانڈ نے چودھری صاحب سے پوچھے بغیر ان کی جگہ ڈاکٹر محمد عالم کو ورکنگ کمیٹی میں لے لیا اور اس واقعہ سے کچھ دنوں بعد جون کے شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے فرید آباد میں اپنی تقریر کے دوران بحیثیت صدر کانگریس، سکھوں کو مخلوط انتخاب کے ذریعہ نہرو رپورٹ سے زیادہ حقوق دے کر خوش کرنے کی کوشش کی۔لیکن ڈاکٹر انصاری کی اس رعایت سے پنجاب کے مسلمانوں کو نقصان پہونچ رہا تھا۔ کانگریس کی اس فرقہ وارانہ کوشش کے باعث پنجاب کے نیشنلسٹ مسلمان جو سول نافرمانی تحریک میں کانگریس کے شانہ بشانہ تھے علیحدہ ہو گئے اور ۵/جون ۱۹۳۱ء کو لاہور میں جمع ہو کر مجلس احرار اسلام کے احیاء کی از سر نو تجویز کی۔اس اجلاس کی صدارت سید عطاء اللہ شاہ بخاری فرما رہے تھے۔

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تجویز پاس کی گئی:

> ''مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ مسلمانان پنجاب اس تجویز پر متفق نہیں ہیں، جس سے انہیں مخلوط انتخاب کے لیے مجبور کیا جائے ، ہمارے نزدیک چند کانگریسی مسلمانوں کے سوا کوئی مسلمان مخلوط انتخاب کا حامی نہیں ہو سکتا ، کیوں کہ یہ تجویز پنجاب اور بنگال کی مسلمان آبادی کو جہاں کہ ان کی اکثریت ہے، اقلیت میں تبدیل کرنے کی ایک ناپاک کوشش ہے''[1]

تاریخ کے اس موڑ پر کانگریس سے ان کی گذشتہ بے وفائیوں سے عاجز آ کر علیحدگی کا فیصلہ احرار

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج،۱،ص:۱۱۶

رہنماؤں کا اہم ترین فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ ایسے وقت میں ہوا جب رجعت پسند مسلمان بھی انگریز کی میز پر مسلمان کے حقوق تلاش کر رہا تھا۔

احرار کانفرنس:

* ۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کے قیام کے بعد پہلی کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس کا انعقاد لاہور کے حبیبیہ حال میں کیا گیا۔ عوام کا جوش وخروش اس قدر تھا کہ جب مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی احرار کانفرنس کی صدارت کے لیے لاہور اسٹیشن پر پہونچے تو اہل لاہور نے اپنے رہنما کا اس طرح اقبال کیا کہ گلیاں اور بازار خوبصورت طریقے پر سجائے گئے، عوام کی جانب سے پھولوں کی اس قدر بارش ہوئی کہ مولانا حبیب الرحمٰن کی کار کو کئی بار پھولوں سے خالی کرنا پڑا۔

۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء کو اجلاس شروع ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد خواجہ عبد الرحیم عاجز اور جانباز مرزا نے اپنا کلام پڑھا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنا صدارتی خطبہ دیا۔ اس اجلاس میں مولانا محمد علی جوہرؒ کی تعزیتی قرارداد مولانا محمد داؤد غزنوی نے پیش کی جس کی تائید میں احرار رہنماؤں نے تقریریں کیں۔

* کانفرنس کے شب وروز چھ اجلاس ہوئے جن میں احرار رہنماؤں نے ملکی حالات پر تقریریں کیں اور ۱۲ر جولائی کی رات کے آخری اجلاس میں قراردادیں مولانا مظہر علی اظہر نے اردو اور انگریزی میں پیش کیں، جس کی تائید میں شیخ حسام الدین، چودھری افضل حق اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریریں کیں۔

اس اجلاس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، خواجہ عبد الرحمٰن غازی، مولانا ظفر علی خاں، شیخ حسام الدین، مولانا داؤد غزنوی جیسے جید اور سرگرم احراری لیڈر شریک ہوئے۔[۱]

* مولانا مظہر علی اظہر نے جو خطبہ استقبالیہ پیش کیا اس کو مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔ مولانا نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ہندوستان کے حالات کا پس منظر پیش کرتے ہوئے احرار کے قیام و پالیسی کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

---

[۱] حیات امیر شریعت، جانباز مرزا، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۷۱

''کانگریس اور حکومت کے درمیان عارضی صلح کے بعد امید پڑتی تھی، کہ آئندہ دستور اساسی کی ترتیب میں فرقہ وارانہ اور دیگر مسائل کا تسلی بخش حل ہو سکے گا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد نظر آیا کہ یہ امید موہوم تھی۔ گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جو ۱۹۳۰ء کے آخری، اور ۱۹۳۱ء کے ابتدائی ایام میں ہوا، مختلف صوبجات کے مختلف تصفیے ہوئے اور بڑے صوبوں میں سے ایک صوبہ پنجاب ہی ایسا تھا جس کے تناسب نمائندگی کے متعلق فیصلہ نہ ہو سکا''[۱]

چنانچہ مولانا مظہر علی اظہر نے پنجاب کے مسئلہ کے حل پر زور دیتے ہوئے جداگانہ انتخاب کے خلاف ہندوؤں کے شور و غوغا کی حقیقت کو بے نقاب کرتے ہوئے کہا:

''ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کی خلاف آواز اٹھائی، لیکن وہ اس لیے نہ تھی کہ ملکی فوائد پیش نظر تھے۔ پنجاب کونسل میں ایسے مسلمان نظر آتے تھے جو ان کے زیر اثر نہ تھے۔ کیوں کہ حکومت کے ارکان مسلمانوں کو ایک راہ پر چلا رہے تھے، اور ان کا ساتھ دے رہے تھے''[۲]

بہر حال احرار کی جدو جہد کا ایک رخ اور بھی تھا، جسے کسی جماعت نے نہیں اپنایا اور احرار کو اپنی رفتار طبع اور درمیانی طبقہ سے متعلق ہونے کی بنا پر اپنانا پڑا۔ وہ رخ کیا تھا؟ مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''ہم اب بھی آزادئ وطن کے لیے تہہ دل سے کوشش کریں گے، لیکن ہماری کوشش غریبوں و مفلسوں، مظلوموں اور ستم رسیدوں کی آزادی، خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے ہوں گی۔ ہم برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کی جگہ، ہندوستانی ملوکیت اور سرمایہ داری کو دے کر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ہم نئی بادشاہتیں، نئے راج، نئی نوابیاں اور نئے ساہوکارے دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے، ہم خود دولت اور امیری کے دلدادہ نہیں، نہ آئندہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنا ہمارا مقصد ہے۔ اس لیے جہاں ہم نے آج تک برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری کا ساتھ دینا ضعف ایمانی سمجھا ہے، اسی طرح ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھ میں کھیلنا ہمارے نزدیک

۱۔ احرار اسلام کانفرنس، لاہور۔ خطبات و قراردادیں۔ ۱۹۳۱ء۔ ص:۱

۲۔ حوالہ: ایضاً۔ ص:۲

جائز نہیں۔ اگر ہمارے سرمایہ دار بھائی ہمیں اپنے پھندے میں نہ پھنستا دیکھ کر جوش غضب میں آئیں، تو ہم مردانہ وار مسکرا کر اپنی راہ پر چلتے جائیں گے''[1]

''ہم نے ہمیشہ ہندوؤں اور سکھوں سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ہم مسلمان بھائیوں سے بسا اوقات دست وگریبان نظر آئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ مسائل کی تائید میں ہم نے اپنے بھائیوں سے گالیاں سنیں، پتھر کھائے اور دوستی کو دشمنی میں تبدیل ہوتے بھی دیکھا۔ محض اس لیے کہ ہم متحدہ قومیت کی بنیادوں کو استوار کرنا چاہتے تھے اور برطانوی ملوکیت اور سرمایہ داری سے نجات حاصل کرنا اپنا ایمان سمجھتے رہے، لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا اور اپنے عہد کی پابندی بھی مناسب نہ سمجھی۔ [2]

احرار کے اس عزم وارادہ کے پیچھے یہ نکتہ کارفرما نظر آتا ہے کہ وہ سرمایہ دار خواہ ہندو ہو یا مسلمان، دونوں سے لڑیں گے اور دونوں فرقوں کے غریبوں اور ناداروں کو ملا کر اپنے مقاصد کی تکمیل کریں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے احرار کو غریب مسلمان ہی میسر آئے نہ کہ غریب ہندو۔ کیوں کہ وہ احرار کو نیشنلسٹ جماعت اس لیے سمجھتے رہے کہ اس کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی۔ چنانچہ اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے بعد ہی مسلم راہ نماؤں کو مجلس احرار کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بنابریں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی صدر مجلس احرار اسلام کانفرنس نے کانفرنس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے فرمایا:

''احرار کانفرنس بلانے کی ضرورت کیوں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے، کہ عارضی صلح کے بعد جب کہ نیا آئین وقانون ہندوستان کے لیے کانگریس انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر تیار کر رہی ہے، اس وقت ہر قوم کی یہ کوشش ہے کہ وہ اس آئین میں اپنے لیے بہتر سے بہتر مقاصد حاصل کرے۔ پنجاب میں سکھوں کی قوم نے جن کی نمائندگی کا دعویٰ ماسٹر تارا سنگھ کو ہے، مسلمانوں کے خلاف اتنا زہر اگلا اور ہندو پریس نے اس کی تائید کی، جس کے لیے تریاق کی ضرورت ہے''[3]

---

[1] ایضاً۔ ص: ۱۰-۹

[2] خطبات احرار، شورش کاشمیری، مکتبہ احرار لاہور، ۱۹۴۴ء، ص: ۱۱۵

[3] حوالہ: ایضاً: ص: ۱۳

گویا احرار کانفرنس بلانے کا مقصد مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کرنا اور ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے دی گئی دھمکیوں کا جواب دینا تھا۔

بہر حال مجلس احرار اسلام نے ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ احرار کا خیال تھا کہ سب کی نگاہیں پنجاب کی مسلم اکثریت کی طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ گہری سازش سے پنجاب کی اکثریت کی آبادی کو نہ صرف یہ کہ اقلیت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں بلکہ انہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ ہند کے کسی مقام پر مسلمان کی حکومت قائم ہوگئی، تو ہندو ماتا کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی آگے فرماتے ہیں:

''جماعت احرار کسی قوم کے ساتھ بے انصافی نہیں چاہتی، مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں وہ اچھوت بن کر رہنے کے لیے تیار نہیں۔ مسلمان ہندوستان میں برابر کے حق دار ہیں، اور وہ ہندوستان کی حکومت میں برابر کے حصہ دار بن کر رہیں گے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں انگریزی حکومت کو ایک منٹ کے لیے برداشت نہیں کر سکتے، تو وہ سکھ اور ہندوؤں کے متعصبانہ جذبات اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو دیکھ کر اپنے حقوق کو کبھی نہیں چھوڑ سکتے''[1]

احرار نے اپنی اس پہلی کانفرنس میں پہلی بار کانگریس کی پے بہ پے ہندو نوازی اور نام نہاد ''نیشنل'' جماعت کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا اور ایک نیشنلسٹ تحریک کے علمبردار ہونے کے باوجود، مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کیا اور ایک طویل قرارداد اس ضمن میں پاس کی۔ قرار داد کی نقل حسب ذیل ہے:

(۱) ''ہرگاہ کہ مارچ ۱۹۲۷ء میں مختلف مسلم جماعتوں کے کئی ایک مقتدر راہ نماؤں کی پیش کردہ دہلی تجاویز کو، جن میں تجویز کیا گیا تھا کہ تمام فرقوں کے لیے تمام صوبوں میں آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کر دی جائیں، اور حلقہ ہائے انتخاب کو مخلوط کر دیا جائے، پنجاب کے ہندو اور سکھوں نے قبول نہ کیا۔

(۲) ہرگاہ کہ مسئلۂ پنجاب کا وہ حل جو نہرو رپورٹ نے پیش کیا اور جس کو ۱۹۲۸ء کے ہندو، مسلم، سکھ میثاق میں، جو لکھنؤ میں ہوا، منضبط کیا گیا تھا، اور جس میں سفارش کی گئی تھی کہ سب بالغوں کو حق رائے دے کر

---

[1] خطبات احرار، شورش کاشمیری، مکتبہ احرار لاہور، ۱۹۴۴ء، ص: ۱۵

مخلوط انتخاب کا سلسلہ جاری کیا جائے اور کسی فرقہ کے لیے پنجاب میں نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔تمام سکھ قوم نے حتی کہ میثاق لکھنؤ پر دستخط کرنے والوں نے بھی اسے نامنظور کیا،اور سکھوں کی ہندوؤں نے اعلانیہ تائید کی۔

(۳) ہرگاہ کہ خود مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۸ء کے اس میثاق پنجاب سے اپنی براءت کا اظہار کیا اور یہ اعلان کر کے کہ اس میں سکھوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا،اس واحد تجویز کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جس پر رضامندی باہمی کی امید ہو سکتی تھی۔

(۴) ہرگاہ کے پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں نے حق رائے دہی بالغان کی اعلانیہ مخالفت شروع کر دی۔

(۶) ہرگاہ کہ ہندو اور سکھ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے لیے محض اپنے فرقہ وارانہ مفاد کی خاطر چیخ وپکار کر رہے ہیں،اور اپنی انتہائی فرقہ پرستی کو نام نہاد قومیت کے لحاظ سے ظاہر کر رہے ہیں۔

(۷) ہرگاہ کہ مہاتما گاندھی نے بھی اصرار کیا کہ مسلمانوں کا متحدہ مطالبہ ہو پیشتر اس کے کہ وہ قابل التفات ہو سکے۔

(۸) ہرگاہ کہ مسلمانوں کے اعتدال پسند اور قدامت پسند طبقے ،جداگانہ انتخاب کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

(۹) ہرگاہ کہ مخلوط انتخاب کا ہر اس فارمولے سے جو مسلمان قوم پسندوں کے نزدیک قابل قبول تھا،پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے اختلاف کیا ہے اور اب معاملات کا زیادہ دیر تک کھٹائی میں پڑا رہنا بے سود ہے۔

(۱۰) ہرگاہ کہ کمال سنجیدگی اور عزم سے یہ دھمکی دی گئی کہ اگر کوئی ایسا آئین رائج کیا گیا خواہ وہ نہرو رپورٹ کے مطابق کیوں نہ ہو، جس میں صوبہ کے لیے امکان ہو کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کو مخلوط انتخاب کے زریعہ بھی مجلس قوانین پنجاب میں منتخب کرا سکے، تو سکھ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہادیں گے ،اور ہندو سکھوں کی پشت پناہی پر ہیں۔ اور اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ مصیبت کے تدارک کے لے شیرازۂ قوم کا انتشار دور کیا جائے۔

(۱۱) ہرگاہ کہ ہندو اور سکھ اس بات کے لیے تیار نہیں کہ مسلمانوں کے لیے مرکزی حکومت میں فائق

حیثیت حاصل کرنے کا ذرہ برابر بھی امکان ہو۔اس لیے کانفرنس کی رائے ہے کہ موجودہ حالات میں جداگانہ انتخاب جاری رہنا چاہیے اور جن صوبوں میں مسلم اکثریت ہے، وہاں کی مجالس وضع قوانین میں نشستوں کی اکثریت مسلمانوں کو حاصل ہونی چاہیے۔اور مخلوط انتخاب جو متحدہ قومیت کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، اس کا اجراء اس وقت تک معروض دستور میں رہنا چاہیے، جب تک ہندو اور سکھ، مسلمانوں کے خلاف اپنے جارحانہ اور معاندانہ رویہ سے دستکش نہ ہو جائیں، اور مسلمانوں کے ساتھ طول وعرض ہند میں زندگی کے ہر شعبہ میں فراخ حوصلگی، رواداری اور ہندوستانی برادری کا سلوک عملاً پیش کر کے متحدہ قومیت کے لیے خوشگوار فضا پیدا نہ کریں''[1]

تحریک کشمیر:

غیر ملکی اقتدار میں متحدہ ہندوستان کی وہ کونسی ریاست تھی جس میں راعی اور رعایا کے جھگڑے دیکھنے اور سننے میں نہیں آتے رہے۔ اگر ریاست کا رئیس ہندو ہے تو مسلمان اس سے مطمئن نہیں، اگر حکمراں مسلمان ہے تو غیر مسلم رعایا اس سے نالاں رہتی۔ مگر ان جھگڑوں کی نوعیت عارضی اور مقامی ہوا کرتی تھی۔ نواب اور راجہ دیوان برطانیہ کے ستون تھے اور فرنگی حکمرانوں کی حکمت عملی بھی اسی میں رہی کہ وہ ریاستوں میں امن برائے امن حاکم بنے رہیں، اور جہاں دیکھا کہ رعایا نے ذرا بھی سر اٹھانے کی کوشش کی تو فوراً برائے انصاف آگے بڑھ کر حالات کو اپنے ڈھب پر لے آئے۔ لیکن کشمیر کا مسئلہ ایسا کیوں الجھا؟ کہ انگریز ایسا سیاست داں یہ سارا کچھ دیکھتا ہوا محض تماشائی بنا رہا۔

ڈوگرہ شاہی کے خود ساختہ آئین نے کشمیر کی غلام رعایا کو ایک سو سال تک جس حال میں جکڑے رکھا، آخر وقت آیا کہ غلام نے انگڑائی لی اور اس جال کا ایک ایک دھاگہ تار عنکبوت کی طرح ٹوٹنے لگا۔

۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کا دن تاریخ آزادیٔ کشمیر کا سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب ۱۸۴۶ء کا خریدا ہوا غلام اپنی زنجیریں توڑ کر بندوقوں اور سنگینوں کے سامنے آ کھڑا ہوا، اور اس نے انقلاب زندہ باد کے نعروں سے قصر شاہی کو متزلزل کر دیا۔

---

[1] احرار کانفرنس، خطبات وقرار دادیں، ۱۹۳۱ء، ص: ۲۸۔۲۶

پس منظر:

اس بغاوت کے محرکات کیا ہیں؟ آخر وہ کونسی وجہ تھی جس کے باعث ریاست جموں وکشمیر آن واحد میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنے لگی؟ آخر وہ کیا بات تھی جس نے ہندوستان خصوصاً پنجاب اور کشمیر کے مسلمانوں کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا؟ تاریخی کتابوں میں جو وجوہات ملتی ہیں بظاہر وہ اس طرح ہیں:

''کشمیر میں ڈوگرہ شاہی نے ایک مدت سے مسلمانوں کی زندگی تلخ کر رکھی تھی مگر ۱۹۳۱ء میں دو واقعات ایسے ہوئے کہ ان سے مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ پہلا واقعہ یوں ہوا کہ ۲۹ر اپریل ۱۹۳۱ء کو جموں شہر میں عید الاضحیٰ کے خطبہ میں امام، حضرت موسیٰؑ کی اس جدو جہد کا ذکر کر رہا تھا جو انہوں نے فرعون کے ظالمانہ بادشاہت کے خلاف کی۔ ظالمانہ بادشاہت کے الفاظ پر ایک سب انسپکٹر پولیس نے امام کو خطبہ بند کرنے کا حکم دیا، اسی پر مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا اور پولیس کو للکارا، صورت حال بگڑتی دیکھ کر پولیس فرار ہوگئی۔

لیکن ابھی اس واقعہ کو زیادہ مدت نہیں گذری تھی کہ جموں سینٹرل جیل میں ایک ڈوگرہ کانسٹیبل لبھو رام نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی جسارت کی، اس پر ریاست کے مسلمانوں میں شدید غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی''[۱]

مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ کاروان احرار کے مصنف نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

(۱) ''جموں میں ۶ر جون ۱۹۳۱ء کو قرآن کریم کی توہین اور خطبۂ عید پر پابندی

(۲) سری نگر میں ۲۶ر جون ۱۹۳۱ء کو عبد القدیر کی گرفتاری (یہ ایک انگریز آفیسر کا خانساماں تھا۔ جو سیر وتفریح کے لیے کشمیر آیا ہوا تھا)

(۳) ۱۳ر جولائی کو گولی چلنے کے واقعات اور مسلمانوں کی شہادت''[۲]

---

[۱] علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، محمد سلیم، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۱، ص: ۳۰-۱۲۹

[۲] کاروان احرار، ص: ۱۷۵

تحریک کشمیر میں احرار کی شمولیت:

تحریک کشمیر میں احراریوں کے شمولیت کی وجہ مذکورہ بالا واقعات بھی ہوسکتے ہیں مگر جو سب سے اہم وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ ہے اس موقع پر رجعت پسند مسلمانوں کی طرف سے کشمیر کمیٹی کا قیام اور اس کمیٹی کا صدر اور جنرل سیکریٹری قادیانیوں کا بنایا جانا۔ اس لیے کہ قادیانیوں کی نظر ہمیشہ کشمیر اور اہل کشمیر پر رہی ہے، اس کی وجہ قادیانیوں کے کچھ باطل عقائد ہیں۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی اپنی کتاب ''کشتیٔ نوح'' کے صفحہ ۵/اور ۶۹/ پر کہتا ہے:

''عیسی ابن مریم فوت ہوگیا ہے اور کشمیر سرینگر محلّہ خانیار میں اس کی قبر ہے''[1]

دوسری مثال قادیانیوں کی وہ ذہنیت ہے جسے خود مرزا غلام احمد قادیانی اپنی کتاب شہادت القرآن کے صفحہ ۶/اور ۹/ پر اپنے ماننے والوں کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے:

''سو یاد رہے کہ سوال ان کا نہایت ہی حماقت کا ہے، کیوں کہ جس کے احسانات کا شکر کرنا عین فرض اور واجب ہے اس سے جہاد کیسا؟

میں سچ کہتا ہوں کہ محسن کی بدخواہی کرنا ایک حرامی اور بدکار آدمی کا کام ہے، سو میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ خدا کی اطاعت کریں اور دوسری اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہے۔ سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے''[2]

چوں کہ اس کمیٹی کا صدر مرزا بشیر الدین محمود اور جنرل سیکریٹری عبد الرحیم درد (مرزائی) کو مقرر کیا گیا تھا، اگر مذکورہ بالا قادیانیوں کے مذہبی عقیدہ کی موجودگی میں بشیر الدین محمود کی قیادت کو تسلیم کرلیا جاتا تو صرف کشمیری مسلمانوں کے ایمان ہی ضائع نہ ہوتے بلکہ بیرون ہند کے مسلمان بھی اس اثر کو قبول کرتے۔

کمیٹی کے قیام کے لیے میاں سر فضل حسین کی دعوت پر جو لوگ شملہ میں جمع ہوئے ان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی تھے۔ لھٰذا جب احرار رہنماؤں کو کشمیر کمیٹی کی تشکیل کا علم ہوا تو فوراً ایک وفد کی صورت میں

---

[1] بحوالہ کاروان احرار، جانباز مرزا، ص:۱۷۹

[2] شہادۃ القرآن، مرزا غلام احمد، پنجاب پریس سیالکوٹ، طبع ثانی، ص:۸۵

ڈاکٹر اقبال سے ملے (یہ محسوس کرتے ہوئے کہ کشمیر کمیٹی کی وجہ سے تمام مسلمان مرزائی اور قادیانی ہو جائیں گے ہندو مسلم اتحاد کو سخت نقصان پہونچے گا) اور فرمایا:

''کیا آپ نے بھی قادیانی قیادت کو تسلیم کرلیا ہے، اگر آپ کی دیکھا دیکھی کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمان قادیانی ہوگئے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ مجرم ہوں گے۔ نیز قادیانی دوسرے اسلامی مسلمانوں پر بھی گمراہ کن اثر کریں گے۔ لھذا آپ ان سے علیحدگی کا اعلان کریں''

چنانچہ اس سے دوسرے روز برکت علی ہال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا، جس میں چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی بغیر کسی دعوت کے جا شریک ہوئے۔ چوں کہ ڈاکٹر اقبال حالات سے آگاہ تھے، انہوں نے قادیانیوں کے علاوہ باقی شرکاء اجلاس پر اپنا اثر استعمال کر کے بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی سے الگ کر دیا اور صدارت خود سنبھال لی۔ جس سے ۳ راگست ۱۹۳۱ء کو الگ ہوگئے اور کشمیر تحریک کی تمام تر ذمہ داری احرار کے سپرد کر دی گئی۔[۱]

تحریک کشمیر میں شمولیت کے متعلق ایک خاص بات یہ ہے کہ پنجاب اور دوسری جگہوں کے مسلمانوں کے علاوہ خود مولانا آزاد بھی یہ چاہتے تھے کہ احرار مسئلہ کشمیر کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور مہاراجہ کشمیر سے جمہوری معاملات کے متعلق گفتگو کریں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا قول ہے کہ:

''ہم (احرار کے چند زعماء) نے موجودہ کشمیر کمیٹی کے سیاسی سازش، ڈاکٹر اقبال کی کشمیر کمیٹی میں شمولیت، سر فضل حسین کی سرپرستی، انگریزی حکومت کی بدنیتی، فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلمان اتحاد کے بارے میں مولانا آزاد سے تفصیلی گفتگو کی۔ تو مولانا آزاد نے سب باتیں سن کر کہا: کہ احرار کو فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے مسئلہ کشمیر کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے اور مہاراجہ کشمیر کے سامنے ریاست کی ترقی کے لیے جمہوری مطالبات رکھنے چاہئیں۔ میرا یقین ہے کہ مہاراجہ صاحب تھوڑی سی جدوجہد کے بعد جمہوری مطالبات کو منظور کرلیں گے''[۲]

---

۱ کاروان احرار، جانباز مرزا، ص:۱۸۲

۲ رئیس الاحرار، عزیز الرحمٰن جامعی، ص:۱۵۸

تحریک کشمیر کی براہ راست ذمہ داری آنے پر مجلس احرار نے ۱۸/اگست ۱۹۳۱ء کو اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس لاہور میں کیا، جس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کی گئیں، جو مختصراً اس طرح ہیں:

(۱) مجلس احرار کشمیر ایجی ٹیشن کو ہندو مسلم مسئلہ تصور نہیں کرتی۔ کشمیر کے کسانوں اور مزدوروں کی حالت ایسی تباہ کن اور دردناک ہے کہ ہندوستان میں کسی بھی مزدور اور کسان کی نہ ہوگی۔

(۲) مجلس احرار کا یہ ہرگز ارادہ نہیں کہ ہز ہائینس مہاراجہ کشمیر کو گدی سے اتار دیا جائے گا اور نہ ان علاقوں میں مسلم راج قائم کرنا مقصود ہے۔

(۳) مجلس احرار ریاستی معاملات میں برطانوی مداخلت کو دعوت دینے کے لیے تیار نہیں، اور چاہتی ہے کہ اس سلسلے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں ان سب کو دور کرے۔

(۴) احرار حکومت کشمیر کو انسانوں کا نظام بنانے اور موجودہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے پرامن اور جائز ذرائع اختیار کرے گی۔

(۵) عملی کام شروع کرنے کے لیے مجلس احرار مولانا مظہر علی اظہر کو تحقیقاتی کمیٹی کا قائد مقرر کرتی ہے، تاکہ سری نگر جا کر تحقیقات کریں۔

(۶) مجلس احرار ۱۹/اگست سے ۲۵/اگست تک ہفتہ کشمیر مقرر کرتی ہے جسے ہندوستان بھر میں منایا جائے۔

(۷) اس ہفتے کے فوراً بعد تحقیقاتی وفد سری نگر روانہ کیا جائے گا، اگر ارکان کمیٹی کو سری نگر داخل نہ ہونے دیا، یا انہیں گرفتار کرلیا گیا تو فوراً سول نافرمانی شروع کردی جائے گی۔[۱]

دستخط

حبیب الرحمٰن۔ افضل حق۔ مظہر علی اظہر۔ داؤد غزنوی

جاری کردہ: دفتر مجلس احرار اسلام

۱۸/اگست ۱۹۳۱ء لاہور

---

[۱] کاروان احرار، جانباز مرزا، ص:۱۸۳

کشمیر کی طرف پہلا وفد:

کشمیر کے بگڑتے ہوئے حالات نے جب ہندوستان اور خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا تو مجلس احرار کا وفد مولانا مظہر علی کی قیادت میں کشمیر کے لیے روانہ ہوا، ابھی یہ وفد راستہ ہی میں تھا کہ مولانا مظہر علی کے نام ایک خط وزیر اعظم کشمیر کا آیا کہ میرا نمائندہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ مولانا نے نمائندہ سے ملاقات کی اور اس شرط پر احرار کو کشمیر جانے کی دعوت دی گئی کہ ریاست کے اندر کسی قسم کا مظاہرہ نہ کیا جائے، ریاستی معاملات کی تحقیقات غیر جانب دار ہو اور احرار رہنما ریاست کے مہمان ہوں گے۔ اس طرح ۴ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو احرار کا پہلا وفد کشمیر میں داخل ہوا۔

مولانا مظہر علی نے عوام سے بھی رابطے قائم کیے اور حکومت کشمیر سے بھی گفتگو چلتی رہی۔ حکومت کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا اور کشمیر کے حالات مزید خراب سے خراب تر ہوتے رہے، لہذا یہ وفد جو ۲ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے اور حکومت کشمیر سے گفتگو کے لیے گیا تھا، وہ ۳ر اکتوبر کو بغیر کسی نتیجے کے واپس آ گیا۔

احرار رہنماؤں نے چوں کہ خلوص نیت کے ساتھ اس تحریک کا بیڑہ اٹھایا تھا، اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب سول نافرمانی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ لہذا سول نافرمانی شروع ہوگئی، مولانا مظہر علی کو اس تحریک کا پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ ساتھ ساتھ احرار کے لیے زیادہ سے زیادہ رضا کار بنائے جانے لگے۔

جماعتی فیصلے کے تحت مولانا مظہر علی نے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کر دیا اور ۱۱۳ر مجاہدین کو لے کر کشمیر روانہ ہوگئے، مولانا نے اپنے بعد شیخ حسام الدین کو ڈکٹیٹر مقرر کیا۔ مولانا مظہر علی کو کشمیر جاتے ہوئے جب گرفتار کیا گیا تو شیخ حسام الدین صاحب نے ان کی نیابت کے فرائض انجام دیے۔ اس طرح اس تحریک کے شروع ہوئے ابھی تیسرا دن ہی تھا کہ کشمیر میں مارشل لاء نافذ تھا اسے واپس لے لیا گیا، تمام قیدی رہا کر دیے گئے، ان تین دنوں میں تقریباً احرار کے ساڑھے تین ہزار رضا کار گرفتار ہو چکے تھے۔

دوسرا وفد:

مہاراجہ کشمیر نے احراریوں کو رہا کرنے کے بعد پھر مولانا مظہر علی کے نام دعوت نامہ بھیجا کہ آپ کشمیر آئیں تاکہ باہم مل کر گفتگو کیا جاسکے۔

مجلس احرار کی لڑائی ۳۲ر لاکھ کشمیریوں کی آزادی کی تحریک تھی جیسے پنجاب کا مسلمان خصوصاً اپنے جذبۂ ایمان سے لڑ رہا تھا۔ کشمیر کی پچانوے فی صد مسلمان آبادی ہندو راجہ سے اپنے پیدائشی حقوق کی طالب تھی، اور محض اسی جرم میں غیر مسلم حکمراں اپنی رعایا کو گولیوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اول انسان اور پھر مسلمان کی حیثیت سے مجلس احرار نے کشمیر کے مظلوموں کی حمایت کا بیڑہ اٹھایا اور ۹ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو پھر سے دوسرا وفد روانہ ہوا کہ حکومت کشمیر سے مل کر مسئلے کا صحیح حل ڈھونڈھا جاسکے اور عوام پر ہو رہے تشدد کو روکا جاسکے، مگر افسوس کہ نہ گفتگو کا صحیح حل سامنے آسکا اور نہ تشدد میں کمی آئی۔ آخر کار حالات کا معائنہ کرنے کے بعد چودھری افضل حق نے وزیر اعظم کشمیر کو مشورہ دیا کہ:

> ''تشدد سے کشمیر میں امن وسکون قائم نہیں ہوسکتا، بیداری کی جو روح عوام میں پیدا ہو چکی ہے، اسے آپ کا تشدد اب کسی صورت میں دبا نہیں سکتا، اگر آپ اپنے ملک کو اس کی ضرورت کے مطابق اصلاحات دیدیں، جس سے کشمیری عوام کو کشمیر کے اندر حکومت میں جائز جگہ مل سکے تو صورت حال بہتر ہو جائے گی اور کشمیر میں مستقل امن قائم ہو جائے گا''[1]

گو اس دوران احرار رہنماؤں کی گفتگو حکومت کشمیر سے چل رہی تھی، مگر اس وقت حکومت کشمیر کے تیور کچھ بدلے ہوئے تھے، اس لیے احرار رہنماؤں کا وہاں ٹھہرنا تضیع اوقات کے مترادف تھا، چنانچہ یہ وفد پھر سے ناکام ہو کر واپس آ گیا۔ احرار رہنماؤں کا اس سفر میں خاص مطالبہ تھا کہ خود مختار اسمبلی کا قیام کیا جائے، جس کے لیے حکومت کشمیر آمادہ نہیں تھی۔ لہذا واپسی کے بعد احرار رہنماؤں نے پھر سے سول نافرمانی شروع کر دی، اس ارادے کے ساتھ کہ اب حکومت کشمیر سے مسلمانوں کو ان کے حقوق دلوا کر ہی رہیں گے۔

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۰۴

سول نافرمانی:

۳۰/اکتوبر ۱۹۳۱ء تاریخ کشمیر کا ایسا دن ہے، جب پنجاب کے مسلمانوں نے احرار کے زیر سایہ کشمیر کے غلام مسلمانوں کو ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے غیر آئینی تحریک کا آغاز کیا، ریاستی حکام احرار کی طاقت سے خائف نہیں تو غیر مطمئن ضرور تھے۔ احرار کے سول نافرمانی کی خبر ہر طرف آگ کی طرح پھیلنے لگی، چناں چہ ہر مورچہ پر ڈوگرہ فوج پورے ساز و سامان سے لیس احرار رضا کاروں کا انتظار کرنے لگی۔

اس وقت کی سول نافرمانی نے یہ بتادیا کہ احرار بھی حکومت وقت سے ٹکرانے اور اپنی بات منوانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مختلف سمتوں سے احرار رضا کار کشمیر کی طرف بڑھتے گئے، گرفتاریاں بھی ہوتی رہیں، نئے جتھے بھی تیار ہوتے رہے، وقتاً فوقتاً نئے رضا کاروں کی راہنمائی کے لیے مرکزی دفتر سے اعلانات بھی شائع ہوتے رہے۔

اس سول نافرمانی کے دوران جب مولانا معین الدین اجمیری کو ڈکٹیٹر شپ بنایا گیا، اس وقت یہ تحریک تقریباً پنجاب اور اس کے اطراف و جوانب بھی پھیل چکا تھا، ملک کا بیشتر حصہ اس کے اثر میں آچکا تھا۔ مولانا نے ایک پروگرام مرتب کیا، تاکہ احرار رضا کاروں کو اس پروگرام کے تحت عمل کرایا جاسکے، لیکن حکومت وقت کے ہاتھوں اس تحریر کو ضبط کرلیا گیا۔ خط کو پڑھنے کے بعد احرار رضا کاروں کے عملی اقدام کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ تحریری پروگرام کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

پروگرام:

محترمی اسلام علیکم.....اس پروگرام پر فوراً عمل کیا جائے

دنیا جانتی ہے کہ ہم نے شروع سے لے کر اس وقت تک ہندو اور انگریز سے انصاف کے نام پر اپیل کی ہے، تاکہ وہ کشمیر کی آبادی کو بدترین غلامی سے نجات دلانے میں ہماری مدد کریں، مگر کمزور کی اپیل کا جو اثر زور آور کی بارگاہ میں ہوتا ہے، وہی ہماری التجاؤں کا ہوا۔ ہندو نے مظلوم کی حمایت کو فتنہ قرار دیا اور انگریز کی نظر میں ہم باغی ٹھہرے۔ برٹش گورنمنٹ بجائے جج کی حیثیت اختیار کرنے کے ایک فریق کی حیثیت اختیار کرلی اور انتیس ہزار فرزندان توحید کو نظر بند کردیا گیا۔ مجلس احرار کو انگلستان سے.....(عبارت

واضح نہیں ہے) .....اور پورے چار ماہ کا عرصہ اس امید پر گذرا کہ برٹش گورنمنٹ ہمارے مطالبات کی بالآخر امداد کرے گی، لیکن معلوم ہوا کہ ریاست میں انگریزی اقتدار کو بڑھانے کا یہ زرّیں موقع سمجھا گیا ہے، گویا یہ کشمکش کشمیری مسلمانوں کے فائدے کے لیے نہ تھی، بلکہ انگریز کے مفاد کے لیے تھی۔ ہری کشن کول کی جگہ مسٹر کالون کا تقرر عمل میں لایا گیا اور اس اعلان میں اس کی تشریح کرنے کی زحمت گوارا نہ کی گئی کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا کیا حشر ہوگا۔

صوبہ سرحد میں جو بے پناہ تشدد ہو رہا ہے، مسلمان اس سے سخت مضطرب ہیں۔ ہندوستان کی تمام جماعتوں کی طرف سے جمعہ کے دن یوم سرحد منایا گیا۔ مگر حکومت ابھی مزید تشدد کے لیے تشنہ ہے۔ اور آرڈننسوں کی منسوخی سے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے بجائے تشدد آمیز پالیسی برابر جاری ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے آئنی حقوق کا مسئلہ بدستور کھٹائی میں پڑا ہے۔ غرض مسلمانوں کے ہر مطالبہ کے جواب میں دعوائے فرداہی ہے۔ آخر ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہندوستان کی مسلم آبادی کس کی تغافل شعاریوں سے نالاں ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انگریز پُر اضطراب کی تہہ میں ہے۔

عزیزو! جس قوم میں ناراض ہونے کی اور مقابلہ کرنے کی قوت ہے۔ اس کو راضی کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ جو قوم کبھی ناراض ہی نہ ہو، اسے راضی کرنے کی کوشش کوئی کیوں کرے۔ آخر حکومت کرے بھی تو کیا۔ ایک طرف کانگریس ہے جس کے جھنڈے تلے لاکھوں انسان ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ بڑے سے بڑا ہندو کچھ نہ کچھ قربانی کرتا ہے۔ ہندو قوم .....واقفیت کوش ہمارے انتہا پسند کے برابر آواز بلند کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کا حکام اور امراء کا طبقہ قوت عمل سے بالکل عاری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حکومت انتظار کر رہی ہے، کہ اگر کانگریسی دو تین ماہ میں دب گئے تو مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہیں، اس کو بھی آسانی سے دبا لیا جائے گا۔ اور اگر صلح کرنی پڑی تو بھی کانگریس سے ہی صلح کرنی مناسب ہوگی۔ اس لیے مسلمان جب تک خود بخود بطور ہتھیار کے استعمال کیا جا سکے کیا جائے۔ جب اس کی ضرورت نہ رہے تو پہلو سے نکال کر پھینک دیا جائے۔

اس لیے میں ہندوستان کی سیاسیات کو مدنظر رکھ کر اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کانگریس ایک فعال

جماعت ہے، اس لیے انگریز اس سے ہراساں ہے۔ مسلمان نے قوت عمل کا مظاہر نہیں کیا، اس لیے اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ بے شک یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں نے اپنی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔ مگر اس مقصد عالی کو حاصل کرنے کے لیے تب تک قربانی جاری رکھنی چاہیئے تا آنکہ دولت وذہن پر تمہاری قوت کا سکہ بیٹھ جائے۔

چوں کہ

(۱) کشمیر میں انگریز کا اثر واقتدار ایک نا قابل انکار حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

(۲ آئین کے متعلق کوئی صاف اور صریح اعلان نہیں کیا جاتا۔

(۳) صوبہ سرحد میں تشدد کا ہاتھ نہیں رکا۔

اس لیے میں تمام مجالس ماتحت کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اب برطانوی ہند میں ایک ایسا پروگرام شروع کریں جس کی زد براہ راست انگریز پر پڑتی ہو۔ چنانچہ تمام مجالس ماتحت کے نام ہدایت جاری کی جاتی ہے، کہ وہ پانچ قسم کی نافرمانی میں سے مقامی مصلحت کی بناء پر جونسا پروگرام چاہیں جاری کردیں۔

(۱) کشمیر آرڈی ننس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر کی طرف بدستور دستے روانہ کرنا جاری رکھیں۔

(۲) ریلوے ایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے۔ یعنی آئندہ تمام مجالس احرار کے رضا کار بلاٹکٹ ریل گاڑی کا سفر کریں۔

(۳) ڈاکخانہ جات ایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے۔ اور بیرنگ خطوط لکھے جائیں۔

(۴) بدیشی کپڑوں کی دوکانوں پر پرامن پکٹنگ کیا جائے۔

(۵) شراب کی دوکانوں پر پرامن پکٹنگ کیا جائے۔

سول نافرمانی کے مراکز:

لاہور، امرتسر، ملتان، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، دہلی، وزیرآباد، راولپنڈی، جالندھر، ان اضلاع سے ملحقہ مقامات ان مراکز کی امداد کریں۔

مجالسی ماتحت مندرجہ ذیل مقامات پر دستے روانہ کریں

امرتسر کے لئے۔ضلع امرتسر کی ماتحت مجالس پٹی بٹالہ گورداسپور سے رضا کار آنے چاہئیں۔

لاہور کے لیے۔ضلع لاہور کی ماتحت مجالس۔ہٹور، فیروز پور، گوجرانوالہ، منٹگمری سے رضا کار آنے چاہئیں۔

جھیلم، گجرات، لائلپور۔یہ مقامات کشمیر کو دستے بھیجیں۔

سیالکوٹ۔شراب پر پکٹنگ کی جائے۔

امرتسر۔لاہور میں صرف کپڑے کی مارکیٹ پر پکٹنگ کی جائے۔

جالندھر، وزیر آباد، گوجرانوالہ، ملتان و دیگر مراکز اپنے اپنے مقامات پر شراب پر پکٹنگ کریں۔ زیادہ زوردار پکٹنگ ان شراب خانوں پر کی جائے جو اندرون شہر واقع ہوں۔

دہلی میں کپڑے کی مارکیٹ پر پکٹنگ ہو۔

مرادآباد، میرٹھ، سہارنپور، رہتک دہلی کی امداد کریں۔

سردست بیرون صوبہ پنجاب کی مجالس صرف پہلے تین ہدایات کی تعمیل کریں۔یعنی بغیر ٹکٹ سفر کیا جائے۔اور کشمیر آرڈی ننس کی خلاف ورزی کی جائے اور بیرنگ خطوط لکھے جائیں۔

مفصلہ بالا پروگرام کو عملی صورت میں لانے کے لیے حسب ذیل ہدایات پر عمل کیا جائے۔

(ا) تمام مجالس ماتحت اپنے اپنے رضا کاروں کو دو گروہوں میں تقسیم کریں۔ پہلا گروہ جو کشمیر کی حدود میں داخل ہونے کی جدوجہد جاری رکھے۔

دوسرا گروہ صرف ذیل کے امور پر عمل پیرا ہو۔ایک دستہ جو زیادہ سے زیادہ پچیس رضا کاروں پر مشتمل ہو ایک کپتان کے ماتحت ریلوے ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے کے لیے بلاٹکٹ ریلوے، ٹرین پر سوار ہو۔اگر وہ کسی رکاوٹ کے باعث اسٹیشن کے اندر داخل نہ ہوسکیں تو قریب ترین اسٹیشن کا ٹکٹ یا پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر گاڑی میں سوار ہو جائے۔اور گاڑی روانہ ہونے کے بعد ٹکٹ پھاڑ ڈالے۔اور جب ان سے ٹکٹ طلب کیا جائے تو وہ ان الفاظ میں اس امر کا اقرار کریں۔کشمیر کی طرف جا رہے ہیں اور بلاٹکٹ

ہیں۔ ہمیں گرفتار کرلیا جائے۔

(ب) تمام رضا کار ہر ایک جگہ ایک ہی ڈبہ میں بیٹھیں اور اس وقت تک جمے رہیں جب تک انھیں گرفتار نہ کیا جائے اور آگے بھی بڑھنے نہ دیا جائے، تو وہ پر امن طریقہ سے اپنے مظاہرہ کو جاری رکھیں اور کسی قسم کا تشدد عمل میں نہ لایا جائے اور نہ ہی کوئی جلوس یا ہجوم لے کر اسٹیشن کے قریب جایا جائے، تا کہ کسی قسم کا امن سوز واقعہ پیش نہ آئے۔

(ج) اگر رضا کاروں کی تعداد کافی ہو تو ایک یا ایک سے زیادہ دستے روزانہ روانہ کیے جائیں۔

(د) پولیس یا حکام ریلوے اگر رضا کاروں کو کسی مقام پر زبردستی اتارنے میں کامیاب ہو جائے، تو رضا کاروں کو چاہئے کہ وہ پر امن طریقے سے دوسری ٹرین پر دوسرے اسٹیشن سے سوار ہونے کی کوشش کریں۔ بلاٹکٹ سفر کرنے کو کامیاب بنانے کے لیے چھوٹے اسٹیشن زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔

(س) تمام ماتحت مجالس اپنے اپنے مرکزوں میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں دستے روانہ کرتی رہیں۔

سوئم — ڈاکخانہ جات کے ایکٹ کی خلاف ورزی کرنے کے لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ تمام مجالس کے ارکان، رضا کاران اور ہمدردان اس اتوار کو اور ہر اتوار وائسرائے ہند دہلی کو بیرنگ یعنی بلاٹکٹ خطوط لکھیں جس کا مضمون ہو:

''مسلمان ایک زندہ قوم ہے، وہ کسی تشدد سے نہ ہی دبے گی، نہ ہی ڈرے گی اور نہ ہی اپنے مطالبات کو منظور کرائے بغیر چین سے بیٹھے گی''

مجالس ماتحت کی تشفی کے لیے یہ تحریر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی پروگرام پر نکتہ چینی نہ ہونی چاہئے کہ وہ ایک معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ دنیا پر یہ امر پوری طرح واضح ہو چکا ہے کہ پروگرام کا بُرا یا بھلا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، بلکہ ہر معمولی سے معمولی پروگرام کی کامیابی اپنی آمادگی یا عدم آمادگی پر منحصر ہوتا ہے۔ شیر اپنا راستہ خود بناتا ہے، وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بہتا۔ بلکہ طغیانی کے وقت بھی سیدھا چلتا ہے۔ اس لیے متحد اور متفق ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ عملی جامہ پہنائیں پھر بارگاہ قدوس سے کامیابی کے منتظر رہیں۔

تمام مجالس ماتحت کو مفصل بالا پروگرام کا اعلان ۲۵ر فروری ۱۹۳۲ء بروز اتوار بعد نماز جمعہ، جلسہ

عام منعقد کر کے پڑھ کر سنایا جائے۔ تمام مجالس اپنے اپنے عہدیداروں کے نظام کو منسوخ کر کے ڈکٹیٹر شپ کا سلسلہ جاری کریں۔

موجودہ حالات میں جن ہدایات کے جاری کرنے کی ضرورت تھی ان کا اعلان کر دیا گیا ہے، بعد ازاں جن جن امور کے متعلق ضرورت محسوس ہوگی برابر اعلان جاری ہوتا رہے گا۔ اس لیے عام مجالس ماتحت باقاعدہ روزانہ کا کام، گرفتاری کی تعداد اور اپنی دقتوں کے متعلق دفتر کو مطلع کرتے رہیں۔ جن کے لیے مجلس سے ہدایات حاصل کرنی ضروری ہوں۔

نوٹ: تمام مجالس ماتحت پروپیگنڈہ کا پلیٹ فارم کانگریس سے علیحدہ رکھیں۔[1]

(مولانا) معین الدین اجمیری

ڈکٹیٹر مجلس احرار اسلام ہند

مذکورہ بالا تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک احرار رضا کاروں کی طرف سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد تقریباً انتیس ہزار پہونچ کر تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مولانا نے جس طریقے سے پروگرام کو مرتب انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے انگریزوں کی بے اعتنائی اور جبر و تشدد کی وضاحت کی ہے، مسلمانوں کو ان کی کمزوری پر متنبہ کرتے ہوئے انہیں خواب خرگوش سے جاگنے کی تلقین کی، ہندوستان کے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد جس طرح سے سول نافرمانی کے لیے لوگوں کو تیار کیا اور اس کا طریقہ کار بھی بتایا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تحریک پورے ہندوستان کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔ صرف چار ماہ کے دوران انتیس ہزار افراد گرفتار کیے گئے تھے۔ یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ ان چار ماہ کے دوران صرف احرار رضا کاران اس تحریک کو چلا رہے تھی۔ کسی سیاسی یا غیر سیاسی پارٹی نے ان کا اس تحریک میں ساتھ نہیں دیا، ہاں البتہ بعض جماعتوں کی طرف سے اختلافات ضرور ہوئے۔

مجلس احرار کے علاوہ صرف ایک جماعت تھی جس نے حکومت کشمیر اور مجلس احرار کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ وہ جماعت تھی ''جمعیۃ العلماء ہند'' جمعیۃ العلماء کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحبان نے حتی المقدور کوشش کی کہ مجلس احرار اور حکومت کشمیر کے درمیان

---

[1] ہوم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ، نیشنل آرکائیوز دہلی، فائل ۱۹۳۲ء

مصالحت ہو جائے۔ ہزار کوششوں کے باوجود بھی یہ حضرات کامیاب نہ ہو سکے اور واپس آ گئے۔

کشمیر ایجی ٹیشن کے متعلق مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا احمد سعید سے سی آئی ڈی کے ایک افسر نے دلی کے صوبائی جیل میں ۲۱/۲۲ رفروری ۱۹۳۲ء کو پوچھ تاچھ کی تھی، جس کا جواب مولانا نے سی، آئی، ڈی کی رپورٹ کے مطابق یہ دیا:

''کشمیر میں وزارت تبدیل ہونے سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے اور انگریزی نوکر شاہوں کی جگہ ہندو نوکر شاہوں نے لے لی ہے، جو کہ احرار کی مانگ کے مطابق نہیں ہے''[1]

احرار زعماء کی طرف سے چلائی گئی یہ تحریک حکومت کشمیر کے ساتھ ساتھ حکومت پنجاب کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہوتا جا رہا تھا، لیکن احرار کے خلاف کوئی سخت کاروائی کرنے سے پہلے حکومت چاہتی تھی کہ ہر پہلو پر پہلے غور کر لیا جائے، یہی وجہ ہے کہ ایمرسن 'گورنر پنجاب' نے پہلے اس مسئلے پر سی، آئی، ڈی سے گفتگو کی اور اس سے چند سوالات کیے جو اس طرح ہیں:

۱۔ احرار کس مدعا کو لے کر عوام کے پاس جا رہے ہیں؟

۲۔ کیا پروگرام ہے ان کا اور کوئی مینیفسٹو بھی چھپا ہوا ہے؟

۳۔ اگر ہم عملی کاروائی کے بجائے کاغذی کاروائی کریں تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟

مذکورہ تینوں سوالات کے جواب سی، آئی، ڈی نے یہ دیے ہیں:

۱۔ احرار کا کشمیر کے معاملے میں یہ ماننا ہے کہ انگریزی سرکار کشمیر کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس وجہ سے احرار کا دربار کے خلاف ایجی ٹیشن کامیاب نہیں ہو پا رہا ہے، اس لیے احرار پہلے انگریزی سرکار کو گرانا چاہتی ہے۔ احرار کو انگریزی سرکار سے یہ شکایتیں ہیں:

۲۔ الف۔ احرار کا دربار کے خلاف ایجی ٹیشن سے برٹش سرکار کو کشمیر پر پکڑ مضبوط کرنے کا موقع مل گیا جو کہ احرار کا مقصد نہیں تھا اور اس غلطی کا سدھار ہونا چاہیے تھا۔

ب۔ کشمیر کے نئے دستور میں مسلمانوں کا صحیح طور پر خلاصہ نہیں کیا گیا ہے۔

ج۔ سرحدی صوبہ میں ظلم ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔

---

[1] ہوم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ نیشنل آرکائیوز دہلی، فائل نمبر ۱۵۲۶۷، ۴/مارچ ۱۹۳۲ء

۳۔احرار میں زیادہ تر شہروں کے لوگ شامل ہیں، گاؤں کی عوام ان کا ساتھ دے سکتی ہے، لیکن وہ اس کے لیڈران کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ وہ کانگریس کے زیر اثر ہیں۔ احرار کے لیڈران کو کانگریس میں شامل کرنے کے لیے رشوت دی گئی تھی اور لاہور کے ایک عام جلسہ میں (۱ر مارچ ۱۹۳۲ء) ۶ر ہزار روپے تک دینے کی بات کہی گئی تھی۔

اگر انگریزی سرکار احراریوں کو کانگریس کے ساتھ جوڑ کر کوئی عملی کاروائی کرتی ہے تو اس سے لوگوں کے شکوک یقین میں بدلے جانے کی امید ہے۔

احرار کا نیا پروگرام حکومت کے لیے ایک اہم چیلنج ہے۔صرف لاہور میں ہی سول نافرمانی کی چند کوششیں ہوئی ہیں، جو بہت کامیاب نہ ہوسکیں۔ رضا کاروں کی بھرتی کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ملی ہے اور احرار میں ہی اچھا خاصا طبقہ سول نافرمانی کے حق میں نہیں ہے، اس وجہ سے پارٹی کے ٹوٹنے کا امکان بھی ہے۔[۱]

تحریک کشمیر احرار زعماء کی کوششوں سے چلتی رہی۔ لوگوں کی گرفتاریاں اور پُر تشدد واقعات بھی سامنے آتے رہے۔تحریک نے مزید طول پکڑ لیا، احرار اپنی تہی دامنی کے باوجود کوشاں تھے۔ کچھ حد تک کامیابی بھی ملی۔ مہاراجہ کشمیر نے بہت سے ایسے قوانین جس سے کشمیری عوام بدظن تھی واپس لے لیا۔ جس کا ذکر انشاء اللہ آئے گا۔

تحریک کے دوران جو حالات پیش آئے اس کا منظر نامہ جناب محمود علی خاں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''تحریک حریت کشمیر کے دوران میں غزوۂ بدر واحد کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے تھی، ماؤں نے اپنے نوجوان بیٹوں کو دودھ کا واسطہ دے کر اور بیویوں نے اپنے خاوند کو پھولوں کے ہار پہنا کر محاذ پر بھیجا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم نونہالان اسلام نے اپنے نام رضا کاروں کی فہرستوں میں لکھانے کی کوششیں کیں اور ضدیں کیں کہ ہم کو بھی محاذ پر بھیجا جائے۔ جناب شیخ حسام الدین صاحب بی اے۔ جنرل آفیسر کمانڈنگ جیوش احرار نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ، میرے پاس چند بچے آئے اور انہوں نے رضا کار بننے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ناپا تو ان

---

[۱] ہوم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ، نیشنل آرکائیوز دہلی، فائل نمبر (۵۵) ۱۵۲۶۷، ۴ر مارچ ۱۹۳۲ء

کے قد چھوٹے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ تمہارے قد چھوٹے ہیں تو وہ پنجوں پر کھڑے ہو گئے اور اب بھی پورے نہ ہوئے تو ضد کرنے لگے اور انہوں نے بھوک ہڑتال کی دھمکی بھی دی۔ میں نے مجبور ہو کر کہا کہ اچھا تو اتنے ہی اور بچے لے آؤ تو تم کو محاذ پر بھیج دیا جائے گا شیخ صاحب فرماتے تھے کہ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب بہت ہی قلیل عرصہ میں وہ بچے اتنی تعداد پوری کر لائے''[۱]

تحریک کشمیر کے متعلق ''علامہ اقبال کی سیاسی زندگی'' کے مصنف لکھتے ہیں:

''کشمیر کی صورت حال پر پنجاب کے مسلمان خاموش نہ رہ سکے، مجلس احرار نے اگست ۱۹۳۱ء میں کشمیریوں کی امداد کے لیے کئی محاذوں پر کشمیر کے جتھے بھیجنے شروع کر دیے۔ مختلف مقامات سے ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں نے ''کشمیر چلو'' کے نعرے لگاتے ہوئے ریاست کے اندر داخل ہونے لگے اور انہوں نے کشمیر کی جیلیں بھر دیں۔ حکومت کشمیر نے تنگ آ کر حکومت پنجاب سے احرار کی نگرانی میں چلنے والی اس تحریک کو روکنے کی اپیل کی۔ اس پر حکومت نے رضا کار، کو اپنی ہی سرحد پر روکنا شروع کر دیا، جو لوگ سرحد پار کر جاتے انہیں کشمیر کی پولیس گرفتار کر لیتی تھی، کہیں کہیں پولیس نے لاٹھی بھی چارج کیا''[۲]

اثر ابن یحییٰ اپنی کتاب میں تحریک کشمیر کے متعلق بیان کرتے ہیں:

''۲۲ر جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں مجلس احرار کا اجلاس ہوا، اس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین بی اے، مولانا احمد علی، مولانا مظہر علی اظہر، ڈاکٹر عبد القوی اور شورش کاشمیری وغیرہ نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریک کشمیر پر غور کیا اور یکم اگست سے اس میں حصہ لینا شروع کر دیا جسے شیخ محمد عبد اللہ اور ان کے رفقاء چلا رہے تھے، ریاست کا ڈوگرا حکمراں چنداں متاثر و مرغوب نہ تھا۔ سیالکوٹ سے جموں تک جتھوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ تحریک کشمیر ختم ہوتی گئی''[۳]

---

۱ مجلس احرار کی اہمیت و ضرورت، محمود علی خان، ہمدرد پریس سہارن پور، ص: ۱۰

۲ علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، محمد سلیم، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص: ۱۳۲

۳ مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری، اثر بن یحییٰ، نورانی پریس مالیگاؤں، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۴۵

جناب اثر بن یحیی صاحب نے تحریک کشمیر کے متعلق مذکورہ بالا جو رپورٹ تحریر کی ہے اس میں کئی جگہ موصوف نے غلط بیانی سے کام لیا ہے، اول تو یہ کہ موصوف نے زعماء کے ناموں میں شورش کاشمیری کا ذکر کیا ہے، جبکہ شورش کاشمیری ۲۷ رفروری ۱۹۳۹ء میں احرار میں شامل ہوئے تھے۔ شورش لکھتے ہیں:

''۲۷ ر، فروری ۱۹۳۹ء پہلا دن تھا کہ میں احرار میں شمول کا اعلان کیا''[1]

دوسری غلطی یہ ہے کہ موصوف لکھتے ہیں'' یکم اگست سے اس میں حصہ لینا شروع کر دیا جسے شیخ عبداللہ اور ان کے رفقاء چلا رہے تھے'' جبکہ صحیح یہ ہے کہ کشمیر تحریک کی ذمہ داری احرار کو ۳ راگست کو ملی ۱۸ ر اگست کو انہوں نے اپنی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کیا اور ۲ رستمبر کو احرار کا وفد مہاراجہ سے ملنے پہلی بار کشمیر گیا۔ ۳ ر اکتوبر کو واپسی پر سول نافرمانی شروع کر دی گئی۔ اور یہ پوری تحریک مجلس احرار کے جھنڈا تلے چلتی رہی۔

تیسری غلطی موصوف کا وہ نظریہ ہے کہ جو کسی بھی تحریک کو بے اثر ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ'' ریاست کا ڈوگرہ حکمراں چنداں متاثر و مرعوب نہ تھا'' جبکہ ڈوگرہ حکمراں کے متاثر ہونے کی اس سے اچھی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ مہاراجہ نے ایک خط کے ذریعہ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحبان کو دعوت دی کہ حکومت اور احرار کے درمیان مصالحت کرائیں۔ وزیر اعظم جموں کشمیر کا یہ قول کہ:

''میں آپ کی تکلیف فرمائی کا ممنون ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ بزرگان کی کوشش سے اس تلخی کو جو کشمیر اور احرار میں پیدا ہو کر دونوں کے لیے پریشانی اور تکلیف کا سبب بن رہی ہے۔ دور کرنے میں کامیابی ہوگی''[2]

جبکہ معاملہ یہاں پر ختم نہیں ہوا، بلکہ کچھ ہی دنوں بعد حکومت کشمیر نے تنگ آ کر حکومت پنجاب سے احرار کی نگرانی میں چلنے والی اس تحریک کو روکنے کی اپیل کی تھی، جس کی وجہ سے پنجاب میں جگہ جگہ رضا کاران گرفتار ہوئے۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی اپنے ایک مضمون کے ضمن میں تحریک کشمیر میں احرار کی شمولیت کی وجہ خاص طور پر قادیانیوں کا کشمیر کمیٹی کا قیام اور اس کے ذریعہ مرزا محمود کا اپنی قیادت کو تسلیم کرانا بتاتے ہیں۔

---

[1] بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل، شورش کاشمیری، ص: ۱۸۶

[2] کاروان احرار، جانباز مرزا، ص: ۲۲۹

مولانا فرماتے ہیں:

''۱۹۳۱ء میں کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کے خلاف مسلمانان کشمیر نے علم حریت بلند کیا، قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر ''آل انڈیا کشمیر'' کی تشکیل کی، جس کا صدر خود مرزا قادیانی تھا، اور سکریٹری شپ بھی قادیانیوں کے ہاتھ میں تھی، ہندوستان کے بڑے نام آور لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے، اس کمیٹی کا مقصد مسلمانان کشمیر کی دادرسی ظاہر کیا گیا، لیکن اندرونی مقاصد کچھ اور تھے، ان میں سب سے بڑا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر مرزا محمود کی قیادت میں متحد ہیں اور وہ انہیں اپنا قائد اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں، یہ گویا ان مذہبی فتووں کا جواب تھا جو علمائے امت کی جانب سے قادیانیوں کے خلاف صادر ہو رہے تھے، ''احرار اسلام'' نے اس قادیانی سازش کا بروقت نوٹس لیا، اور قادیانی عزائم کو طشت از بام کیا، نتیجتاً ''آل انڈیا کشمیر کمیٹی'' اپنی موت آپ مرگئی، اور علامہ محمد اقبال مرحوم نے اپنے بیانات میں قادیانی ذہنیت کو، جو اس کمیٹی کے قیام میں کارفرما تھی، عالم آشکارا کر دیا''[۱]

تحریک کا اختتام:

جس طرح سمندر میں طغیانی اور صحراؤں میں بادسموم کے طوفان اٹھتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں، غلام ملکوں کی سیاسی تحریکات اسی طرح جنم لیتی ہیں اور اپنی موت مرجاتی ہیں۔

کبھی حکومتوں کے تشدد انہیں کھا جاتے ہیں، اکثر ایسا بھی ہوا کہ حالات راستے کی رکاوٹ بن گئے اور وہ آگ جس سے حکومتوں کا وقار جلنا چاہیے تھا، جماعتوں کو وقتی طور پر لے بیٹھتی ہیں۔

مہاراجہ کشمیر کا مذہبی تعصب، شیخ عبداللہ کا سیاسی فقدان، قادیانیوں کی عیاری اور پنجاب کے ٹوڈی روسا کے احرار کے مقابل احساس کمتری نے بتیس لاکھ کشمیریوں کی زنجیریں جو ۱۹۳۱ء کی عوامی تحریک کے نتیجے میں ٹوٹنے والی تھیں اور بھی مضبوط تر ہوتی گئیں۔

۲/اکتوبر ۱۹۳۱ء سے جون ۱۹۳۲ء تک کشمیر کی آزادی کے لیے مجلس احرار نے جس قدر جدوجہد کی

---

[۱] ماہنامہ الرشید لاہور، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، دارالعلوم دیوبند نمبر، ص: ۶۹۴

اگر کشمیری رہنما ذاتی مصلحتوں سے ماورا رہ کر مجلس احرار کی عوامی تحریک سے عدم تعاون نہ کرتے تو کشمیر کے لہلہاتے کھیت، دریائے جہلم کی ہنستی ہوئی موجیں، جن کی روانی میں خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں نے اپنا خون شامل کیا تھا اس قدر پریشان کن نہ ہوتیں۔

۹ر جون ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار کے ڈکٹیٹر مولانا معین الدین اجمیری نے کشمیر تحریک سے ہاتھ روک لیا اور ہندوستان کی دوسری سیاسی اور مذہبی ضروریات کے پیش نظر حسب ذیل بیان دیا:

''مجلس احرار اسلام ہند نے کشمیر کے مظلوم بھائیوں کی ہمدردی کے لیے جو آواز اٹھائی اور اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کو دعوت عمل دی اس آواز پر مسلمانان ہند نے جس قربانی وایثار کا مظاہرہ کیا وہ قومی بیداری کا ایک زندہ ثبوت ہے، تقریباً پینتیس ہزار فرزندان توحید نے جیلوں کی صعوبتوں کو لبیک کہا اور بائیس نوجوان نے جام شہادت نوش کیا، وہ لوگ جو اس تحریک میں کسی طرح بھی کام آئے قابل ستائش ہیں، تاریخ انہیں کبھی نظر انداز نہیں کرے گی۔ اگر کشمیر کے رہنما بھی تعصب سے جدا رہ کر احرار کی تحریک سے مخلصانہ تعاون کرتے تو کشمیر کی مظلوم رعایا کی مصیبت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا۔

تاہم مجلس احرار ایسے افراد کی شکر گذار ہے، جنہوں نے اپنے بھائیوں کی مصیبت میں کام آ کر ان کی مصیبت کم کرنے کی کوشش کی، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔

آج ہندوستان برطانوی سامراج کے پیدا کیے ہوئے مصائب میں الجھا ہوا ہے، ایسے نازک اور مصیبت کے دور میں بیٹھے رہنا کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں۔

موجودہ وقت ہر لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، ایسے وقت میں مسلمانوں کا عام سیاسی حالات سے بے خبر رہنا، اپنی تنظیم نہ کرنا اور آزادی وطن کا تحفظ اور ناموس اسلام کے لیے جدوجہد کرنا حقیقی طور پر سیاسی موت مرنے کے مترادف ہے''[1]

---

[1] کاروان احرار، ج ۱، ص: ۲۷۵

تحریک کے نتائج:

اب تک مسلمانوں کے مشہور مطالبات کے ساتھ جو تغافل کیا جارہا تھا وہ اسی خیال کی بناء پر تھا کہ مسلمان غافل ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسی قوم کے مطالبات کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب جب کہ مسلمانوں نے اپنے عدیم النظیر جذبۂ عمل اور بے مثال قربانیوں کا مظاہرہ کردیا تھا حکومت کا بھی خیال تبدیل ہوگیا، اور وزیر اعظم نے اپنے فیصلہ میں مسلمانوں کے مطالبات سے تغافل نہیں کیا۔

اس تحریک نے مسلمانوں کو ایثار پیشہ اقوام میں کھڑے ہونے کا موقع بہم پہونچا دیا اور ان کو حق حاصل ہوگیا کہ باعمل اور ایثار پیشہ اقوام کے سامنے بلند آہنگی سے کچھ کہہ سکیں، چناں چہ دوسری گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں میاں سر محمد شفیع مرحوم نے (جو مسلمانوں کے لبرل مخلص لیڈر تھے) کانگریسی نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اگر کانگریس کو اپنے تحریک ستیہ گرہ پر ناز ہے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی مجلس احرار پر فخر ہے''[1]

سر موصوف نے اس کا بھی اعتراف فرمایا تھا کہ:

''مجلس احرار کی قربانیوں کی وجہ سے مسلمانوں کو باعمل اقوام میں سر بلند کرنے کا موقع حاصل ہوگیا ہے اور جماعت احرار نے عین وقت پر قربانیاں کرکے مسلمانوں کے حقوق منوانے کا بہترین موقع بہم پہونچا دیا ہے''[2]

تحریک کشمیر کے متعلق بعض کوتاہ بین اشخاص اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے کشمیری مسلمانوں کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہونچا، لیکن انہیں اس سلسلہ میں مرزائیوں اور چند ناعاقبت اندیش مسلمان لیڈروں کی ان کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں کو نہ بھلانا چاہیے جو اپنا یہ فریضہ سمجھے ہوئے تھے کہ اس تحریک کو کامیاب نہ ہونے دیں۔

علاوہ ازیں کشمیر لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی اور پارٹی بازی وہ ناقابل فراموش دشواریاں تھیں جو

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۴۸

[2] مجلس احرار اسلام کی اہمیت وضرورت، محمود علی خان، ص: ۱۱

مجلس احرار کے راستے میں اہم رکاوٹیں ثابت ہوئیں، لیکن پھر بھی مسلمان کشمیر کو بہت کچھ حقوق مل گئے اور ان میں آثار زندگی پیدا ہو گئے جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

حکومت کشمیر کی طرف سے عوام کو جو سہولت دی گئی ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ وہ کشمیری کاشتکار جس کے پاس زمین تھی لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا (کیوں کہ ریاست کی تمام اراضی مہاراجہ کی ملکیت تھی) تحریک احرار کے بعد کسان اس کا مالک بن گیا، اور ریاست کے مالکانہ حقوق فتح ہو گئے، اب ذمہ دار صرف مالیہ ادا کرتا ہے۔

۲۔ پچاس فیصد لگان تحریک کے بعد صرف پانچ فیصد رہ گیا۔

۳۔ تقریر و تحریر اور جماعت بنانے کی اجازت مل گئی۔

۴۔ اخبار نکالنے اور آزادیٔ رائے پر کوئی پابندی نہیں رہی۔

۵۔ آزاد اسمبلی کا وجود تسلیم کر لیا گیا (مگر یہ اسمبلی برائے نام تھی)

ننانوے سال کے لیے برطانیہ اور مہاراجہ کشمیر کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے انگریز کو بطور پولیٹیکل ایجنٹ کے عارضی طور پر کشمیر میں رہنے کی اجازت دی گئی۔[۱]

تحریک کشمیر میں احرار رضا کاروں نے جو قربانیاں پیش کی ہیں ان کی تعداد بیشمار ہیں، البتہ گرفتار شدگان کی تعداد کا پتہ چلتا ہے، مگر اس میں بھی متعدد اقوال ہیں:

روزنامہ ''سٹیسمین'' کی رپورٹ کے مطابق ''احرار سول نافرمانی کرنے والوں کی تعداد پینتالیس ہزار پانچ سو چھیاسی ہے''[۲]

مذکورہ بالا رپورٹ میں سول نافرمانی کرنے والوں کی کل تعداد بتائی گئی ہے گرفتار شدگان کی نہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے ایک بیان میں گرفتار شدگان کی تعدار چالیس ہزار بتاتے ہیں، جبکہ جانباز مرزا نے جو تعداد اپنی کتاب میں نقل کی ہے وہ اس طرح ہے:

''چونتیس ہزار مسلمان قید ہوئے اور بائیس مسلمانوں کی شہادت ہوئی''[۳]

۱۔ کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۷۷

۲۔ روزنامہ اسٹیسمین، ۴؍مئی ۱۹۳۲ء، بنگال

۳۔ کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۷۶

انقلاب کشمیر کے مصنف سید غلام حسن کاظمی کی رائے اس باب کا بہترین اختتام ہے، وہ فرماتے ہیں:

''مجلس احرار اسلام نے عظیم الشان حق حریت ادا کیا اور کشمیری تحریک کو آزادی کے قریب پہونچا دیا اور اس تحریک میں جان ڈال دی، تقریباً چونتیس ہزار احرار رضا کار جیل خانے آباد کر بیٹھے، ستائیس شہید ہوئے۔

شیخ عبد اللہ نے با وجود احرار کی قربانیوں کے انہیں ٹکا سا جواب دیا کہ ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریں یعنی مطلب یہ تھا کہ قیادت ہمارے ہاتھ میں رہے، احرار مجبور تھے، چپ سا ہو کر رہ گئے۔

احرار ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرتے تھے، شیخ محمد عبد اللہ اس پر آمادہ نہ تھے، وہ اس سے کم پر رضامند نہ تھے، یہ الگ بات ہے کہ حکومت کشمیر کے ہتھکنڈوں اور اس کی مسلسل کارستانیوں اور وعدہ خلافیوں سے واقف ہو کر انہوں نے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ شروع کیا۔

اگر شیخ محمد عبد اللہ مجلس احرار سے تعلق نہ توڑتا تو کسی حد تک ذمہ دار حکومت لے ہی لیتا، یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت وہ گھبراہٹ میں تھا اور کشمیریت کا تعصب بھی کارفرما تھا''[1]

روزنامہ احرار:

۱۹۳۱ء کے آخری دنوں میں تحریک کشمیر اپنے عروج پر تھی، تاہم اس تحریک کے شروع ہوتے ہی ہندوستان کے مختلف اخباروں اور تنظیموں نے احرار کی مخالفت شروع کر دی تھی، دوسروں کے ساتھ ساتھ مسلم اخبارات نے بھی مخالفت میں برادرانِ وطن کا خوب ساتھ دیا۔

چونکہ اخبارات ورسائل کسی بھی جماعت یا تنظیم کے لیے عوام تک پہونچ کر ترجمانی کا کام کرتے ہیں۔ مجلس احرار کے پاس اب تک ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اپنی آواز عوام تک پہونچا سکیں اور مخالفوں کو ان کی مخالفت کا جواب دے سکیں۔

مذکورہ بالا حالات کے پیشِ نظر مجلس احرار نے اپنے اخبار کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور

---

[1] انقلاب کشمیر، سید غلام حسن کاظمی، ص:۱۰۶

روزنامہ احرار کا ڈیکلریشن داخل کر دیا۔ اس دوران روزنامہ زمین دار نے کاروباری نہج پر احرار سول نافرمانی کی خبریں شائع کرنا شروع کر دیں۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کا اپنا آرگن روزنامہ ''احرار'' کا پہلا پرچہ شائع ہوا، اس کے صفحہ اول پر مولانا ظفر علی خان کی یہ نظم درج تھی:

اگر اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوئے — تو وہ اس عہد میں پنجاب کے احرار ہوئے
خیل باطل سے اگر برسر پیکار ہوئے — تو وہ اسلام کے جانباز رضا کار ہوئے
پردۂ موت سے نکلے گی حیات جاوید — کہ مسلمان شہادت کے طلب گار ہوئے
جس نے ڈھایا تھا کبھی ظلم کی بنیادوں کو — پھر مسلمان اسی جذبے سے سرشار ہوئے
ہڈیاں جن کی ہے چونا تو لہو ہے گارہ — قصر آزادیٔ کشمیر کے معمار ہوئے

کیوں نہ ہوں آج اس اخبار کے گھر گھر چرچے
جس کے اوراق کی زینت میرے اشعار ہوئے[1]

صدر احرار کا مشورہ:

مجلس احرار اسلام کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو اس وقت سول نافرمانی (تحریک کشمیر) کے جرم میں جیل میں تھے، ۱۲ر دسمبر کو جب مجسٹریٹ کی عدالت میں بغرض مقدمہ تشریف لائے، تو مولانا نے روزنامہ احرار کے اجراء پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''اخبار احرار کے اجراء کا سن کر بہت خوش ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم اس کی اشاعت، توسیع اور درازیٔ عمر میں اضافہ کرے، نیز احرار اخبار کے کارکنوں سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ذاتی کاوشوں کو اخبار میں جگہ نہ دیں گے اور جہاں تک ہو سکے صلح و آشتی کو اپنا مسلک بنائیں گے''[2]

روزنامہ احرار پابندی سے شائع ہوتا رہا، تحریک کے متعلق روزانہ کی کارکردگی اور انگریزوں کے جبر و

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۳۳

[2] روزنامہ انقلاب لاہور، ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء

تشدد کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا، کشمیر میں جو حالات مسلمانوں کے ساتھ پیش آتے اس کو لکھا جاتا، اور مسلمانوں کو سول نافرمانی کے لیے جوش دلایا جاتا، رضا کاروں میں جوش وجذبہ پیدا کرنے کے لیے کشمیر کے حالات کے متعلق جذباتی عنوات دیے جاتے۔

روزنامہ احرار نے ۳۱ جنوری کو ''عید نمبر'' اخبار نکالا، جس کو حکومت پنجاب نے قابل اعتراض سمجھتے ہوئے ضبط کرلیا۔ جانباز مرزا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''۷ر فروری کو مجلس احرار کے آرگن روزنامہ ''احرار'' کا عید نمبر ضبط کرلیا گیا، مگر تحقیق کے باوجود یہ معلوم نہ ہوسکا کہ حکومت کا یہ اقدام کس بنیاد پر ہے، پولیس کافی دیر دفتر احرار کی تلاشی لیتی رہی، اور اخبار احرار کی تمام کاپیاں اپنے ساتھ لے گئی''۔[1]

روزنامہ الجمعیۃ نے بھی اس خبر کو شائع کیا، جس سے اس واقعہ پر مزید روشنی پڑتی ہے:

''لاہور ۳۱ر جنوری، آج دوپہر بعد دو سب انسپکٹروں نے پولیس کی ایک بھاری جمعیت کے ساتھ دفتر مجلس احرار اسلام پنجاب (ہند) پر چھاپہ مارا، تلاش ایک اشتہار کے متعلق تھی، جو ''مظلوم کی عید'' کے عنوان سے صدر مجلس کی طرف سے آج چھپوایا گیا تھا، اشتہار چار ہزار کی تعداد میں چھپ کر دفتر میں آچکا تھا، پولیس تمام کے تمام اشتہار اٹھا کر لے گئی۔

دوبارہ نصف گھنٹے کے بعد پھر پولیس کی جمعیت دفتر پر آ مسلط ہوئی اور تمام دفتر کے کونہ کونہ کی دیکھ بھال کرتی رہی اور دفتر کے تمام کاغذات کو نہایت باریک نظر سے دیکھا بھالا، یہاں تک کہ کیش بکس کی بھی تلاشی لی گئی اور پولیس مجالس ماتحت کی تمام فائلیں اور تمام کاغذات ورجسٹر آمد وخرچ رسیدات، تار خطوط وکتابت اپنے ہمراہ لے گئی''۔[2]

روزنامہ احرار کی ضمانت ضبطی:

غالباً حکومت کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ روزنامہ احرار عوام میں کافی مقبول ہوتا جارہا

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۶

[2] اخبار الجمعیۃ دہلی، ۵ر فروری ۱۹۳۲ء

ہے،اوراس میں شائع ہونے والی خبریں حکومت کے لیے نقصان دہ ہیں،مزید یہ کہ اگر تحریک کشمیر کے اثر کو کم کرنا ہے تو ضروری ہے کہ اس کے ترجمان کی زبان بند کردی جائے۔

چنانچہ ابھی صرف ڈھائی ماہ ہی روزنامہ احرار جاری رہ پایا تھا کہ حکومت نے اس پر الزامات لگا کر اس کی ضمانت ضبط کرلی۔جس کے متعلق اخبار الجمعیۃ نے اس طرح لکھا ہے:

''روزنامہ'' احرار'' کی ضمانت ضبط کرلی گئی۔کشمیر کے مضامین قابل اعتراض سمجھے گئے۔ حکومت پنجاب کا نوٹس ناظرین کو یاد ہوگیا کہ روزنامہ''احرار'' کے اجراء سے قبل پانچ سو روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی تھی،ملک محمد صادق مدیر روزنامہ''احرار'' نے ۹ ر دسمبر کو یہ ضمانت ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں داخل کردی،آج چیف سیکریٹری حکومت پنجاب کی طرف سے ملک صادق کو نوٹس موصول ہوا ہے کہ بعض مضامین کی اشاعت کی بناء پر گورنر پنجاب یا اجلاس کونسل نے یہ ضمانت بحق ملک معظم ضبط کرلی ہے،لیکن اس نوٹس سے یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ''احرار'' کو آئندہ کس قدر ضمانت داخل کرنا چاہیے،نہ ہی اس مقصد کے لیے کوئی میعاد معین کی گئی ہے جو نوٹس ملک صاحب کو حکومت کی طرف سے موصول ہوا ہے اس کی نقل درج کی جاتی ہے:

ضبطی ضمانت کا اعلان زیر دفعہ ۸(۱) انڈین پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ ۱۹۳۱ء

''چونکہ روزنامہ''احرار'' نے (جس کی طرف سے ۹ دسمبر ۱۹۳۱ء کو زیر دفعہ ۷(الف) انڈین پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ ۱۹۳۱ء (ملک) محمد صادق نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس مبلغ پانچ سو روپے کی ضمانت داخل کی تھی) مندرجہ ذیل مضامین شائع کئے ہیں۔جن پر چوں میں یہ مضامین شائع ہوئے ہیں ان کی تاریخ مضامین کے ناموں کے سامنے درج ہے:

راجوری.....ریاست جموں میں مسلمانوں کا قتل عام..... ۳۱ جنوری ۱۹۳۲ء

نمازیوں کے پرامن مجمع پر ڈوگرہ شاہی کی بے پناہ آتش بازی.....(//)

صوبہ جموں میں مسلمانوں کا قتل عام..... یکم فروری ۱۹۳۲ء

بارہ مولہ میں پنڈت بال کاک کے حکم سے مسلمانوں کے ہجوم پر آگ برسائی گئی..... (//)

بے شمار مجروح.....مجروحین کو پانی پلانے کی اجازت نہیں دی گئی..... ۳/فروری ۱۹۳۲ء

مفروضہ بغاوت..... (//)

مسلمانوں کو کلمہ پڑھنے سے روکا جاتا ہے..... (//)

نماز جمعہ بند کر دیا جائے..... (//)

مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنا کر نعشیں کتوں کے آگے ڈال دی گئیں..... ۴/فروری ۱۹۳۲ء

جہاد حریت کشمیر میں حصہ لینا موجب اجر عظیم ہے..... عید نمبر

مسلمانوں کی ڈاڑھی کے بال نوچے..... ..... (//)

نظم درس حیات..... (//)

کشمیر سے میاں تاج الدین لدھیانہ کا اخراج..... (//)

ہندو دوکانداروں نے پسی ہوئی اشیاء خوردنی میں زہر ملا دیا..... ۱۲/فروری ۱۹۳۲ء

اور چونکہ ان مضامین میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو کہ مقامی حکومت پنجاب کی رائے میں اس قسم کے ہیں جن کی تشریح سیکشن (۴) سب سیکشن (۱) وکلاز (اے) (ڈی) (ایف) او۔ایچ، انڈین پریس (ایمرجنسی پاورز) ایکٹ ۱۹۳۱ء (جو کہ دفعہ ۶۳ ایمرجنسی پاورز آرڈیننس) کی رو سے ترمیم کیا گیا تھا) میں کی گئی ہے۔

اس لیے متذکرہ (ملک) محمد صادق کو نوٹس دیا جاتا ہے کہ ان اختیارات کی رو سے جو دفعہ ۸ (۱) کی رو سے حاصل ہیں، گورنر پنجاب باجلاس کونسل اعلان کرتے ہیں کہ پانچ سو روپے کی ضمانت جو متذکرہ اخبار کی طرف سے داخل کی گئی تھی، بحق ملک معظم ضبط کی جاتی ہے"۔[1]

بعلم گورنر پنجاب باجلاس کونسل

(دستخط) سی۔سی۔گارہٹ۔چیف سیکریٹری پنجاب لاہور

مذکورہ بالا نوٹس میں چودہ عنوانات دیے گئے ہیں جس کی بنا پر روزنامہ احرار کی ضبطی کا نوٹس جاری

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ، ۲۲ فروری، ۱۹۳۲ء

کیا گیا، اس نوٹس سے یہ تو ظاہر نہیں ہے کہ آئندہ مذکورہ اخبار کو جاری رکھنے کے لیے کس قدر ضمانت داخل کرنا ہوگا۔ ہاں البتہ ''کاروان احرار'' میں روزنامہ احرار کی ضمانت کا تذکرہ ملتا ہے جس میں آئندہ اخبار کو جاری رکھنے کے لیے پانچ ہزار کی مزید ضمانت کا مطالبہ مذکور ہے کاروان احرار میں تحریر ہے:

''۲۴ر فروری ۱۹۳۲ء کو مجلس احرار کے روزنامہ ''احرار'' کی سابقہ ضمانت ضبط کر کے آئندہ پانچ ہزار کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔

۳۱ر جنوری، یکم، تین اور چار فروری، عید نمبر اور ۱۲ر فروری کے مضامین قابل جرم قرار دیے گئے''[1]

تحریک قادیانیت اور احرار کی خدمات:

۱۹ ویں صدی مذہبی، تہذیبی اور تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسلامی ممالک میں دماغی بے چینی اور اندرونی کشمکش اپنے عروج و شباب کو پہونچ گئی تھی۔ ہندوستان اس بے چینی و کشمکش کا خاص میدان تھا۔ یہاں بیک وقت مغربی و مشرقی تہذیبوں، جدید و قدیم نظام تعلیم اور اسلام و مسیحیت میں معرکہ کارزار گرم تھا اور دونوں طاقتیں زندگی کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں۔

۱۸۵۷ء کی آزادی کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں، ہندوستانی مسلمانوں کے دل شکست کے صدمہ سے زخمی اور ان کا دماغ ناکامی کو چوٹ سے مفلوج اور غلامی کی ذلت سے بھی دوچار تھے۔ انگریزوں نے اپنے سلطنت کے آغاز ہی سے نئی تہذیب و ثقافت کی توسیع و اشاعت نیز ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے عیسائی پادری مسیحیت کی دعوت و تبلیغ میں سرگرمی دکھلا رہے تھے، جس سے لوگوں کو عقائد اور شریعت اسلامی کے ماخذ اور سرچشموں کے بارے میں متشکک اور بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ چوں کہ مسلمانوں کی نئی نسل جس پر اسلامی تعلیمات نے پورے طور پر اثر نہیں کیا تھا، اس دعوت و تلقین سے زیادہ متاثر ہوئے اور لوگوں کے قبول مسیحیت کے واقعات رونما ہونے لگے، جس کی وجہ سے عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں کے درمیان جابجا مناظرے و مباحثے بھی ہوئے۔

مسلمان عام طور پر یاس و ناامیدی اور حالات و ماحول سے شکست خوردگی اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہد

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۱، ص: ۲۶۲

کے انجام اور مختلف دینی وعسکری تحریکوں کی ناکامی کو دیکھ کر کسی غیب کے ظہور اور مویّد من اللہ کی آمد کی منتظر تھی، کہیں کہیں یہ بھی خیال ظاہر کیا جارہا تھا کہ ۱۹ویں صدی کے اختتام پر مسیح موعود ومہدی موعود کا ظہور ہوگا۔ اسی درمیان مرزا غلام احمد اپنی نئی دعوت وتحریک لے کر عوام کے سامنے آئے۔ ان کو اپنی دعوت اور اپنے حوصلوں کی تکمیل کے لیے مناسب جگہ اور ہر چیز ان کے لیے معاون وسازگار ثابت ہوئی۔ حکومت انگریز جو مجاہدین کی تحریک جہاد اور جوش مذہبی سے ہراساں و پریشان رہتی تھی، اس تحریک کا خیر مقدم کیا جس نے حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کو اپنے بنیادی عقائد ومقاصد میں شامل کرلیا تھا۔ ان تمام عناصر و اسباب نے مل کر چند ہم خیال لوگوں کی ایک مستقل فرقہ کی بنیاد ڈالی جو قادیانی یا احمدی فرقہ کے نام سے مشہور ہوا، جس کا بانی مرزا غلام احمد تھا۔

مرزا غلام احمد:

مرزا غلام احمد کی پیدائش ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء سکھ حکومت کے آخری عہد میں ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی فضل الٰہی وفضل احمد وغیرہ سے نحو اور منطق وحکمت اور طب کی کتابیں اپنے والد سے پڑھی۔ مرزا غلام احمد کو طالب علمی کے زمانہ میں کتابوں کے مطالعہ میں بڑا انہماک تھا۔ وہ لکھتا ہے ''ان دنوں مجھے کتابوں کے دیکھنے کی طرف اس قدر توجہ تھی کہ گویا میں دنیا میں نہ تھا''۔[1]

مرزا کے اخلاق واوصاف:

مرزا بچپن میں بہتر سادہ لوح انسان تھا۔ دنیا کی چیز سے ناواقف اور استغراقی کیفیت شروع ہی سے اس میں نمایاں تھی۔

صحت اور شکایتیں:

مرزا کو جوانی میں ہسٹریا کی شکایت تھی اور کبھی کبھی اس کو ایسا دورہ ہوتا کہ بے ہوش ہوکر گر جاتا، اس

---

[1] قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، محمد الیاس برنی، ص:۸۵

کے علاوہ ذیابطیس، کثرت بول، دوران سر اور شنج قلب کے دق کی بیماری بھی لاحق تھی۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''میں ایک دائم المرض آدمی ہوں'' اور کثرت بول کی متعلق لکھتا ہے کہ ''کثرت پیشاب سے جس قدر عوارض ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وہ سب میرے شامل حال رہتے ہیں''۔[1]

نکاح اور اولادیں:

مرزا نے پہلا نکاح اپنے خاندان میں کیا۔ ان سے دو صاحبزادے ہوئے۔ بعد میں اس بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری شادی دہلی کی ایک نواب ناصر کی صاحبزادی سے ہوئی۔ مرزا کی بقیہ اولادیں سب انہیں کے بطن سے ہے (مرزا بشیر الدین محمود- مرزا بشیر احمد مصنف سیرۃ المہدی- مرزا شریف احمد)

وفات:

مرزا غلام احمد نے ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا، پھر ۱۹۰۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا تو علماء اسلام نے ان کی تردید ومخالفت شروع کردی۔ تردید کرنے والوں میں مشہور عالم دین مولانا ثناء اللہ امرتسری پیش پیش اور نمایاں تھے۔ مرزا نے ۵/اپریل ۱۹۰۷ء میں ایک اشتہار جاری کیا جس میں مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

> ''اگر میں ایسا ہی کذاب ومفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے ہر ایک پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی ہی میں ہلاک ہوجاؤں گا، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی بہت عمر نہیں ہوتی اور آخر وہ ذلت وحسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی میں ہی ناکام ہلاک ہوجاتا ہے اور اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہے تاکہ خدا کے بندوں کو تباہ نہ کرے۔ اور اگر میں کذاب ومفتری نہیں ہوں اور خدا کے مکالمہ ومخاطبہ سے مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کے سنت اللہ کے موافق ایک مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔ پس اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ خدا کے ہاتھوں سے ہے

---

[1] قادیانیت، محمد منظور نعمانی، ص:۳۶

یعنی طاعون، ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ ہوئیں تو میں خدا کی طرف سے نہیں''۔[1]

اس اشتہار کے ایک سال بعد ۲۵رمئی ۱۹۰۸ء کو مرزا بمقام لاہور بعد عشاء اسہال میں مبتلا ہوا، علاج ومعالجہ کی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ضعف بڑھتا گیا اور طاقت دگرگوں ہوتی گئی۔ بالآخر ۲۶رمئی ۱۹۰۸ء کو انتقال کیا۔نعش قادیان لائی گئی، ۲۷رمئی کو تدفین عمل میں آئی۔اس کے بعد حکیم نورالدین بھیروی خلیفہ اور جانشین مقرر ہوا۔

مرزا غلام احمد نئی دعوت وعزیمت کے ساتھ:

مرزا غلام احمد نے اپنی ابتدائی زندگی عسرت وتنگی کے ساتھ گذاری، بعد میں وہ ایک مصنف اور اسلام کے مناظر کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ پھر انہوں نے ایک مدت تک مبلغ اور روحانی پیشوا کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، بعد ازاں مسیح موعود، مہدی موعود اور آخر میں مستقل پیغمبر کی حیثیت اختیار کرلی، اس وقت حالات میں بڑا انقلاب ہوا، جس کی وجہ سے ہر طرف سے تحائف اور نذرانے آنے شروع ہوگئے، دیکھتے ہی دیکھتے امیر اور مال دار طبقوں میں شمار ہونے لگا۔اس انقلاب ہی نے مرزا کی زندگی اور اس کے رویّہ میں تبدیلی پیدا کردی۔حکومت انگریز نے مرزا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر اس سے وہ کام لیا جو بعد کے لوگ انجام نہیں دے سکے۔ اس شخص نے تمام علماء اسلام سے ہٹ کر انگریزوں سے ہاتھ ملایا اور اس حکومت کی تائید وحمایت میں سرگرمی دکھائی۔ وہ ایسے کھلے لفظوں میں اس حکومت کی مدح وثنا کرتا ہے جس کے لیے ایک صاحب ضمیر انسان تیار نہیں ہوسکتا۔اپنی سب سے پہلی تصنیف براہین احمدیہ کے حصہ اول میں حکومت انگریز کی تعریف کی، اس کے احسانات وخدمات گنائے اور جہاد کو منسوخ وممنوع قرار دیا۔

ایک جگہ لکھتا ہے:

''میری عمر کا اکثر حصہ اسی سلطنت انگریزی کی تائید وحمایت میں گذرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو

---

[1] تبلیغ رسالت، مطبع فارق پریس قادیان، ۱۹۲۷ء، ج ۱۰، ص:۱۳۲۔

پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں انکے دلوں سے معدوم ہو جائیں''۔[1]

مرزا غلام احمد کی خصوصی توجہ مسئلہ جہاد پر مرکوز تھی جس کے بارے میں لکھتا ہے:

''جب مسیح آئے گا تو دین کے لیے لڑنا حرام کہا جائے گا سو آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا، اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے، صحیح بخاری کو کھولو اور اس حدیث کو پڑھو جو مسیح موعود کے حق میں ہے یعنی ''یضع الحرب'' جس کے یہ معنی ہیں کہ جب مسیح آئے گا تو جہادی لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا، سو مسیح آ چکا اور یہی ہے جو تم سے بول رہا ہے''۔[2]

مرزا اپنے تحریر کے آئینے میں:

یہ دو مذہبی مناظروں کا دور تھا اور اہل علم طبقہ میں سب سے بڑا ذوق مقابلہ مذاہب اور مناظرۃ فرق کا پایا جاتا تھا۔ عیسائی پادری مذہب مسیحیت کی تبلیغ اور دین اسلام کی تردید میں سرگرم تھے۔ حکومت وقت جس کا سرکاری مذہب مسیحیت تھا، ان کی پشت پناہ اور سرپرست تھی، وہ ہندوستان کو یسوع مسیح کا عطیہ اور انعام سمجھتی تھی۔ دوسری طرف آریہ سماجی مبلغ جوش وخروش سے اسلام کی تردید کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں جو شخص اسلام کی مدافعت اور مذاہب غیر کی تردید کا علم بلند کرتا وہ مسلمانوں کا مرکز توجہ وعقیدت بن جاتا۔

مرزا کی حوصلہ مند طبیعت اور دور بین نگاہ نے اس میدان کو اپنی سرگرمی کے لیے انتخاب کیا اور اس نے اسلام کی صداقت، قرآن کے اعجاز اور رسول اللہ کی نبوت کو دلائل عقلی ونقلی ثابت کرنے کے ساتھ بیک وقت مسیحیت، سناتن دھرم، آریہ سماج اور برہموسماج کی تردید کرنے کی نیت سے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام ''براہین احمدیہ'' تجویز کیا، جس میں دلائل وغیرہ کے بجائے کثرت سے اپنے الہامات اور

---

[1] تریاق القلوب، مرزا غلام احمد، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، ۱۹۳۸ء، ص:۲۵،

[2] قادیانیت مطالعہ وجائزہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص:۱۳۴

خوارق، کشف، مکالمات خداوندی، پیشین گوئیاں اور طویل وعریض دعوے کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ بار بار اظہار کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی اصلاح اور اسلام کی دعوت کے لیے خدا کی طرف سے مامور اور عصر حاضر کے مجدد ہیں۔ اور ان کو حضرت مسیح سے مماثلت حاصل ہے، بعد میں اس شخص نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا اور خود کو ظل نبی یا بروزی نبی مشہور کروایا کہ نبی کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔

یہاں مختصراً مرزا کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) آیت۔ **مبشرا برسول یاتی من بعد ی اسمه احمد** ۔کہ اس آیت کا مصداق میں ہی ہوں۔[۱]

(۲) مہدی موعود اور بعض نبیوں سے افضل ہوں۔[۲]

(۳) میں مسلمانوں کے لیے مسیح، مہدی اور ہندوؤں کے لیے کرشن ہوں۔[۳]

(۴) میں نبی ہوں۔ اس امت میں نبی کا نام میرے ہی لیے مخصوص ہے۔[۴]

(۵) میرا الہام۔ **وما ینطق عن الھویٰ** ۔یعنی میں بلا وحی نہیں بولتا۔[۵]

(۶) اپنے آپ کو بعینہ خدا دیکھا۔ میں یقیناً کہتا ہوں کہ میں وہی ہوں اور میں نے زمین وآسمان بنائے۔[۶]

(۷) مسیح موعود (جن کے آنے کی خبر احادیث میں آئی ہے) میں ہی ہوں۔[۷]

(۸) مجھ کو الہام ہوا ہے۔ **یا ایھا الناس انی رسول الله الیکم جمیعا** ۔اے لوگوں میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔[۸]

(۹) **لولاک لما خلقت الافلاک** ۔اگر تو نہ ہوتا تو میں آسمان پیدا نہ کرتا[۹]

(۱۰) مجھے خدا نے کہا۔ **وما ارسلنک الا رحمة للعالمین** ۔خدا نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا۔[۱۰]

---

[۱] ازالۂ اوہام، مرزا غلام احمد، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، ۱۹۰۰ء، ج۲، ص: ۲۷۵

[۲] معیار المذاہب، مرزا غلام احمد، بحوالہ: حقیقۃ الوحی، مطبع میگزین قادیان، ۱۹۰۷ء، ص: ۸۵

[۳] لیکچر سیالکوٹ، مرزا غلام احمد، مطبع مفید عام پریس سیالکوٹ، ص: ۲۵

[۴] حقیقۃ الوحی، مرزا غلام احمد، ص: ۳۹۰-۳۹۱

[۵] ازالۂ اوہام، مرزا غلام احمد، ص: ۹

[۶] آئینہ کمالات اسلام، مرزا غلام احمد، مطبع ریاض ہند قادیان، ص: ۶۶

[۷] ازالۃ الاوہام، ص: ۶۶۵، بحوالہ: سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص: ۱۹۱

[۸] حقیقۃ الوحی، ص: ۳۹۱، بحوالہ: سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص: ۱۹۱

[۹] ایضاً، ص: ۹۹، بحوالہ: سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص: ۱۹۱

[۱۰] ایضاً، ص: ۸۵، بحوالہ: سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص: ۱۹۱

اس کے علاوہ بھی بہت سارے اقوال ہیں جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ایک جگہ اپنے ایک رسالہ میں رقمطراز ہے۔

''میں صرف یہ نہیں کہتا کہ میں اگر جھوٹا ہوتا تو ہلاک کیا جاتا بلکہ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ موسیٰ اور عیسیٰ اور داؤد اور آنحضرتؐ کی طرح میں سچا ہوں اور میری تصدیق کے لیے خدا نے دس ہزار سے بھی زیادہ نشان دکھلائے ہیں۔قرآن نے میری گواہی دی ہے۔رسول اللہؐ نے میری گواہی دی ہے کہ جو یہی زمانہ ہے۔پہلے نبیوں نے میرے آنے کا زمانہ متعین کر دیا ہے اور قرآن بھی میرے آنے کا زمانہ متعین کرتا ہے کہ جو یہی زمانہ ہے اور میرے لیے آسمان نے بھی گواہی دی ہے زمین نے بھی اور کوئی نبی نہیں جو میرے لیے گواہی نہیں دی''[1]

ختم نبوت اور علماء اسلام:

ختم نبوت کا عقیدہ کسی کا نجی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ تمام عالم اسلام کا بنیادی اور مشترک مسئلہ ہے جو اسلام کے چار بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) اللہ کے سوا کسی کی بندگی واطاعت نہ کی جائے۔

(۲) مرنے کے بعد آخرت کا یقین رکھتا ہو۔

(۳) تمام پیغمبروں پہ ایمان لانا۔خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں تشریف لائے ہوں۔

(۴) حضرت محمدؐ کو خدا کا آخری پیغمبر ماننا کہ ان کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

جو شخص ان عقیدوں میں سے کسی ایک کا منکر ہوگا وہ اسلام سے قطعی طور پر کافر و مرتد سمجھا جائے گا اور نہ وہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں مسلمان کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

مرزا غلام احمد نے ۱۳۰۱ھ میں مجدد ہونے کا دعوی کیا۔رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے دادا مولانا محمد اور ان کے دو بھائیوں نے مرزا غلام احمد سے ملاقات اور گفتگو کے بعد اس کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا اور بعد میں اس کی کتاب ''براہین احمدیہ'' دیکھنے کے بعد اس کفر کی تصدیق ہوگئی۔فوراً بعد

---

[1] قادیانیت مطالعہ وجائزہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص:۹۳

۱۳۰۱ھ میں علماء دیوبند کی ایک مجلس ہوئی جس میں مولانا محمد لدھیانوی اوران کے دو برادران محمد عبداللہ وعبد العزیز صاحبان کی تحقیقات پر علماء دیوبند نے رضامندی کے دستخط ثبت کیے۔ اور مرزا کے کافر ومرتد ہونے کی تصدیق کردی۔ بعد میں رفتہ رفتہ کل اہل علم نے قادیانی کے ضال ومضل ہونے پر اتفاق کیا، حتیٰ کہ علماء حرمین نے بھی مرزا کے دائرۃ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ تحریر کیا۔

مرزا کے عقیدے پر سب سے پہلے عالم اسلام کی توجہ منعطف کرانے کا سہرا مولانا محمد لدھیانوی اوران کے برادران کی طرف جاتا ہے، جنہوں نے سب سے پہلے مرزا پر کفر کا فتویٰ لکھا، جس پر ابتدا میں مخالفتیں بھی ہوئیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو جب اس فتوے کا علم ہوا تو انہوں نے مرزا کے قول وفعل کی تاویل کی اور فرمایا تھا کہ کسی آدمی پر جلد فتوی نہ لگایا جائے بلکہ اس کے قول کو تاویل کر کے اچھی باتوں پر محمول کردینا چاہئے۔ بعد میں مولانا محمد لدھیانوی سے مفصل گفتگو کے بعد مولانا گنگوہیؒ نے بھی مولانا لدھیانوی کے فتوی کی تصدیق کردی، اس کے بعد کئی فتاوے صادر کیے، اس طرح مولانا محمد لدھیانوی کی کوششوں سے علماء مرزا کے عقیدے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے خلاف میدان میں آئے۔ پورے ملک میں وقتاً فوقتاً فتاوے صادر ہوئے، جن سے لوگ مرزا کے عقیدہ اور اصلیت سے واقف ہوئے۔ ورنہ کتنے لوگ اس بدعقیدگی میں ڈوب گئے ہوتے۔ مرزا کے متعلق مکہ مکرمہ (زادہا اللہ شرفاً وعظمۃً) کے مفتی نے فتوی دیا وہ اس طرح ہے:

"بعد حمد الله نقول ! لا شک فی کفر مدعی النبوّة لانه لانبی بعد محمدٍ بقوله تعالی ماکان ابا احد من رجالکم..... وکل من صدقه واتبعه علی دعواه فهو کافر مثله ولایصح مناکحته لاهل الاسلام والحالة هذه والله اعلم" .

(رئیس القضاة الشیخ عبد الله بن حسن)[1]

مجلس احرار کی خدمات:

ناموس رسالت پر مرمٹنے والوں کا یہ ایک ایسا گروہ تھا جس کے رہنماؤں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف

---

[1] سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمٰن، ص:۳۰۱

مقامات سے پھولوں کی طرح چن چن کر ایک حسین گلدستہ میں پیوست کر دیے تھے۔ اس میں مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے رہنما شامل تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس کے روح رواں تھے اور امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے دست و بازو اور چودھری افضل حق اس کا دماغ۔ بقیہ اس کے ممبران میں بڑے ذی استعداد علماء، وکلاء، شعراء، ادیب، خطیب ہر طرح کے افراد موجود تھے۔ جب بھی مسلمان قوم پر یا دین اسلام پر کسی قسم کی آنچ آئی یا لوگ گمراہ قائدین کے دھوکے میں آنے لگے تو ان حضرات نے مل بیٹھ کر سب کے سامنے آواز بلند کیا اور دین اسلام کی حقانیت کے لیے اخیر وقت تک کوششیں کی۔ عقلی اور علمی دلائل سے ان پر گرفت بنائی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سب حضرات عقلی اور علمی دلائل کے گویا چلتے پھرتے مجسمے تھے۔ کبھی کسی چیز نے ان کے قدم کو نہیں ڈگمگایا اور نہ کبھی کسی درباروں میں سر جھکایا نہ کسی سے مرعوب ہوئے۔ ماریں کھائیں، گالیاں سنیں، جیلوں میں اپنے حیات عزیز گذار دی۔ جوانی کا پُر بہار اور مسرت سے بھری زندگی آزادی کی نظر کر دیا، عسرت و تنگدستی میں زندگی کاٹ دی، مگر جھکے تو صرف ایک خدا کے سامنے اور محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے سامنے گردن خم کر دی۔

برصغیر میں چند جماعتیں ایسی قائم ہوئیں جنہوں نے باقاعدہ اپنے رضا کاروں میں ایسا ولولہ اور جوش بھر دیا تھا کہ انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل اور اپنے امیر کی اطاعت کے لیے جان و مال اور اہل و عیال تک کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم مجلس احرار کی جماعت تھی جن کے رہنماؤں میں تقویٰ، پرہیزگاری، علم و عمل اور تدین و تدبر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجلس احرار نے جماعتی حیثیت سے جن تحریکوں کو پروان چڑھایا ان میں قادیانی تحریک بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ نیز قید و بند کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے جس قدر لاتعداد رضا کار بھرتی کیے ہندوستان کی تمام جماعتوں نے کسی مشترکہ کاز کے لیے متحد ہو کر بھی اتنے رضا کار فراہم نہیں کیے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ احراری رہنما نے سیاسیات میں سب سے پہلے مذہبی رنگ پیدا کیا۔ گویا مذہبی سیاست کو سب سے پہلے احرار نے ہندوستان میں متعارف کرایا۔ اس لحاظ سے احرار نے بعض جگہوں پر حیرت انگریز کامیابیاں حاصل کیں جسے کوئی بھی صاف گو مؤرخ بھلا نہیں سکتا۔ برصغیر میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم قادیانی مذہب کی

خامیوں اور اس کے خدوخال کو علماء کے سامنے پیش کیا جسے مستقبل کا اسلامی مورخ سنہرے حروف سے لکھ کر یقیناً خراج تحسین پیش کرے گا۔

مجلس احرار نے فرقہ قادیانیت کے متعلق وہ واضح اور دوٹوک پالیسی اختیار کی جو آج تک کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت اختیار نہیں کر پائی۔ قادیانیوں کا پنجاب، بلوچستان اور بتدریج پاکستان میں قادیانی اسٹیٹ قائم کرنے کا منصوبہ جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا گیا، قادیانیوں کے عزائم مشؤمہ سے امت مسلمہ کو باخبر رکھا۔ حکومت اور اعیان حکومت کو ان کی سرگرمیوں سے مطلع کیا اور مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کروایا، جس کے تحت اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں وافر مقدار میں رسالہ و پوسٹر شایع کروایا۔ ختم نبوت کے متعلق جو خدمات احرار نے انجام دی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کا پردہ چاک کر کے اور ایک زبردست تحریک شروع کر کے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ احرار ہی کا حصہ ہے۔

احرار کانفرنس:

قادیان میں مرزائیوں نے اپنی اکثریت کے زعم میں انسانیت پر جو ظلم وقہر روا رکھا اور اس قصبہ کی غیر وزرائی آبادی کو جس طرح پریشان وحراساں کیا تاریخ اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ انگریز حکومت کی موجودگی میں خلیفہ قادیان کے گھریلو آئین، دن کی روشنی میں مخالفوں کا قتل عام، مسلمان اور غیر مسلموں سے اقتصادی مقاطعہ، معصوم عصمتوں کی ہلاکت، قصر خلافت میں اخلاق سوز حرکات وسکنات وغیرہ۔

ان تمام جرائم سے حکومت بھی پریشان تھی لیکن اس کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتی تھی، چوں کہ یہ انہی کا لگایا ہوا خود ساختہ پودا تھا۔ مجلس احرار نے ان حالات کے پیش نظر عملی اقدام کرتے ہوئے قادیان میں اپنا ایک دفتر کھولا اور اس کے بعد قادیانیت کے خلاف اسی کے گھر سے آواز بلند کی۔ کچھ ہی دنوں بعد مجلس احرار نے دوسرا عملی قدم اٹھایا اور خاص قادیان میں کانفرنس کرنے کا پروگرام بنایا۔ جس پر قادیانیوں نے حکومت انگریز کے سامنے بہت ہنگامہ آرائی کی کہ احراری ہم پر حملہ کرنے آرہے ہیں انہیں روکا جائے۔

حکومت نے فوراً دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی اور کچھ احکامات جاری کیے جو اس طرح ہیں کانفرنس میں شامل ہونے والے حضرات لاٹھیاں یا تیز دھار کی کوئی ایسی چیز لے کر شہر میں نہ پھریں۔ کانفرنس کے دوران قادیانی اپنا کوئی اجتماع منعقد نہ کریں جس سے فساد کا خطرہ ہو وغیرہ۔

بہر حال احرار اسپیشل ٹرین جو چالیس ڈبوں پر مشتمل تھی امرتسر سے قادیان کی طرف روانہ ہوئی جس کے دونوں طرف احرار کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کانفرنس میں احراری رہنماؤں کے علاوہ قدآور شخصیات میں مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مفتی ابوالوفا شاہ جہاں پوری، مولانا احمد علی لاہوری وغیرہ تھے۔ کانفرنس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ جس میں مولانا کے علاوہ بھی مختلف علماء کرام کی تقریریں ہوئیں۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور ہوئیں جنہیں اختصار کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

(۱) تمام دنیائے اسلام کے علماء مرزا کو اس کے دعوائے نبوت اور دیگر دعاوی عقائد کفریہ کی بنا پر اسلام سے خارج اور مرتد سمجھتے ہیں۔ اس لیے کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ تمام مرزائیوں کو مردم شماری میں مسلمانوں سے الگ کردیا جائے۔

(۲) مسلمانان ہند کا یہ اجتماع اپنے عزم بالجزم کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک حکومت چودھری ظفر اللہ خاں کے تقرری کو منسوخ کر کے اپنی قادیانیت نواز پالیسی میں تبدیلی نہیں کرتی مسلمانان ہند اپنے احتجاج کے سلسلہ کو دوبارہ جاری رکھیں گے''۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان لکھتا ہے:

''سوائے اس صورت کے کہ حکومت کی طرف سے ہم پر جو ظلم ہوا ہے اسے دور کرے تب ہمارے تعلقات پہلے کی طرح ہوں گے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو ہماری مدد سودا کرنے کے بعد ہوگی اور ہم اپنی خدمات کا معاوضہ طلب کریں گے اور اس جھگڑے کے خاتمے پر پھر اپنی ہتک کا سوال گورنمنٹ کے سامنے رکھیں گے اور اس سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ہمارے ہتک کا ازالہ

کرے۔ ورنہ یہ جھگڑا اس وقت تک جاری رہے گا جب تک گورنمنٹ سے اپنا حق نہ لے لیں"[1]

بہر حال عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت میں قادیانی حصار کو توڑنا اسلام کا بنیادی حصہ تھا۔ کفر کا یہ قلعہ برطانوی پناہ میں ہونے کے ساتھ اس میں دراڑ ڈالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، احرار نے ہر رخ سے اس پر یلغار اور حملہ کیا تا کہ یہ بت ٹوٹ جائے اور اس کی پرستش سے لوگوں کے ایمان وعقائد کی حفاظت ہو سکے۔

احرار کو دعوت مباہلہ:

مرزا بشیر الدین محمود نے مجلس احرار کو دعوت دی کہ آؤ قادیان اور مباہلہ کیا جائے۔ مجلس احرار نے اس دعوت کو فوراً قبول کیا اور ۱۳ر ستمبر کو قادیان پہنچنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کا شایع ہونا تھا کہ قادیانیوں کے اوسان خطا ہو گئے اور کہنے لگے کہ احرار والے قادیان میں پھر فساد کرنے آ رہے ہیں۔ دراصل انہیں یقین تھا کہ احراری تحریک شہید گنج میں الجھے ہوئے ہیں وہ ہمارے چیلنج کو قبول نہیں کریں گے۔ باوجود اس کے احرار کی اس جرأت پر مرزائی پریشان ہوئے۔ مجلس احرار نے مولانا مظہر علی اظہر کو مباہلہ کے لیے نامزد کیا۔ تاریخ مقررہ پر احراری رفقاء قادیان پہونچے اور تقریریں ہوئیں۔ مولانا مظہر علی اظہر اپنی تقریر میں مرزائیوں کو دعوت مباہلہ دیتے ہوئے فرمایا:

"یہ بات احرار کے حصے میں آئی ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ نے پرانے عیسائیوں کو آیت مباہلہ کے ذریعہ مباہلہ کا چیلنج دیا تھا اسی طرح ہم بھی آج ان نئے مسیحوں یعنی قادیانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ مباہلہ کے بارے میں حکم قرآنی یہ ہے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہم میں سے جس کو زیادہ سے زیادہ بدعقیدہ یا بدعمل خائن یا غدار سمجھے اس کو مباہلہ کے لیے بلالے، وہ شیعہ ہو یا سنّی، بریلوی ہو یا دیوبندی، حنفی ہو یا اہل حدیث وہ اسی طرح اپنے خاندان کو میدان مباہلہ میں لے کر نکلے گا جس طرح حضرت نبی کریم ﷺ حضرت امام حسین کو گود میں

---

[1] کاروان احرار، جانباز مرزا، ج ۲، ص: ۹۰

لیے ہوئے اور حضرت حسن کو انگلی سے لگائے ہوئے اور جناب فاطمہ الزہرہؓ اور حضرت علیؓ شیر خدا کو پیچھے پیچھے ہمراہ لیے ہوئے وفد بنونجار کے مقابلہ میں مباہلہ کے لیے نکلے"[1]

مجلس احرار کا مطالبہ:

۳۱ رجنوری ۱۹۳۵ء کو مجلس احرار کی طرف سے ہندوستان بھر کی مسلم انجمنوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے اداروں سے مرزائیوں کو خارج کردیں۔ اس کی سب سے بڑی زد میں آنے والی لاہور کی انجمن حمایت اسلام تھی۔ علامہ اقبال کے مستعفی ہونے کے باوجود مرزائی اس کے ممبر بنے رہے۔ یہ انجمن قادیانیوں کو اپنے سے علیحدہ نہ کرسکی۔ انجمن کی اس حرکت سے تنگ آ کر مجلس احرار نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر عوام کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی کہ مرزائیوں کو اب تک انجمن سے خارج نہیں کیا گیا ہے۔ چوں کہ تمام علماء اسلام کے نزدیک یہ غیر مسلم ہیں اور غیر مسلم انجمن حمایت اسلام کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ اس قرارداد پر بہت ہنگامہ ہوا پھر بھی اتفاق رائے سے یہ قرارداد منظور کرلی گئی۔[2]

شعبہ تبلیغ کا قیام:

ہندوستانی عوام خاص طور پر قادیان میں رہنے والے مسلمانوں کے حالات اور ان کے لیے تبلیغ اسلام کی ضرورت واہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجلس احرار نے شعبہ تبلیغ کا قیام عمل میں لایا اور اس کے ضمن میں تین شعبے قائم کیے۔

(۱) شعبہ تبلیغ (۲) شعبۂ اصلاح تنظیم (۳) شعبہ خدام خلق

یہ شعبہ جات ملازم پیشہ مسلمانوں کی اس بنیادی کمزوری کو بھانپتے ہوئے عمل میں لایا گیا کہ غیر سیاسی لوگ مجلس احرار کے اس شعبہ میں کام کریں، جس سے ان کی سرکاری ذمہ داریاں بھی زخمی نہ ہوں اور دین کا کام بھی ہوتا رہے۔

---

[1] کاروان احرار ج ۲۔ ص: ۲۶۹

[2] کاروان احرار۔ ج ۲۔ ص: ۳۲۹

اس شعبہ کے اغراض ومقاصد یہ طے پائے:

(۱) ہندوستان میں اور بیرون ہند میں اسلام کے مقدس اصولوں کی اشاعت کرنا

(۲) مسلمانوں میں تبلیغ اسلام کا جذبہ صادق پیدا کرنا اور مبلغین اسلام کی ایک سرگرم کارکن تیار کرنا

(۳) فتنہ قادیان کے تباہ کن اثرات سے تعلیم اسلامی کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں کو ان کے دجل سے بچانا

(۴) خدمت خلق اور اسلامی اخلاق کی عملی کیفیت پیدا کرنا

(۵) یہ شعبہ خالص دینی اور مذہبی ہوگا۔ سیاسیات ملکی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔[۱]

گویا قادیان میں احرار کا دفتر قائم ہو چکا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد اس جگہ مدرسہ جامعہ محمدیہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ شعبہ تبلیغ کے قیام نے مرزائیوں میں ہیجان اور مسلمانوں میں تبلیغ دین کی ایک نئی روح پھونک دی۔ اس شعبہ نے سب سے پہلے مبلغین اسلام کی ایک سرگرم جماعت تیار کی، جنہوں نے اپنے فرائض مکمل طور پر ادا کیے۔ مولانا لال حسین اختر صاحب کو اس شعبہ کا پہلا نگراں مقرر کیا گیا جنہوں نے ہندو بیرون ہند جا کر شعبہ کے مقاصد پورے کیے۔

گو شعبہ تبلیغ کے مقاصد میں ملکی سیاست کو دخل نہیں تھا تاہم اس تنظیم پر احرار کی پوری گرفت تھی۔ اس شعبے کا ہر فیصلہ احرار زعماء کے مشورے سے طے پاتا۔ شعبہ کے اکثر کارکن تنخواہ دار تھے اور ایسے کارکن کو اس تنظیم میں داخلے کی اجازت تھی، جسے اسلام سے پوری واقفیت ہو نیز وہ مرزائی اور عیسائیوں سے گفتگو کرنے پر قادر ہو۔

مسلمانوں کا قبرستان:

مجلس احرار کے نزدیک چوں کہ مرزائی غیر مسلم تھے، اس اعتبار سے ان کا ہر قسم کا مقاطعہ اہم اور ضروری تھا۔ قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ موت وحیات کے سلسلے میں بھی احرار کا موقف تھا کہ مرزائی کی لاش مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونی چاہیے۔ آخر ۱۹/ جولائی کو امرتسر میں ایک قبرستان میں ایک مرزائی کو دفن کرنے پر ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے اس موقع پر مداخلت کی۔ احرار رضا کاروں پر لاٹھیاں چارج

---

[۱] مجلس احرار اسلام کی اہمیت وضرورت، محمود علی خاں، ص:۱۶

ہوئیں اور گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ بالآخر مرزائی کی لاش ایک دوسرے قبرستان میں دفن کی گئی۔ جس میں امتیاز مذہب کے بغیر بچوں کو دفن کیا جاتا تھا۔ اسلام کا یہ امتیاز احرار رہنماؤں نے مسلمانوں کو سکھایا اور سمجھایا۔ اس طرح قوت اور انصاف ہمیشہ متصادم رہے ہیں۔ ان کے مابین ٹکراؤ تاریخ کا ایک اہم باب رہا ہے۔ جس کے صفحات مظلوموں کے خون سے رنگین ہے۔ وقت نے قوت کا ساتھ دینے اور انصاف کی راہوں کو پامال کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ لیکن انصاف کا ہاتھ جب اپنے حقوق کے لیے قوت سے برسرِ پیکار ہو جائے تو وقت بھی اپنے آپ راستہ چھوڑتا چلا جاتا ہے۔

اچھوت تبلیغ کانفرنس:

آل انڈیا احرار پولیٹکل کانفرنس امیر شریعت کی صدارت میں شروع ہوئی، جس میں خطبۂ صدارت سنانے کے بعد شاہ جی (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) نے فرمایا:

''اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے۔ دوسرا ختم نبوت کا ہے۔ چوں کہ مسلمان سیاسی الجھنوں میں پڑ گئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور ہندوستان کو ابدی غلامی سے جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوت اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مسلمانوں کے اس دائمی لعنت سے بچنے کے لیے کوئی راہ سوچنی ضروری ہے۔ تیسرا مسئلہ جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ پولیٹیکل اچھوت کا ہے۔ وہ ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہندوؤں کو دبانے سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اب وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا لیکن ہندوستان کے مسلمان جو ہزاروں سال سے حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اگر ان کو مساوات اور انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوت کو اپنے میں جذب نہیں کر سکتا۔ کائنات میں سب سے بڑا اچھوت غلام رہا ہے۔ غلام کا جسم اور اس کی کمائی اپنی نہیں ہوتی بلکہ مالک کی ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے دنیا میں آ کر غلام کا درجہ بلند

کردیا ہے اور اچھوت پر سب سے بڑا احسان کیا۔ یہ سب حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات سے واضح ہے، جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد ہمشیرہ کا نکاح زید سے منسوب کردی جو غلام تھا۔

اسلام نے مذہب کے معاملے میں بھی جبر واکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے اسلام کی تلقین کی کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مسلمان نہیں ..... ہمارا فرض ہے کہ اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعہ اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ رہے ..... اس لیے کوئی تلوار کارگر نہیں ہوتی بلکہ اخلاق کی تلوار ہمیشہ کے لیے انسان کو رام کرلیتی ہے، اس لیے اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملانے اور دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ تم اس خُلق عظیم کو اختیار کرلو جو اسلام نے ہمیں بخشا ہے''۔[1]

آخر کار مجلس احرار اسلام نے دینی، تعلیمی، تبلیغی اور سیاسی کوششوں کے لیے مختلف دفاتر کھولے، مختلف کانفرنسیں کیں تاکہ ان دفاتر سے ایک ہی کام لیا جائے اور وہ ہے قادیانیت کی بیخ کنی اور مسلمانوں کے اندر صحیح اسلامی تبلیغ کرتے رہنا۔ مجلس احرار اپنے اس مقصد میں مکمل طور پر کامیاب رہی اور احراریوں کی یہ کوشش تقسیم ہند کے بعد بھی جاری رہی۔

کوئٹہ زلزلہ:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ اب انسانوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس حد تک حکم خداوندی کے تابع کرتا ہے۔ اگر نیکی کی راہ چنتا ہے تو اللہ رب العزت کے نزدیک برگزیدہ ہوجاتا ہے اور اگر برائی کا راستہ اپناتا ہے تو اللہ اسے مختلف طریقے سے سزائیں دیتے ہیں، مگر ان میں بعض سزائیں وہ ہیں جن کا ظہور دنیا میں ہی ہوجاتا ہے۔ پچھلی قوموں کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے سزائیں دیں اور وہ ہلاک ہوئے۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس کی مثالیں کبھی کبھی سامنے آتی رہتی ہیں۔ اس میں ایک تنبیہ ہے اللہ کی طرف سے کہ یہ تمہارے غلط اعمال کے نتائج ہیں، ہوشیار ہوجاؤ اور اپنے

---

[1] کاروان احرار۔ ج ۲۔ ص: ۴۴۴

اعمال کو درست کرلو۔

اللہ رب العزت قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے:

ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس الخ۔

(پھیل گیا فساد خشکی اور تری (دریا) میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ چکھایا جائے ان کو مزہ ان کے کام کا شاید واپس آ جائیں)

فساد وہ آفتیں بھی ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں پر آتی ہیں اور ان آفتوں میں ایک زلزلہ ہے۔ لیکن جب یہ آفتیں دنیا کے کسی خطے میں آتی ہیں تو ہر انسان ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ وہاں مذہب وملت اور رنگ ونسل کا امتیاز نہیں برتا جاتا، بلکہ ہر شخص کے اندر اس کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے اور وہ اپنے آپ کو خدمت خلق میں لگا دیتا ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ۳۱ رمئی ۱۹۳۵ء کو زلزلہ کی صورت میں بلوچستان کے ایک شہر کوئٹہ میں جب کہ رات کے تقریباً تین بجکر تین منٹ ہو رہے تھے پیش آیا، جس میں ہزاروں جانیں تلف ہوئیں شہر اور دیہاتوں کے نقشے بدل گئے۔ کوئٹہ شہر کا بابو محلّہ اس سے خاصا متاثر ہوا۔ چالیس ہزار سے زیادہ اموات ہوئیں جب کہ سرکاری اطلاع کے مطابق پچاس ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔

احرار ریلیف کیمپ:

ایسے موقع پر چاہیے تو یہ تھا کہ اس قیامت صغریٰ میں انسان انسان کے کام آتا، ہندوستان کی سیاسی اور غیر سیاسی تنظیمیں بڑھ چڑھ کر کوئٹہ میں خدمت خلق کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتیں، مگر ایسا نہ ہوسکا، سوائے چند مقامی تنظیموں کے کسی نے بھی اس خدمت میں دلچسپی نہیں دکھائی، مگر احرار رہنماؤں نے جو اپنے اندر بے شمار خدمت خلق کا جذبہ رکھتے تھے، شعبۂ خدام خلق کے تحت لاہور دہلی دروازہ سے باہر کوئٹہ ریلیف کیمپ قائم کر دیا۔ ڈاکٹروں اور کمپونڈروں کی ایک کثیر تعداد پوری تیاری کے ساتھ کوئٹہ روانہ کی گئی۔ ساتھ میں رضا کاروں کی بھرتی کا اعلان بھی کیا گیا جو کوئٹہ سے آنے والے زخمیوں کی دیکھ بھال میں ہاتھ بٹا سکیں اور

مصیبت زدگان کی امداد کے لیے ریلیف فنڈ بھی جاری کیا۔

مذکورہ حادثہ میں مجلس احرار اسلام کی خدمات کا صحیح اندازہ روزنامہ انقلاب میں شائع شدہ ذیل کی خبروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ عبدالمجید سالک مدیر روزنامہ انقلاب رکھتے ہیں:

"آج تیسرے پہر میں نے مجروحین کوئٹہ کے اس کیمپ کا معائنہ کیا جو مجلس احرار نے باغ بیرون دہلی دروازہ میں قائم کر رکھا ہے، بحالات موجودہ ایک سو سے زائد بستروں کا انتظام شامیانوں کے نیچے مجروحین کے علاج کا بیک وقت انتظام ہے۔ ایم۔ جی ہائی اسکول کی عمارت میں بھی مجروحین ہیں۔ اس کیمپ میں عورتیں اور بچے بھی مجروحین ہیں، جن کی دیکھ بھال کے لیے عورتیں مقرر ہیں۔ پناہ گزینوں کے نام کا رجسٹر موجود ہے، بجلی کے پنکھے اور روشنی کا بہترین انتظام ہے، مجروحین کی خوراک کا انتظام بھی خوب ہے۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان، ڈاکٹر عبدالرحیم خان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس سابق سول سرجن اور ان کے ساتھ دوسرے ڈاکٹر ہمہ تن مصروف ہیں۔

بحیثیت مجموعی احرار کیمپ نہایت مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایسے میں مسلمانان لاہور کا فرض ہے کہ وہ مجلس احرار کی دل کھول کر امداد کریں۔ کیوں کہ اس وقت صرف یہی ایک کیمپ ہے جو مجلس احرار نے قائم کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین۔"[1]

اس طرح تقریباً ایک ماہ تک احرار کی طرف سے قائم کردہ کوئٹہ ریلیف کیمپ خدمت خلق میں لگا رہا۔ اور جب انہیں محسوس ہونے لگا کہ اب ہماری ضرورت ختم ہو چکی ہے تو ریلیف کیمپ اٹھالیا گیا مصیبت زدگان صحت یاب ہو کر گھروں کو جا چکے تھے جو بچ گئے انہیں لاہور ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا، لاوارث بچوں کو پنجاب کے خیراتی اداروں کے سپرد کر دیا گیا۔ بیوہ عورتوں کو کچھ تو ان کے وارث لے گئے بقیہ کو دارالامان بھیج دیا گیا۔ اس طرح مجلس احرار نے اپنے اوپر عائد شدہ انسانی فرائض کو بحسن وخوبی پورا کیا۔

وائسرائے کا اعتراف:

"ھر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" پھر مجلس احرار کو ہندوستان بھر میں شہرت ملی، ان کے

---

[1] روزنامہ انقلاب لاہور، ۸ جون ۱۹۳۵ء

خلوص اور خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا۔ یہ شہرت جب حکومت کے ایوانوں تک پہونچی تو وائسرائے ہند نے احرار کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں وائسرائے ہاؤس دہلی بلایا۔ اس موقع پر احرار میں دو گروہ ہو گئے، دونوں گروہوں کے موقف کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں:

پہلے گروہ کی رائے تھی۔

''جب ہم نے کسی سیاسی ضرورت یا غرض سے کوئٹہ کے مصیبت زدگان کی امداد نہیں کی تو پھر ہمیں اس مسئلہ میں حکومت کے تعاون کو پسند کرنا چاہیے اور اتنی سی بات پر حکومت کی ناراضگی لینا درست نہیں''

دوسرا گروہ جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری شامل تھے۔ ان کی رائے تھی۔

''اگر ہم نے کسی سیاسی ضرورت یا غرض سے یہ کام نہیں کیا تو پھر ہمیں حکومت کی خوشنودی کے بجائے اس کا صلہ اللہ تعالیٰ سے لینا چاہیے''

دوسری دلیل تھی۔

''ملک ہمارا، تباہی بھی ہمارے ملک کی ہوئی، بھائی بھی ہمارے مرے، ہم نے جو کچھ کیا ہے انسانیت کے لیے کیا ہے، انگریز سے سرٹیفکیٹ یا انعام کے لیے نہیں۔ لہذا ہمیں وائسرائے ہاؤس نہیں جانا چاہیے''

اس مسئلہ پر خوب بحث و مباحثہ ہوا، آخر اول الذکر گروہ کو شکست ہوئی اور احرار رہنماؤں نے وائسرائے کو ملنے سے انکار کر دیا۔[1]

مسجد شہید گنج:

عسکری اعتبار سے پنجاب انگریزی حکومت کا بازوئے شمشیر زن تھا، وہ کسی صورت میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ہندو، مسلمان اور سکھ کے درمیان آپسی اتحاد رہے، جس کے باعث حکومت میں رخنہ ہو، چنانچہ اپنی سیاست کو ہر رخنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے پنجاب میں نہ صرف تین قومی مسئلہ

---

[1] کاروان احرار، ج ۲، ص: ۲۰۷

پیدا کر رکھا تھا بلکہ شہری اور دیہاتی کی تقسیم بھی کی ہوئی تھی۔

پنجاب کے شہروں کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ سیاست میں نئے نئے ہنگامے یہاں پیدا ہوتے رہے۔ جلیاں والا باغ کا واقعہ یہاں پیش آیا، مارشل لا یہاں لگایا گیا، تحریک کشمیر یہاں سے اٹھی، نامور انقلابی یہاں سے ابھرے، اردو کے بڑے بڑے اخبارات یہاں سے نکلتے تھے، کانگریس نے آزادئ کامل کا ریزولیوشن یہیں دریائے راوی کے کنارے پاس کیا، تحریک احرار یہاں سے اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ مسلم لیگ نے پاکستان کا ریزولیوشن یہاں پاس کیا۔ ناممکن تھا کہ انگریز اس صوبے کو جو سارے ہندوستان میں ان کے استعماری مقاصد کا پشتیبان تھا ان لوگوں کے حوالے کر دے جو اس کی حکمرانی کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا جانباز سپاہی اس مٹی ہی کی پیداوار ہے، اس میں اس کا مفاد تھا کہ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھے اور یہ فرض اس کے مہرے ہی ادا کر سکتے تھے۔ شہید گنج انہدام انہی مہروں کا کرشمہ تھا۔

لاہور کے مسلمان مسجد شہید گنج کو صرف ایک مسجد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ کب بنی؟ کیوں کر بنی؟ کس نے بنوائی؟ ماقبل میں اس پر کیا بیتی؟ مسجد سے گردوارہ کیسے ہوئی؟ سکھوں نے اس پر کس طرح قبضہ کیا؟ انہدام سے پہلے لاہور کے مسلمانوں کی اکثریت اس سے ناواقف تھی۔

مسجد کی تاریخی حیثیت:

شہید گنج کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ مسجد ہے اور واقعی مسجد تھی، ایک دفعہ جہاں مسجد بن جائے شرعاً اور اسلاماً ہمیشہ مسجد رہتی ہے۔ سکھوں کا بیان تھا کہ اورنگ زیب کے گورنر معین الملک نے یہاں سکھوں کو قتل کیا تھا، یہ ان شہیدوں کی یادگار ہے اور اسی نسبت سے گوردوارہ شہید گنج کہلاتی ہے، لیکن کاروان احرار کے مصنف جانباز مرزا اس مسجد کی تاریخی حیثیت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اس مسجد کا اصل نام ''عبداللہ خان کی مسجد'' تھا، اسے ۱۰۶۴ھ میں شاہ جہاں کے ولی عہد داراشکوہ کے خانساما (کھانا بنانے والا نہیں بلکہ سامان کی حفاظت کرنے والا) محمد عبداللہ نے

تعمیر کیا تھا۔ مغلیہ دور حکومت میں باغی سکھوں کو اس جگہ قتل کیا گیا تھا۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب پر قابض ہوا تو اس نے سکھوں کی سمادھیاں جو یہاں قتل ہوئے تھے، یہاں بنوادیں اس طرح سکھوں کی زبان میں یہ گوردوارہ شہید گنج قرار دیا گیا''[1]

جانباز مرزا صاحب کی مذکورہ بالا تحریر میں یہاں پر مغلیہ دور حکومت میں سکھوں کو کب قتل کیا گیا اس کی تخصیص نہیں کی گئی، جب کہ سکھوں کا دعویٰ تھا کہ اورنگ زیب کے گورنر معین الملک نے سکھوں کو قتل کروایا تھا، حالاں کے سکھوں کا دعویٰ بھی تاریخی طور پر غلط تھا، اورنگ زیب کی وفات کے بہت عرصہ بعد احمد شاہ کے زمانہ میں معین الملک کا تذکرہ ملتا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''۱۷۵۰ء میں احمد شاہ ابدالی نے دوسری بار پنجاب پر حملہ کیا، صفدر جنگ نے مغل بادشاہ احمد شاہ کے اصرار پر ابدالی کے خلاف مرہٹوں سے معاہدہ کیا۔ لیکن یہ معاہدہ بار آور نہ ہوا، معین الملک نے جو لاہور کا وائسرائے تھا، ابدالی سے صلح کر لی اور پنجاب کا کچھ علاقہ ابدالی کے حوالے کر دیا''[2]

مسجد کی شہادت:

۲۸ اور ۲۹ جون کی درمیانی رات سکھوں نے رات کی تاریکی میں مسجد کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ صبح ہوتے ہی سارے پنجاب میں بازگشت سنائی دینے لگی۔ مسلمانوں کا برانگیختہ ہونا فطری بات تھی۔ چنانچہ مسلم رہنماؤں سے لے کر عوام تک میں ہلچل مچ گئی، پورا شہر بھڑک اٹھا، مسلمان جوق در جوق جمع ہونے لگے لیکن یہاں پر ایک سوال یہ تھا کہ سکھوں نے مسجد گرائی تو کیوں؟ جب مذکورہ حادثہ سے قبل کئی عدالتوں کے فیصلے اس مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف ہو چکے تھے اور پونے دو سو سال سے سکھوں کا اس مسجد پر قبضہ تھا۔

مسجد کے انہدام کے متعلق جو وجوہات کتابوں میں دستیاب ہے ان میں سب سے اہم وجہ ہندوستان میں ہونے والا آئندہ اسمبلی الیکشن تھا، شورش کاشمیری نے جن چند وجوہات کا تذکرہ اپنی کتاب

---

[1] کاروان احرار، ج ۲، ص: ۲۲۲

[2] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، خلیق احمد نظامی، ۱۹۵۰ء، ص: ۱۹۳

میں کیا ہے وہ مختصراً اس طرح ہیں:

۱۔ اب ۱۹۳۷ء میں صوبجاتی خود مختاری کی بنیاد پر انتخابات آ رہے تھے تو اقتدار حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مختلف جماعتوں کے علاوہ سکھوں کے مختلف دھڑے بھی اپنے اپنے داؤں پر تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ کی جماعت کو شکست دینے کے لیے سندر سنگھ مجیٹھیا پارٹی نے شہید گنج کے انہدام کی نیو رکھی۔

۲۔ انگریزوں کو صوبجاتی خود مختاری کے ہاتھوں بجا طور پر خدشہ تھا کہ ہندوستان میں ہندو مجارٹی کے صوبے ان کے ہاتھ نہیں آ سکتے .....۔

۳۔ ہندوؤں کے متعلق انگریزوں کو یقین تھا کہ ان پر کانگریس کے اثرات قوی ہیں۔ سکھوں کے بارے میں بھی وہ سمجھتے تھے کہ سندر سنگھ مجیٹھیا پارٹی اتنی نشستیں حاصل نہیں کر سکتی کہ ساری سکھ قوم کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکے کہ وہ انگریزی حکومت کا ساتھ دے گی۔ احرار نے تحریک کشمیر میں پنجاب کے شہری اور قصباتی علاقوں میں جو رسوخ حاصل کیا تھا وہ انگریزوں کے لیے پریشان کن تھا..... انہیں ڈر تھا کہ احرار نے دس فیصد نشستیں بھی حاصل کر لیں تو یونی نیسٹ وزارت کا بننا دشوار ہو جائے گا۔

۴۔ احرار کو مٹانے، یونی نیسٹ وزارت بنانے اور صوبہ کو بہ کمال و تمام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی دھن نے شہید گنج کا قضیہ پیدا کیا، چال یہ تھی کہ احرار حصہ لیں گے تو پٹ جائیں گے، گریز کریں گے تو مٹ جائیں گے۔ پہلی صورت میں سرکار کے معتوب ہو کر جیل خانہ میں جگہ ہوگی، دوسری صورت میں مسلمانوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر اپنی عزت و شہرت دونوں گنوا بیٹھیں گے۔ وہی ہوا۔ احرار چکی کے اس پاٹ میں پس کر رہ گئے، ان پر اتنی طاقتوں نے مل کر حملہ کیا کہ ان کے لیے سنبھالا لینا مشکل ہو گیا۔

۵۔ مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ کانگریس اور مرحوم خلافت کمیٹی کا وہ سارا گروپ اکٹھا ہو گیا جو احرار سے اختلاف ہی نہیں للّٰہی بغض رکھتا تھا، یہ لوگ شہید گنج سے اتنے مخلص نہیں تھے جتنا احرار کے خلاف تھے۔

۶۔ جب تک مولانا ظفر علی خاں اور ان کے رفقاء نظر بند نہ ہوئے لاہور کے سرکاری امراء اور خاندانی کاسہ لیس ان کے گرد و پیش شہید گنج کی بازیابی کے مطالبہ میں شریک رہے، لیکن احرار کو پٹوا کر اور عوام کو بھنوا کر یہ پیدائشی حلقہ بگوش اس طرح روپوش ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔[۱]

---

[۱] بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، شورش کاشمیری، ص: ۷۵

مذکورہ بالا وجوہات میں دو وجہ خاص طور پر اہم ہیں ۔ ایک یہ کہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں حکومت اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتی تھی ، دوسرے یہ کہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ پنجاب کے مسلمانوں پر جس طرح مجلس احرار کا اثر قائم ہے اسے ختم کیا جائے ،عوام کو ان سے بدظن کیا جائے اور مسلمانوں کے اندر سیاسی اختلافات پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

احرار کا موقف:

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسجد شہید گنج کا انہدام ایک منظم سازش کے تحت کیا گیا تھا۔ جس میں خاص طور پر ۱۹۳۷ء میں ہونے والا اسمبلی انتخاب اور اس میں کامیابی کے لیے مجلس احرار کا اثر و رسوخ ختم کرنا تھا۔اس مقصد کے لیے حکومت کے علاوہ اپنوں نے بھی مجلس احرار کے خلاف ہنگامہ آرائی کی ، جگہ جگہ ، مسجدوں میں ، جلسہ گاہوں میں اور مختلف اخباروں میں احرار کے خلاف کہا اور لکھا گیا، جس میں مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ہمنوا پیش پیش تھے۔ روزنامہ زمیندار میں مولانا موصوف نے احرار کے خلاف جس طرح کے اشعار کہے ہیں ان سے مولانا کی احرار دشمنی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً احرار کے متعلق لکھتے ہیں:

اللہ کے گھر کو کوئی ڈھادے تو یہ خوش ہیں　　مسجد کا نشاں کوئی مٹادے تو یہ خوش ہیں
مسلم کا کوئی خون بہادے تو یہ خوش ہیں　　لاہور میں آثار قیامت ہے نمودار

پنجاب کے احرار اسلام کے غدار[1]

ان حضرات کا مقصد صرف یہ تھا کہ احرار مسجد کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن کیوں نہیں چلاتے ، سول نافرمانی کیوں نہیں کرتے اور گرفتاریاں کیوں نہیں دیتے ، جب کہ احرار زعماء نے اس حقیقت کو سامنے رکھ کر کہ مسجد تقریباً پونے دو سو سال سے سکھوں کے قبضے میں ہے ، ماقبل میں عدالتوں نے اپنا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف کیے ہیں، کسی غیر قانونی حرکات کو نامناسب سمجھا اور نہ ہی مسلمانوں کو اس کی دعوت دی۔ ان کے نزدیک مسجد کا حصول صرف باہمی افہام و تفہیم سے ہی ممکن ہو سکتا تھا، لہذا احرار نے اس تحریک میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ ہم مسلمانوں کے خون کی ذمہ داری نہیں لے سکتے ، مسجد

---

[1] نگارستان، ظفر علی خاں، ص:۲۳۲

شہید گنج اس طرح نہیں مل سکتی اور اگر مل سکتی ہے تو وہ لوگ کہاں ہیں جو شروع میں درباری ڈربوں سے نکل کر بانگ دے رہے تھے۔

احرار کی وضاحت:

مجلس احرار اسلام نے مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں فوری طور پر ۲۸/ جولائی کو پنجاب اور سرحد کے مختلف الخیال مسلم رہنماؤں کا ایک مشترکہ اجلاس لاہور میں بلایا اور احرار کے نمائندوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

''مسجد کو حاصل کرنے کی ہم نے کبھی مخالفت نہیں کی، لیکن سول نافرمانی یا تشدد کے ذریعہ مسجد کے حصول کو ناممکن ضرور سمجھا، مسجد کے حصول کے متعلق دو ہی راستے ہمارے ذہن میں ہیں۔ اول عدالت کے ذریعہ، دوسرا سکھوں سے باہمی افہام وتفہیم سے یا کسی باعزت سمجھوتے کے ذریعہ۔ بحیثیت مسلمان کے مسجد کے تحفظ کا سوال ہمارے پیش نظر تھا''

مجلس احرار کے مذکورہ بالا وضاحت کے بعد مشترکہ کمیٹی نے چند قراردادیں پاس کیں جو مختصراً درج کی جاتی ہیں:

(۱) پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلم مندوبین کا یہ اجلاس مسجد شہید گنج لاہور کے انہدام پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ اور سکھوں کے اس غیر تہذیبی اور غیر روادارانہ فعل کی پُر زور مذمّت کرتا ہے۔

(۲) نیز مسلم شہداء کے لیے جو تحفظ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں شہید ہوئے ہیں۔ دعائے مغفرت کرتے ہوئے زخمیوں، قید شدہ اور زیر حراست کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

(۳) نیز مسلم مندوبین کا یہ اجلاس اپنے اس عزم کے اعلان کے بعد کہ مسلمان کسی حالت میں تحفظ مسجد شہید گنج کے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ذیل کے اراکین پر مشتمل ایک سب کمیٹی بدیں غرض مقرر کرتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں تمام پنجاب اور سرحد کے چیدہ چیدہ افراد کے پورے طبع شدہ مشورہ کے بعد کوئی پروگرام بنائیں جس میں ذیل کے امور کا خاص خیال رکھا جائے۔

ا۔ مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر تلوار رکھنے کی اجازت۔

ب۔ مساجد اوقاف کے تحفظ کے لیے ایکٹ کا نفاذ۔

ج۔ مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں گرفتار شدگان کی رہائی اور شُہداء کے خون کا معاوضہ دلایا جائے۔

د۔ نیز یہی سب کمیٹی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے کہ سکھوں سے مسجد کے متعلق گفتگو کر کے باعزت مفاہمت کرنے کی کوشش کرے۔

چنانچہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر روز نامہ زمیندار، سید حبیب روز نامہ سیاست لاہور، میاں امیر الدین میونسپل کمشنر لاہور اور احرار کی طرف سے مولانا داؤد غزنوی تھے۔ ۴ر جولائی کو گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے نمائندوں سے گفتگو کا دن طے ہوا۔ اس سے قبل ان حضرات نے آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کی رائے لینے کی جب کوشش کی تو ایک اہم بات سامنے آئی اور وہ مولانا ظفر علی خان کا یہ قول تھا کہ:

''مجھے ایک بہت بڑے مسلمان افسر نے کہا ہے کہ آپ ایجی ٹیشن جاری رکھیں، حکومت یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دے گی''[1]

یہی چند الفاظ ہیں جس نے تحریک شہید کے دوران اختلافات کی بنیاد رکھی، کیوں کہ بعینہ یہی الفاظ سکھوں سے بھی کہے گئے۔ مثلاً سید حبیب نے مولانا ظفر علی خاں سے کہا:

''میں نے یہ سنا ہے کہ کسی ذمہ دار شخصیت نے سکھوں سے کہا ہے کہ تم حق بجانب ہو، قانون تمہاری حمایت پر ہے، اور عدالت کے فیصلے تمہاری پشت پناہی کر رہے ہیں، تم اگر مسجد گرانا چاہو تو تم کو حق ہے اور مسلمانوں کے شورش کی وجہ سے اگر سکھ خطرہ محسوس کریں تو بالکل بے فکر رہو، حکومت پولیس اور فوج کے ذریعہ تمہاری حفاظت کرے گی''[2]

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں سے بھی وہی کہا گیا جو سکھوں سے کہا گیا۔ آخر کیا وجہ تھی؟ انہی وجوہات کی بنا پر احرار نے مسجد شہید گنج کے لیے کسی طرح کی ہنگامہ آرائی کو پسند نہیں کیا بلکہ

---

[1] کاروان احرار۔ ج ۲۔ ص: ۲۲۴

[2] کاروان احرار، ج ۲، ص: ۲۲۸

آپسی گفتگو کو بہتر سمجھا اور اسی کا لوگوں کو مشورہ دیا۔ چنانچہ جب مسلمانوں کا وفد مصالحت کے لیے سکھوں سے ملا تو مولانا داؤد غزنوی نے ایک تجویز پیش کی جس پر غور کرنے کے لیے سکھ رہنما تیار بھی ہو گئے مگر مولانا ظفر علی خان کی ضد نے اس گفتگو کو ناکام بنا دیا۔

مولانا داؤد غزنوی کی پیش کردہ تجویز اس طرح تھی:

''اگر آپ انہدام مسجد کے ارادے سے باز آ جائیں اور منہدم شدہ حصے کی مرمت کرا دیں اور آئندہ مسجد کی حرمت کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں نیز مزار حضرت کا کوشاہ کے لیے پانچ فٹ کا راستہ مسلمانوں کو دے دیں تو زخمی دلوں کو قدرے سکون ہو جائے گا''

سکھوں کی طرف سے کہا گیا کہ:

''ہاں! اس تجویز پر ہم غور کرنے کو تیار ہیں، بشرطیکہ اس فیصلے پر اس قضیے کو ختم کر دیا جائے اور آئندہ کوئی سوال اس قضیے وغیرہ کا نہ اٹھایا جائے، ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسری انجمن اٹھ کھڑی ہو اور از سر نو اس قضیے کو شروع کر دے''

مولانا ظفر علی خاں نے سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ سے کہا:

''اچھا ماسٹر جی! جیسے کہ مولانا داؤد غزنوی کی تجویز ہے، کہ مسجد کے منہدم شدہ حصے کی آپ مرمت کروایں اور مزار کے لیے پانچ فٹ کا راستہ دے دیں۔ مگر باقی امور کے لیے میں اپنا حق محفوظ رکھتا ہوں اس مصالحت کے بعد میں یہ حق عدالت کے ذریعہ وصول کروں گا، جس سے مسجد واگزار ہو سکے''

ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ:

''مولانا صاحب! اگر یہ بات ہے تو پھر سارا کچھ آپ عدالت سے حاصل کریں''[1]

مذکورہ بالا گفتگو کے بعد مسلم رہنماؤں نے مولانا ظفر علی خاں کو بہت سمجھایا کہ آپ مان جائیں لیکن مولانا راضی نہ ہوئے اور بات یہیں پر ختم ہو گئی اور سکھوں کا مسجد شہید گنج پر قبضہ ہو گیا۔

---

[1] کاروان احرار۔ ج ۲۔ ص: ۲۲۸-۲۲۶

نتیجہ:

آخر کار جس تحریک کا آغاز جون ۱۹۳۵ء میں شروع ہوا تھا، جس کے نتیجے میں مسلمان نوجوانوں نے گولیاں کھائیں، جیلوں میں گئے، مجلس احرار کو مطعون کیا گیا، بحیثیت قوم مسلمان رسوا ہوئے۔ مئی ۱۹۳۶ء کو اس کا نتیجہ سامنے آ گیا، یعنی مجلس اتحاد ملت (جو مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ہم نواؤں کا قائم کردہ تھا) کی عاملہ نے اپنے ارکان کو اجازت دے دی کہ مسجد شہید گنج کو مدعا بنا کر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑیں۔ مجلس اتحاد ملت کے چند نوجوانوں نے اس کی مخالفت بھی کی، مظاہرے بھی کیے لیکن یہ سب بے سود رہا۔

آرمی بل کی مخالفت:

اقوام یورپ اپنے تہذیب وتمدن پر صدیوں نازاں رہی مگر وہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے تو زیور انسانیت بھی شرما گئی اور وحشت وبربریت کے شکار ہوئے۔ اور جنگ وجدال کے راہوں پر کھڑے ہو گئے۔ اور ملک وآبادی کے تباہی و بربادی پر آمادہ نظر آنے لگے۔ ۱۹۱۴ء سے قبل یورپ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ جرمن اسٹریا اور اٹلی اور دوسرے حصہ میں انگلستان فرانس، روس، جاپان تھا۔

یورپی ممالک کے ان دو حصوں میں اسلحہ کی دوڑ، بحری و برّی افواج کی طاقتوں میں روز بروز اضافہ، یہ دونوں طاقتیں اس قدر وسیع ہوئی کہ آگے چل کر قوم پرستی کی علامت بن گئیں۔ جب کہ ایک مذہب وتہذیب کے ہوتے ہوئے بھی الگ الگ قومیں سمجھی جانے لگی۔

جنگ عظیم (۱۹۱۸-۱۹۱۴ء) میں انسانی جانیں جتنی شہید ہوئی جتنی آبادیاں ویران وبرباد ہوئی، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس عظیم المیے کے باعث تہذیب نو کی دعویدار قومیں انسانیت کے نام پر آئندہ انسانی تباہی سے گریز کرتیں۔ لیکن ۲۱ برس گذر جانے کے بعد پھر ہوس کے اقتدار میں سامراجی طاقتیں ایک دوسرے میں ٹکرا گئیں۔ اور اپنی اغراض کی خاطر انسانوں کے خون سے اپنے محلات کو زینت بخشیں۔

چنانچہ ۳/اگست ۱۹۳۹ء کو ہٹلر بحیثیت سپریم کمانڈر آف دی آرمڈ فورسز اپنا تحریری فیصلہ جنگی طرز عمل کے بارے میں جو دیا اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے،

''مشرقی سرحد کے حالات کو پرامن ذرائع سے حل کرنے کے تمام سیاسی امکانات ختم ہوگئے ہیں..... باقی تقسیم کار اور منزل مقصود میں کوئی تبدیلی نہیں''

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر کی فوجوں نے سرحد پار کر کے شمال جنوب اور مغرب کی جانب سے پولینڈ کی دارالحکومت وارسا کی طرف بڑھنے لگیں۔ جہاں برطانیہ نے ۱۹۱۸ء میں جرمن سے ذلت آمیز معاہدہ کیا تھا۔ جرمن کی افواج جہازوں کے ذریعہ پے در پے اپنے ہدف پورا کرتا رہا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے برطانیہ نے بھی اعلان جنگ کر دیا۔ اپنی تقریر میں برطانوی وزیراعظم نے کہا۔

''آج صبح برطانوی سفیر نے برلن میں جرمنی حکومت کو آخری نوٹس پیش کر دیا تھا کہ جرمن پولینڈ سے اپنی فوجیں ہٹا لینے پر تیار رہے ورنہ برطانیہ اور جرمن کے خلاف حالت جنگ ہو جائے گی .....اب میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو برکت دے خدا حق کو فتح کرے''

اسی روز وائسرائے ہند لارڈ لن لیتھکو نے ہندوستانیوں کے نام اپنا ایک پیغام ٹیلی کاسٹ کراتے ہوئے کہا۔

''۳ر ستمبر کو برطانیہ نے جرمن کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے، ہندوستان بھی اس جنگ میں جرمن کے خلاف شریک ہے.....لہٰذا ہندوستانیوں کو چاہیے کہ وہ برطانیہ کی امداد کریں''

اسی کے ساتھ وائسرائے نے ہندوستان کے مقتدر سیاسی رہنماؤں سے انفرادی طور پر ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور انہیں آمادہ کرنے لگے کہ کسی طرح ان کو اپنا ہمنوا بنالیں۔ اور برطانیہ کی امداد پر آمادہ کریں۔ گاندھی سے ملاقات کے بعد جو باتیں ہوئی وہ کانگریس پارٹی کی پالیسی کی مظہر ہیں۔

''ہندوستان کے لئے آزادی کے حتمی وعدہ پر اعلان کر دیا جائے۔ کہ جنگ کے بعد عوام کی منتخب کردہ دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے کا حق دیا جائے گا''

برطانوی حکومت نے جہاں جنگ میں تعاون کی اپیل کی وہیں ملک بھر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کروادیا۔ سال رواں میں احراری رہنماؤں نے ضلع میانوالی کا دورہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انگریز اور پنجاب کی یونینیسٹ گورنمنٹ کو فوجی بھرتی کا جو نقصان ہوا اس کے انتقام میں حکومت ہند کے مشورے سے

مولانا مظہر علی اظہر سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر احراری رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیل کے اندر مقید کر دیا۔

مجلس احرار نے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو امرتسر میں حسب ذیل قرارداد منظور کی۔ جس کا خلاصہ درج ہے:

(۱) ہرگاہ کہ مجلس احرار انگریزوں کو آگاہ کرتی ہے کہ جب ملک ہمارا ہے فوج میں بھرتی بھی ہم دیتے ہیں، روپیہ بھی ہمارا ہے، تم انگریز سمندر پار سے آ کر ہم پر حکومت کرتے ہو۔ ان حالات میں تمہیں کوئی حق نہیں پہونچتا کہ ہماری رائے کے بغیر تم ہم کو ایک ایسی جنگ میں شامل کر لو جس کا ہمارے ملک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور نہ ہم اس جنگ کے لیے انگریزوں کو فوجی بھرتی دینا چاہتے ہیں اور نہ جنگ کے لیے کسی قسم کی مالی امداد دینے کو تیار ہیں۔

(۲) اور مسلمان ہند اس وقت تک برطانوی حکومت کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کریں گے جب تک اسلامی ممالک سے برطانوی فوجیں واپس نہیں چلی جاتیں نیز ہندوستان کو مکمل آزاد نہیں کر دیا جاتا۔ ساتھ ہی برطانیہ نے کبھی بھی ہندوستان اور عالم اسلام بالخصوص فلسطین اور آزاد قبائل کے ساتھ اپنے دعوی کے مطابق کسی قسم کا عملی ثبوت نہیں دیا۔ اس لئے پولینڈ جیسے دور افتادہ ملک کی جدوجہد آزادی کے لیے جان و مال دے سکیں گے۔

ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے دوسری جنگ عظیم پر قرارداد منظور کی ان میں مسلم لیگ۔ کانگریس جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام ہند وغیرہ۔

ان تمام قرارداد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سوائے مجلس احرار اور جمعیۃ علماء ہند کے کسی بھی جماعت کا ذہن برطانیہ کی موجودہ پالیسی کے بارے میں ہنوز صاف نہیں تھا۔ مسلم لیگ، کانگریس وارداتوں کی مسلم اقلیت کے صوبوں پر زیادتی کا بہانا بنایا۔ اور سینٹرل اسمبلی میں آرمی بل اور ڈیفنس آف انڈیا رولز کی حمایت کر کے اپنی پالیسی واضح کر دی۔ کانگریس تین خیموں میں منقسم تھا۔ اس لحاظ سے کوئی پالیسی واضح نہ ہو سکی۔ احرار اور جمعیۃ کی دوٹوک پالیسی نے فرنگی اور اس کے حواریوں کو پریشان کر دیا۔

چنانچہ پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات فوجی وردی پہنے ہوئے صوبہ بھر میں فوجی بھرتی کے لیے گھومتے رہے۔ اور احراری رہنما اس کی مخالفت کرتے رہے، جس کے تحت بہت سے احراری گرفتار کر لیے

گئے۔ اور ان پر مقدمات چلا۔ ان لوگوں نے بھی عدالت میں اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے لگائے گئے الزامات کو قبول کرتے ہوئے جماعت کی پالیسی کو واضح انداز میں بیان کر دیا۔

مجلس احرار نے ایک عام اجلاس کر کے ورکنگ کمیٹی توڑ کر اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم کی۔ جس میں پہلے ڈکٹیٹر کے طور پر قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو نامزد کیا گیا تھا۔ اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے خلاف یوم احتجاج منایا۔ اسی اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ احرار کو اپنی سول نافرمانی کی تحریک گاندھی کے تحت شروع کرنی چاہیے۔ مولانا مظہر علی اور افضل حق جیل میں تھے۔ مولانا داؤد غزنوی نے دونوں سے مل کر بات کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ مولانا لدھیانوی کو وار دھا جا کر گاندھی، نہرو اور آزاد سے بات کرنی چاہیے۔ مگر پنجاب کی سیاست آڑے آئی اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔ ڈکٹیٹر شپ کے جملہ ممبران کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد ماسٹر تاج الدین انصاری کے کندھوں پر تمام ذمہ داری آئی۔ اور مولانا لدھیانوی اندرونی طور پر تحریک کے نگراں رہے۔ حکومت انہیں گرفتار کرنے کے لیے بہانے تلاش کر رہی تھی کہ عبدالمجید قریشی ہفت روزہ ''ایمان'' کا خط آیا۔ سلام و دعا کے بعد لکھا تھا۔

> ''سیرت کمیٹی چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ عظیم کے حالات اور مسائل سے باخبر رکھنے کے لیے خطبات جمعہ کا ایک کورس شروع کیا جائے اس میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے .....''

مجلس احرار کے ذمہ دار حضرات نے خط کے الفاظ سے محسوس کر لیا کہ یہ جاسوسی والا خط ہے۔ بعد میں مولانا موصوف پر یہ راز کسی طرح ظاہر ہو گیا۔ تب دہلی کے ایک اخبار میں اپنا بیان درج کرایا۔

> ''حکومت ہند کی سی آئی ڈی احرار پر نئے اور جھوٹے مقدمات بنا کر انہیں ملک میں بدنام اور ان پر تشدد کے الزام لگا کر طویل سزائیں دینا چاہتی ہے میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جن رضا کاروں سے حکومت ہند کے نمائندہ نے اس قسم کی بات چیت کی .....ہم ان کے نام اور پتے عنقریب ظاہر کر دیں گے۔ اور عدالت میں ان کی خلاف مقدمات دائر کریں گے۔ احرار اپنی سول نافرمانی کو پر امن طریق پر چلا رہے ہیں اور کسی تشدد کے لیے احرار میں کوئی جگہ نہیں''۔

مولانا موصوف جملہ مسائل اور ملک وملت پر اسی غور وفکر کے ساتھ سوچتے جن میں نقصان کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ خواہ وہ ہندوستان یا دنیا کا کوئی ملک ہو، اسی بنا پر دوسری جنگ عظیم میں انسانی جانیں ملک کی تباہی و بربادی اور ایک دوسرے میں نفرت وحقارت کی نشاندہی کرنے کے بعد مجلس احرار اسلام ہند کی پالیسی واضح کرنے کے ساتھ ہی بہت ساری تحریکات شروع کر کے ملک کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے۔

تجزیہ

سیاست میں ہارنا رسوائی ہے اور جیتنا فرماں روائی، احرار سیاسیات کے جس طوفان سے نکلے یا ان کے جدوجہد پر آخری زمانہ میں جو گذری وہ ایک تاریخی المیہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں برطانوی استعمار کے خلاف احرار سے بڑھ کر کسی مسلمان جماعت نے ذہنی آبیاری نہیں کی، تنہا احرار تھے جن سے وہاں کے مسلمانوں نے غیر ملکی غلامی کے خلاف جدوجہد کا ذوق حاصل کیا، پنجاب برطانوی سلطنت کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا، ہندوستان میں انگریزی حکومت کا انحصار زیادہ تر پنجاب کے سپاہیوں اور جاسوسی پر رہا ہے۔

احراری رہنما تحریک خلافت (۱۹۲۱ء) میں اٹھے اور ۱۹۳۰ء تک کانگریس کے ساتھ رہے، مسلمانوں کے ادنیٰ متوسط طبقے کا ایک گروہ تھا جس کا ذہن سیاسی و اسلامی تھا، یہ ایک ملغوبہ تھا جس میں انگریز دشمنی، اسلام دوستی، حب الوطنی، سرمایہ سے بیزاری، رجعت سے عناد، ایثار سے محبت، ظلم پر احتجاج، انقلاب کی خواہش اور جہاد کا ولولہ جمع ہو گئے تھے، کانگریس کا جو رژوائی ذہن، ہندو معاشرے کی عصبیتیں، تلخ سیاسی تجربے، اپنی انفرادیت کا احساس اور مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم کا تصور احرار کی تشکیل کا باعث بنا، لیکن کانگریس سے قطع تعلق کے باوجود آخر تک قطع ذہن نہ ہو سکا، ذہن ان کا وہی تھا جو کانگریس کا تھا، یعنی غیر ملکی استبداد کا خاتمہ، زبان ان کی اسلامی تھی اور وہ محض وطنیت یا محض قومیت کی بنیاد پر ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کے نزدیک انگریزی حکومت کو تہس نہس کر دینا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ نصاریٰ کی حکومت تھی اور نصاریٰ قرآن کی رو سے معتوب تھے۔

احرار پانچ ذہنوں کا مرکب تھے۔ اوّلاً کانگریسی ذہن جس کے رہنما مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

تھے، دوسرا جمعیتی ذہن یعنی علماء کا اجلال واحترام اوران کی استعمار دشمن روایتوں سے ربط وضبط، اس کے علم بردار سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ تیسرا ذہن اسلامی سوشلسٹ تھا جس کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ تمام خرابیوں کی جڑ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے، اس کے نزدیک لیگ کا سرمایہ دار اپاہج تھا اور اپنی بقا کے لیے مسلمانوں کو استعمال کرتا تھا، کانگریس کا سرمایہ دار متحرک اور ایثار پسند تھا، لیکن قولاً وفعلاً خطرناک، اس ذہن کے رہنما چودھری افضل حق تھے، جب تک زندہ رہے ان کا ذہن احرار کارکنوں کے دماغوں کی پرورش کرتا رہا۔ چوتھا ذہن فرقہ وارنوعیت کا تھا، اس کا خیال تھا کہ لیگ کا نعرہ حق ہے لیکن مقصد باطل، کانگریس کے ایثار کا اعتراف تھا لیکن شمول سے خوف زدہ، اس ذہن کے رہنما مولانا مظہر علی اظہر تھے۔ پانچواں ذہن اس سے بھی خوش اور اس سے بھی خوش، جدھر لے چلو آمادہ جہاد، اس گروہ میں شیخ حسام الدین طبعاً کانگریسی اور سردار محمد شفیع مزاجاً لیگی تھے، ان مختلف الذہن عناصر کو انگریز دشمنی، باہم دوستی کی یک رنگی اور خطابت کی جولانی نے اکٹھا کر رکھا تھا، اصلاً یہ ایک قافلہ درویشاں تھا جو پرسوز جان اور دل نواز سخن لے کر سیاسی جدوجہد کے میدان میں کود پڑا۔

احرار بلاشبہ علماء کے ذہن، خلافت کی تحریک الہلال کی فکر اور زمیندار کے قلم کی پیداوار تھے، لیکن ان کا انفرادی اور اجتماعی وجود پنجاب کے سیاسی گورستان میں صور اسرافیل تھا، ان کی خطابت کا سحر ایک نیا پنجاب پیدا کر رہا تھا، یہ پنجاب پیدا ہوا، لیکن اس پنجاب ہی نے احرار کو پسپا کر دیا اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس پسپائی میں احرار کی اپنی سیاسی غلطیوں کا ہاتھ بھی شریک تھا۔

احرار میں وہ لوگ شامل تھے جو مذہبی زیادہ تھے اور سیاسی کم۔ یعنی مذہب کو اولیت کا درجہ حاصل تھا اور سیاست ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جن اکابر کے یہ نام لیوا تھے وہ تقویٰ و پرہیزگاری، علم وعمل اور تدیّن وتدبّر کے لحاظ سے ان سے کہیں آگے تھے، جبھی تو یہ ان کے نام لیوا تھے، مگر جن کے یہ نام لیوا تھے وہ مذہب پر زیادہ عمل پیرا ہونے کے باوجود صرف سیاسی تھے، مگر ان کے ہاں مذہب کو اولیت حاصل تھی، جس کی بنا پر اول آخر یہ ایک تبلیغی جماعت بن کر رہ گئی۔ اس کی سیاسی حیثیت صرف شہروں تک محدود رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس احرار کو ہندوستان میں سیاسی قوت حاصل نہ ہوسکی۔ اس کی کئی

وجوہات ہیں۔

۱۔ مجلس احرار سے وابستہ رہنما اور رضا کار جدید تعلیم یافتہ نہ تھے، اعلیٰ سیاسی حلقوں میں انہیں کوئی تفوق حاصل نہیں تھا۔اس لیے ان کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔

۲۔ ان کی اکثریت بہادر رضا کاروں پر مشتمل تھی نہ کہ لیڈروں اور رہنماؤں پر، ظاہر ہے کہ رضا کار تعمیل ارشاد کے لیے تو موزوں ہو سکتا ہے، رہنمائی کے لیے نہیں۔

۳۔ ان کی اکثریت خطیبوں اور واعظوں پر مشتمل تھی، جو اپنی سحر بیانی اور خطابت کے زور سے وقتی طور پر حاضرین کو اپنا ہم نوا بنا سکتی تھی، مگر کوئی ٹھوس کام کر کے دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

۴۔ احرار میدان کے شہسوار ضرور تھے، مگر میز کے کھلاڑی نہیں تھے، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے اسرار و رموز میدانوں میں لڑ کر سمجھ میں نہیں آتے بلکہ ان کے لیے گول میز ہی موزوں جگہ ہو سکتی ہے۔ بیسویں صدی کا یہ خاصا ہے کہ اس میں کوئی اہم مسئلہ میدانوں میں حل نہیں ہوا، بلکہ ہر مسئلہ میز کے ارد گرد بیٹھ کر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوا ہے۔

۵۔ اس میں شامل حضرات خود ہی اس احساس میں مبتلا تھے کہ وہ کسی کا پیغام لے کر نکلے ہیں اپنے پاس کچھ نہیں ہے۔

۶۔ انہوں نے کھل کر سیاسیات ہند میں اس وقت قدم رکھا جب برصغیر دو متحارب گروہوں یعنی مسلم ہندو میں تقسیم ہو چکا تھا اور اس تقسیم کا سہرا نہرو رپورٹ اور جناح کے چودہ نکات کو حاصل ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں سے کٹ کر ہی علیحدہ ہوئے۔مگر چوں کہ ان حضرات کا روحانی تعلق حریت پسند علماء کے ساتھ تھا جو بوجوہ کانگریس سے تعاون کر رہے تھے اس لیے ان کا وزن اسی پلڑے میں تولا جاتا رہا۔

۷۔ ان کے پاس برصغیر کے مسائل کے حل کے لیے کوئی دوٹوک منصوبہ نہیں تھا، ان کے پاس تو ایک غیر معمولی پروگرام تھا، مگر دنیا کی یہ ریت رہی ہے کہ دو متحارب گروہوں میں صلح صفائی کے فرائض سرانجام دینے والا خود مارا جاتا ہے، یہی حال احرار کے ساتھ ہوا۔

۸۔ ان کے پاس اسٹیج تھا پریس نہیں تھا، زبان تھی قلم نہیں تھا، وہ ان اسباب و وسائل سے محروم تھے جن

پر زمانہ کی سیاسی تنظیموں اور قومی قیادتوں کے عروج اقبال یا نتائج و آثار کا انحصار تھا۔

۹۔ یہ جماعت اپنے قیام کے ابتدائی پانچ سال کے اندر ہی اندر انگریز کی مکارانہ سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی، چوں کہ مولوی تھے اس لیے مسجد ہی ان کے زوال کا باعث بنی، حالاں کہ ان کے موقف کی صحت کا شاہ کار مسجد شہید گنج کا وہ پہرے دار ہے جو آج بھی سنگین کی نوک پہرے دے رہا ہے۔ مگر مکار اسے کہا جاتا ہے جو سچ کو جھوٹ ثابت کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔

۱۰۔ یہ گروپ اپنی طبعی شرافت اور خلوص کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ پر اعتماد تھا، انہیں اپنے پرائے یا بُرے بھلے میں تمیز نہ تھی، جس نے انہیں خوش خلقی سے سلام کہہ دیا یہ سمجھے کہ وہ بجان دل ان کا خیر خواہ ہے۔ ان کے دل و زبان میں کوئی تفاوت نہیں تھا، جو زبان سے ایک دفعہ کہہ بیٹھتے اسے کر گذرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حالاں کہ سیاسی میدان میں مکر و فریب، جعل سازی اور مصلحت بینی اور وعدوں سے مکر جانا سیاسی کامیابی کہ اربعہ عناصر ہیں، مگر احراری حضرات کا ان سے دور کا واسطہ تک نہ تھا۔

۱۱۔ احرار من حیث المجموع ایک ایسی جماعت تھی جن میں ایثار زیادہ تھا علم کم، جذبہ زیادہ تھا سوچ کم، تقریر زیادہ تھی تنظیم کم، وہ سیاسی مخلصین کا ایک ایسا گروہ تھا جو اپنی جدوجہد میں ہر خوف سے بے نیاز رہتا اور نتیجہ کے لیے مضطرب نہیں ہوتا۔

۱۲۔ ان میں ایسی کوئی مرکزی شخصیت نہ تھی جس سے تمام ہندوستان کے مسلمان متاثر ہوں، وہ ان بادلوں کی طرح تھے جو صحراؤں پر برستے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا لدھیانوی احرار کی زبان تھے، عام احرار انہیں دونوں سے متاثر تھے، لیکن امیر شریعت اور رئیس الاحرار کہلانے کے باوجود مولانا حسین احمد مدنی کی طرح شیخ الاسلام نہ تھے کہ ملک کے طول و عرض میں ان کے شاگرد علماء ہوتے، ذہناً اتنے متبحر نہ تھے کہ مولانا آزاد کی طرح عوام میں اپنا مقام پیدا کر لیتے، قائد اعظم نہ تھے کہ قوم انہی کی ہو کے رہ جاتی، گاندھی، نہرو کی طرح بیچنے کا سوال ہی نہ تھا۔

۱۳۔ احرار نے اپنے قیام سے لے کر ہندوستان کے آزاد ہونے تک ہر طرح سے کانگریس کا ساتھ دیا، جس کی وجہ سے احرار پر پریشانیاں آئیں، الزامات بھی لگائے گئے اور خود ان کا کوئی اہم مقام نہ بن سکا۔

احرار کی کانگریس دوستی اور اس کے نتائج کے متعلق عبید اللہ قدسی ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

''احرار نے انگریز دشمنی میں کانگریس کا ہر طرح ساتھ دیا۔ پروگرام' کانگریس کا ہوتا' مگر رضا کارانہ خدمات احرار کی ہوتیں۔ قیادت کانگریس کی ہوتی، تو پیروکار احراری ہوتے۔ انہوں نے ہر جگہ کانگریس کے جھنڈے اُٹھائے۔ جمہوریت پسند مسلمانوں سے مخالفت مول لی اور حُریّت کے نام پر دل و جان سے کانگریس کے علم بردار بن گئے۔ اس پر خلوص رفاقت کا صلہ کانگریس نے یہ دیا کہ اُس نے ہر موقع پر احراریوں کی توہین کی۔ جہاں اسلام کی بات آئی، وہیں احراریوں کو رجعت پسند، فرقہ بند اور کٹّر مذہبی تک کہہ ڈالا اور ان پر بے تکے الزامات عائد کیے۔ کانگریس سے الگ ہونے کے باوجود احراریوں کے دلوں سے کانگریس کی محبت ختم نہ ہوئی۔ اس بات سے انہیں بڑا نقصان پہنچا۔ جب آزادئ ملی، تو احراریوں کا اپنا کوئی مقام نہ تھا۔ ہندوؤں نے مسلمان کہہ کر پاکستان کا راستہ دکھایا اور مسلم لیگ کی نظر میں یہ جماعت کانگریسی رہی۔ اور احراری کسی طور پر مسلم لیگ میں خود کو ضم نہ کر سکے۔[1]

دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مصنف احرار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجلس خلافت سے الگ ہونے کے بعد مستقل جماعت کے طور پر مجلس احرار نے جو ہنگامہ خیز تحریکیں منظّم کیں، ان میں دو خاص طور سے اہم ہیں: اول۔ کشمیر تحریک، دوم مسجد شہید گنج کی بازیابی کی تحریک (جو پہلے اور بنیادی مرحلے میں زیر سرکردگی ظفر علی خاں اور پیر جماعت علی شاہ) چلی۔ مجلس احرار کو کشمیر تحریک میں خاص کامیابی ہوئی اور کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کے دوران میں پنجاب کی حد تک مسلمانوں کی سب سے مقبول جماعت یہی تھی، لیکن شہید گنج کی بازیابی کی مہم میں (عام خیال کے مطابق آنے والے انتخابات میں شرکت محرومی کے خوف سے) شریک نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں اس کی مقبولیت باقی نہ رہی، رہی سہی کسر پاکستان تحریک میں (جو ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے مابین زمانے میں غیر معمولی طور پر مقبول رہی) اس جماعت کے متضاد اور غیر واضح رویے نے پوری کر دی جو ان کی ترکیبی طرز سیاست کا لازمی نتیجہ تھا۔ لکھنؤ کی مدح صحابہ تحریک کے علاوہ جنگ عظیم دوم میں انہوں نے کانگریس کی ہمنوائی میں فوجی بھرتی کی مخالفت بھی کی، لیکن حالات بدل چکے تھے۔ اب اصل مسئلہ برصغیر میں مسلمانوں

---

[1] آزادی کی تحریکیں، عبید اللہ قدسی، ادارۃ ثقافۃ اسلامیۃ لاہور ۱۹۸۸ء۔ ص: ۲۳۳

کے لیے الگ وطن کا حصول اور اس کے لیے جدو جہد تھی، لہٰذا باقی ہر نعرہ بے اثر رہا''[1]

۱۴۔ مذکورہ بالا وجوہات کے باوجود مجلس احرار کے کمزور ہونے کی ایک سب سے اہم وجہ جو احقر کے سمجھ میں آتی ہے وہ احرار رہنماؤں کا آپسی اختلاف تھا جس کے سبب احرار دو خیموں میں بٹ گئے۔

احرار کے قیام کے بعد سے ۱۹۴۰ء تک مجلس احرار کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رہے، اس کے بعد انہوں نے صدارت سے استعفیٰ دیدیا۔ ۱۹۴۰ء کے آخر میں مولانا لدھیانوی سول نافرمانی کے جرم میں نظر بند کر دیے گئے، فوراً بعد احرار کے عظیم رہنما چودھری افضل حق کا بھی انتقال ہو گیا۔

چودھری افضل حق کے انتقال اور مولانا لدھیانوی کے جیل چلے جانے کی وجہ سے مولانا مظہر علی احرار کے قائد اعظم بن گئے اور مسلم لیگ کے حامی بن کر فرمانے لگے کہ جناح پر کوئی تنقید نہیں کی جائے گی اور پاکستان اسکیم کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔ مولانا مظہر علی کا یہ نظر گرچہ درست تھا، لیکن احرار کے نظریہ کے منافی تھا۔ پھر جب ۱۹۴۶ء کے اسمبلی انتخاب کے دوران مولانا مظہر علی نے کانگریس کی حمایت کے لیے ایک خطیر رقم لے لی اور جب اس راز کا افشا ہو گیا تو مولانا مظہر علی نے احرار سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کر لی۔

حکومت انگریز کی خفیہ رپورٹ اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں:

''مجلس احرار کی موجودہ تقسیم کی اہم وجہ احرار کے ایک طبقے کا فیصلہ ہے جس کی نمائندگی مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا داؤد غزنوی کر رہے تھے اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ سول نافرمانی کا پروگرام کانگریس کے ساتھ مل کر کی جائے۔ احرار کا دوسرا طبقہ جس کی نمائندگی مولانا مظہر علی اور چودھری افضل حق کر رہے تھے، جن کا موقف تھا کہ مجلس احرار اپنی الگ شناخت قائم رکھے۔ یہ طبقہ پچھلے کچھ دنوں سے مسلم لیگ سے زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ یہی طبقہ اس وقت احرار کی سیاست پر غالب ہے..... احرار کی اکثریت ظاہری طور پر مسلم لیگ کی حمایتی معلوم ہوتی ہے، جو کہ واحد مسلم تنظیم ہے، جس کے پاس پاکستان کی شکل میں ایک یقینی پروگرام ہے۔ ..... احرار کا وہ طبقہ جو مسلم لیگ کا حامی ہے وہ بھی زیادہ مضبوط ہے، احرار کے اس طبقے

---

[1] اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۵ء، طبع اول

کے جیل میں ہونے کی وجہ سے جو کانگریس کا حمایتی ہے''[1]

مولانا مظہر علی کے استعفیٰ کے بعد احرار میں صرف مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ہی شخصیت رہ گئی تھی جو احرار کو پھر سے سنبھال سکتے تھے، لیکن آپسی اختلاف اتنے بڑھ گئے تھے کہ کچھ ہی دنوں بعد مولانا لدھیانوی کو بھی احرار سے استعفیٰ دے کر الگ ہونا پڑا۔

اس ضمن میں مولانا لدھیانوی کا خط مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام ہے جس کا اقتباس تحریر کیا جاتا ہے:

''۲۳/ مارچ ۱۹۴۷ء کو مجلس احرار ہند کی مجلس عاملہ نے جس میں ۲۱ ممبران میں سے ۷ حاضر تھے، جس طریقہ کار کا اعلان کیا اور جس طریقہ سے اس کی تشریحات غیر ذمہ دارانہ طور پر اخبار آزاد کے ذریعہ سے کی گئی ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں ایسے حالات میں مجلس احرار کے دوستوں سے مل کر کام کرنے سے معذور ہوں، لہٰذا مجلس احرار کی نائب صدارت اور ابتدائی رکنیت سے علیحدہ ہوتا ہوں۔

ماسٹر تاج الدین صاحب سے اس سلسلہ میں میں نے جو گفتگو کی تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اب تمہارے لیے استعفیٰ دینا ہی مناسب ہے۔ جن دوستوں اور جس جماعت کے لیے اپنی زندگی کی ہر متاع خرچ کر دی، مجھے دکھ ہے کہ آج انہیں دوستوں نے مجھے جماعت سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا''

دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''.....مجھے مجلس احرار کے دوستوں سے نہ کوئی ذاتی گلہ ہے نہ رنج، بلکہ میں نے اپنی تشریحی چٹھی میں جو کچھ لکھا ہے وہ مجلس احرار کی مجموعی پالیسی اور احرار دوستوں کی بعض ایسی سیاسی آرا کی مخالفت کی ہے جن سے مجھے کسی حال میں بھی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

کاش اب یہ دوست آپ کے ساتھ رہیں، یا آپ ان کو اپنے ساتھ چلا سکیں، کیوں کہ میں واقعات کی بنا پر جانتا ہوں کہ زیادہ دنوں تک احرار کی گاڑی نہ چل سکے گی''۔

---

[1] ہوم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ نیشنل آرکائیوز دہلی، فائل A۔۴۱/D.G/ ۵۹ ستمبر ۱۹۴۱ء

یقیناً مولانا لدھیانوی کے احرار سے الگ ہوجانے کے بعد احرار کی گاڑی زیادہ دنوں نہ چل سکی اور جب ہندوستان کو آزادی ملی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو کچھ ہی دنوں کے بعد تمام احراری کارکن نے پاکستان میں مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا اور احرار کو تبلیغی جماعت قرار دے کر سیاست سے الگ ہوگئے۔

ان احوال وآثار کے باوجود احرار نے اعمال وافکار کی ایک ایسی ترنگ اور امنگ پیدا کی جس نے پنجاب کی شہری زندگی کو ایک نیا ذوق عطا کیا اور وہ صوبہ جو محض انگریزوں کا خوشہ چین ہوکر رہ گیا تھا ان کے استعمار کا نکتہ چین ہوگیا۔ احرار نے اپنی خامیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، جن کی جھلک آج بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔

ذیل میں مجلس احرار کی چند خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس طرح ہیں:

۱۔ احرار نے پنجاب کی استعماری روایت کے برعکس ایک ایسی روایت پیدا کی جس کا مقصد غیر ملکی غلامی کے خلاف جدوجہد کی روح پیدا کرنا تھا اور وہ روح ایک محدود جماعت ہی میں سہی لیکن پیدا ہوگئی۔

۲۔ احرار نے مسلمانوں میں آزادی کی لگن عام کی جس سے مسلمان نوجوانوں میں ایک فعّال عنصر پیدا ہوگیا، جس نے خطابت وسیاست کے میدانوں میں نام پیدا کیا اور تحریک آزادی میں اپنا فرض ادا کیا۔

۳۔ سیاست میں مذہبی رنگ پیدا کیا۔ پہلے صرف مرکز اور صوبوں کی سیٹوں پر بات چیت ہوتی تھی۔ اب مذہب بھی سیاست میں گھس گیا۔ گویا مذہبی سیاست کو احرار نے یہاں سب سے پہلے متعارف کرایا۔

۴۔ استعمار سے عناد کے علاوہ احرار نے جو سب سے بڑا کام کیا یہ تھا کہ پنجاب میں علماء کا وقار گرتی ہوئی دیوار تھا۔ احرار نے ان کی عزت کا تحفظ وتعین کیا۔

۵۔ احرار کو میدان میں آنے کے بعد غریب لوگوں کو پہلی مرتبہ حوصلہ ہوا کہ سیاست ''گھوڑوں کی ریس'' کا نام نہیں ہے کہ بڑے بڑے لوگ ہی اسے دفع الوقتی یا فارغ لمحات گذارنے کا ایک مشغلہ سمجھیں، بلکہ سیاست کے دروازے ہر غریب کے لیے کھلے ہیں اور وہ حتی المقدور قومی معاملات میں بہتر سے بہتر خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عالمی سیاست میں درمیانی طبقہ اور غریب آدمی نے تاریخ ساز کردار پیش کیا ہے۔ مجلس احرار نے پنجاب کے جیالے رضا کاروں، سرحد کے پٹھانوں، یوپی اور دہلی کے

دانش وروں اور بنگال کے جذباتی مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے درمیانی طبقہ کے لیے ترقی کے دروازے کھول دیے اور انہیں احساس کمتری سے نجات دلا کر دانش وروں، عالموں اور رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

۶۔ احرار نے جماعتی حیثیت سے جن تحریکوں کو پروان چڑھایا۔ نیز قید و بند کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے جس قدر لاتعداد رضا کار بھرتی کیے، ہندوستان کی تمام جماعتوں نے کسی مشترکہ کاز کے لیے متحد ہو کر بھی اتنے رضا کار فراہم نہیں کیے۔ تحریک کشمیر کے سلسلہ میں مجلس احرار نے صرف پنجاب سے پچاس ہزار رضا کاروں کی ایک بہت بڑی فورس پیش کر کے تمام سیاسی جماعتوں اور حکمراں طبقہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ چناں چہ تحریک کشمیر کے بعد ہی سے احرار کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا گیا۔

۷۔ احرار نے پہلی مرتبہ یہ تاثر دیا کہ کسی تحریک کی کامیابی کے لیے مال و دولت کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ بہادر انسانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

۸۔ احرار وہ واحد جماعت تھی جس نے اپنے اکابر سے سیاسی مسائل پر اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں اپنے لیے ایک علیحدہ راہ متعین کر لی۔ مجلس احرار کے راہنما، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر اکابرین جمعیۃ علماء ہند کا از حد احترام کرتے تھے اور یہ احترام بہ یکطرفہ نہیں تھا، تاہم یہ لوگ ان کی علمی وجاہت اور تقویٰ و پرہیز گاری کے نہ صرف ثنا خواں تھے، بلکہ معتقد تھے، جس کی وجہ سے روحانی تعلق اور احترام باہمی موجود رہا اور اسی احترام اور روحانی تعلق کی وجہ سے بعض انگریز زدہ اور کور چشم جماعتوں اور نام نہاد لیڈروں نے احرار کو ہمیشہ مطعون کیا، احرار نے ہمیشہ اس طعنہ زنی کو اپنے لیے یہ کہہ کر اعزاز سمجھا کہ ان کا تعلق روحانی ایسے اکابر سے جا ملتا ہے جو فرنگی کے کبھی وفادار نہیں رہے، بلکہ انگریز کے جانی دشمن رہے، نیز ان کا تعلق ایسے اولوالعزم انسانوں سے ہے، جن کا ظاہر و باطن ایک پکّے مسلمان کا ہے، اس لیے انہوں نے کبھی ان ''مطاعن'' کو پرِ کاہ وقعت نہیں دی۔

مجلس احرار نے اپنی شبانہ روز مجاہدانہ مساعی، خداداد صلاحیتوں اور مذہبی رنگ میں انگریز کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات اس شدت سے بھڑکائے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ملتا، یہ

واحد جماعت ہے جس نے انگریزوں کے قیام کی مدت کو مزید گھٹا دیا اور انگریز اپنا بوریا بستر باندھنے پر وقت سے پہلے تیار ہوگیا۔ تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والے اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ پنجاب انگریزی مفادات کا سب بڑا نگہبان اور محافظ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب انگریزی سیاست کے قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ احرار نے انگریز کا پنجاب سے زور توڑا اور ۱۹۳۱ء میں ایک ایسی عوامی تحریک جس میں ننانوے فیصد مسلمان شامل تھے شروع کر کے مہاراجہ کشمیر اور انگریز کو حیرت میں ڈال دیا۔

۱۰۔ تحریک کشمیر چلانے کا سہرا صرف مجلس احرار کے سر ہے، اس تحریک کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے، احرار کی دور بین نگاہ نے کشمیر کے مستقبل کے متعلق بعض سازشوں کا پتہ چلالیا، جس میں قادیانیوں کی یہ سازش شامل تھی کہ وہ قادیان کو اپنے مستقبل کا مستقر بنانا چاہتے تھے اور آگے چل کر قادیانی اسٹیٹ بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر بنانا مقصود تھا۔ اس منصوبہ کی تکمیل میں احرار آڑے آگئے اور مزاحمت کرنے لگے، انہوں نے کشمیر کمیٹی جس کے صدر بشیر الدین محمود تھے اور علامہ اقبال (جو اس کمیٹی کے رکن تھے) کو مجبور کردیا کہ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیں، قادیانیوں کی سازش یوں بے نقاب ہوگئی جس کا سہرا مجلس احرار کے سر ہے۔

۱۱۔ احرار اسلام ہند میں وہ پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے مسلمانوں کے مسلّمہ فرقوں کے مابین رواداری، میل جول اور محبت و اخوت کا جذبہ نہ صرف پیدا کیا، بلکہ انہیں جنگ آزادی کے لیے اتحاد و اتفاق کی ایک لڑی میں پرو کر رکھدیا، لہٰذا اسے ایک معمولی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔ کیوں کہ انگریز کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ مسلمانوں میں معمولی اختلافات کی وجہ سے دائمی مفارقت موجود رہے۔[۱]

احرار نے مختلف فرقوں میں جذبہ آزادی پیدا کرنے کی ساتھ ساتھ باہمی یگانگت، احساس رواداری اور باہمی احترام کا جذبہ پیدا کیا۔ چناں چہ ایک ہی اسٹیج پر حنفی، اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور شیعہ وغیرہ کے جید علماء نمودار ہوئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا سید فیض الحسن شاہ، چودھری افضل، شورش کاشمیری اور مولانا مظہر علی اظہر اکٹھے اٹھتے بیٹھتے نظر آئے۔ انگریز کے مقابلے میں مسلمان فرقوں میں اس قسم کی یگانگت و مفاہمت پیدا کرنا جوئے شیر

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیں، سوانح حیات قاضی احسان احمد شجاع آبادی، محمد نور الحق قریشی، مکتبہ احسان ملتان ۱۹۷۲ء

لانے سے کم نہیں تھا۔ تاہم مجلس احرار کے کارناموں میں یہ کارنامہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

۱۲۔ احرار نے سب سے پہلے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے مساویانہ حقوق کا مطالبہ کیا اور کہا کہ یہ مساوات مرکز اور صوبوں کی اسمبلیوں سے لے کر زندگی کے ہر میدان اور سطح پر ہونی چاہیے۔ جب کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ بھی آبادی کے تناسب کی حد تک مسلمانوں کے حقوق کی علم بردار تھی۔

۱۳۔ جس باب میں تاریخ اسلام ان کی شکر گذار ہوگی وہ قادیانیت کا تعاقب اور اس کی سرکوبی ہے، احرار نے اسی جماعت غدار کا جس بے جگر سے مقابلہ کیا کہ اس کے نتائج اسلام اور مسلمان دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئے مثلاً:

الف قادیانیت لفظاً و معناً بے نقاب ہوگئی، مسلمانوں نے محسوس کیا کہ اس کا وجود ان کی وحدت اور اسلام کی مرکزیت کے لیے مہلک و مضر ہے۔

ب قادیانیت کا تبلیغی دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا، عامۃ المسلمین اس کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

ج قادیانیت کا مذہبی وجود اپنے سیاسی خدو خال سمیت آشکار ہوگیا، جس سے اسلام مصئون اور مسلمان محفوظ ہوگئے۔

غرض مجلس احرار اسلام کے کارنامے بہت عظیم ہیں ان کے اندر خامیاں بھی تھیں لیکن ان کے کارنامے زیادہ اہم تھے۔ احرار کی کمزوریاں انسانوں کی کمزوریاں تھیں، ان کمزوریوں سے انسان کبھی خالی نہیں رہ سکتا، لیکن احرار کی خوبیاں قدرت کا انعام تھیں۔ دنیا نے ان کے بارے میں سبھی کچھ کہا ہے، لیکن تاریخ ان کے بارے میں ابھی صحیح تجزیہ نہیں کرسکی۔ ہار جانا کوئی شئے نہیں، اصل شے لڑ جانا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں جہاں تک استبداد و ارتداد سے لڑ جانے کا سوال ہے کوئی سی جماعت اس تاب و توانائی کے انسان پیدا نہیں کرسکی ہے۔

☆ ☆ ☆

مصادر و مراجع

(۱) قرآن

(۲) بخاری

(۳) ابوداؤد

(۴) مرزا غلام احمد، آئینہ کمالات اسلام، مطبع ریاض ہند قادیان، ص:۶۶

(۵) ابوظفر ندوی، تاریخ سندھ، معارف اعظم گڑھ

(۶) اثر بن یحییٰ، مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری، نورانی پریس مالیگاؤں، ۱۹۸۲ء

(۷) اختر راہی، تذکرہ علماء پنجاب، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء، ج:۱

(۸) اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۵ء، طبع اول

(۹) مرزا غلام احمد، ازالۂ اوہام، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، ۱۹۰۰ء، ج۲، ص:۲۷۵

(۱۰) ازہر شاہ قیصر، حیات انور، محبوب المطابع برقی پریس دلی، ۱۹۵۵ء

(۱۱) اسرار احمد آزاد، گاندھی، ۱۹۴۸ء

(۱۲) بی۔آر۔نندا، مہاتما گاندھی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں دہلی، ۲۰۰۲ء طبع ثانی

(۱۳) پروین روزینہ، جمعیۃ علماء ہند، فیض الاسلام پرنٹنگ پریس راول پنڈی، ج، اول

(۱۴) // // // // // // ج، دوم

(۱۵) پنڈت سندر لال، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

(۱۶) ترجمان دارالعلوم، مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر، جے۔آر پرنٹرز دہلی

(۱۷) جانباز مرزا، حیات امیر شریعت، لاہور، ۱۹۶۹ء

(۱۸) جانباز مرزا، کاروان احرار، تجارت پرنٹرز لاہور، ۱۹۷۵ء ج اول

(۱۹) جانباز // // // // // ج دوم

(۲۰) جانباز // // // // // ج سوم

(۲۱) جانباز // // // // //ج چہارم
(۲۲) جانباز // // // // //ج پنجم
(۲۳) حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سب سے پہلا فتوائے تکفیر، کتب خانہ اختری سہارنپور یوپی، ۱۹۹۸ء
(۲۴) مرزا غلام احمد، حقیقۃ الوحی، ص: ۳۹۰-۳۹۱
(۲۵) خطبات وقراردادیں، احرار اسلام کانفرنس لاہور، ۱۹۳۱ء
(۲۶) خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۸ء
(۲۷) خلیق احمد نظامی، ۱۸۵۷ء کا تاریخی اور روزنامچہ، الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۹۵۸ء
(۲۸) خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۵۰ء
(۲۹) خلیق انجم، مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۶ء
(۳۰) خواجہ غلام السیدین، آندھی میں چراغ، انڈین اکیڈمی دہلی، ۱۹۶۲ء
(۳۱) خورشید مصطفیٰ رضوی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مکتبہ برہان دہلی، ۱۹۵۹ء
(۳۲) ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ، اشتیاق پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۱ء
(۳۳) ڈاکٹر پی۔ این چوپرا، انڈین اسٹریگل فار فریڈم رول آف ایسوسی ایٹ مومنٹ، آگھم پرکاش، ۱۹۸۵ء
(۳۴) ڈاکٹر سنجیدہ خاتون، بیسوی صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین، بھارت آفسیٹ دہلی، ۲۰۰۴ء
(۳۵) ڈاکٹر صلاح الدین، دلی والے، ثمر آفسیٹ پرنٹر دہلی، ۱۹۸۸ء
(۳۶) رئیس احمد جعفری، دید وشنید، عظیمی پرنٹرز کراچی، ۱۹۸۷ء طبع ثانی
(۳۷) سعید نفیسی، لباب الالباب، طبع ایران، ۱۳۳۳ھ
(۳۸) سید ابراہیم فکری، ہندوستانی مسلمانوں کا جنگ آزادی میں حصہ، لبرٹی آرٹ پریس دہلی، ۱۹۹۶ء
(۳۹) سید سلیمان ندوی، یادرفتگاں، مکتبہ المشرق کراچی، ۱۹۵۵ء
(۴۰) سید غلام حسن کاظمی، انقلاب کشمیر
(۴۱) سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، جید پریس بلی ماران دہلی، ۱۹۷۸ء، ج:۲
(۴۲) شورش کاشمیری، بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل، چٹان پرنٹنگ پریس لاہور، ۱۹۹۶ء
(۴۳) شورش کاشمیری، چہرے، مکتبہ ماحول کراچی، ۱۹۶۵ء
(۴۴) شورش کاشمیری، خطبات احرار، مکتبہ احرار لاہور، ۱۹۴۴ء
(۴۵) صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم مملوکیہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء
(۴۶) صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلق پر ایک نظر، معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۶ء

(۴۷) ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۰ء
(۴۸) ضیاء عظیم آبادی، پنڈت نہرو، الماس بکڈ پو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء
(۴۹) ظفر علی خان، نگارستان،
(۵۰) عابدہ سمیع الدین، ہندوستانی کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، ۱۹۹۰ء
(۵۱) عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۸ء طبع سوم
(۵۲) عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، اجالا پریس کلکتہ، ۱۹۶۰ء
(۵۳) عبدالشاہد خاں، باغی ہندوستان، مکتبہ قادریہ لاہور، ۱۹۷۸ء
(۵۴) عبدالقوی دسنوی، حیات ابوالکلام آزاد، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۰ء
(۵۵) عبداللطیف قدسی، آزادی کی تحریکیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۸ء
(۵۶) عزیز الرحمٰن جامعی، جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین، اعلیٰ پریس بلی ماران دہلی، ۱۹۷۵ء
(۵۷) عزیز الرحمٰن جامعی، درحدیث دیگراں، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۷۵ء
(۵۸) عزیز الرحمٰن جامعی، رئیس الاحرار، اعلیٰ پریس دہلی، ۱۹۶۱ء
(۵۹) عزیز الرحمٰن جامعی، صبح امید، سنگم کتاب گھر دہلی، ۱۹۵۹ء
(۶۰) عطاء الرحمٰن قاسمی، پنجاب و ہریانہ کی تاریخی مساجد، پنجاب وقف بورڈ، ۲۰۰۰ء
(۶۱) علامہ محمد اسحٰق قاسمی، تذکرہ مدرسہ اسلامی میرٹھ، المکتبۃ القیمہ کراچی
(۶۲) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، بیان اللسان، مکتبہ علمیہ میرٹھ، ۱۹۷۷ء
(۶۳) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، قاموس القرآن
(۶۴) گوپی چند نارنگ، ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء، اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۶ء
(۶۵) مرزا غلام احمد، لیکچر سیالکوٹ، مطبع مفید عام پریس سیالکوٹ، ص: ۲۵
(۶۶) محمد احمد رحمانی، مضامین رئیس الاحرار، حبیب روڈ لدھیانہ، ۱۹۶۷ء
(۶۷) محمد الیاس برنی، قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، عمدۃ المطابع لکھنؤ، ۱۳۵۲ھ
(۶۸) محمد رضوان اللہ، انور شاہ کشمیری حیات اور علمی کارنامے، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۷۴ء
(۶۹) محمد سلمان منصور پوری، تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، شیروانی آرٹ پرنٹرز دہلی، ۱۴۲۳ھ
(۷۰) محمد سلیم، علامہ اقبال کی سیاسی زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء
(۷۱) محمد منظور نعمانی، قادیانیت، تنویر پریس لکھنؤ، ۱۹۶۵ء
(۷۲) محمود علی خاں، مجلس احرار کی ضرورت و اہمیت، ہمدرد پریس سہارنپور

(۷۳) مرزا غلام احمد، شہادۃ القرآن، پنجاب پریس سیالکوٹ، طبع ثانی
(۷۴) مسٹر ساورکر، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، راجدھانی گرانتھ دہلی، ۱۹۷۰ء
(۷۵) مرزا غلام احمد، معیار المذاہب، بحوالہ: حقیقۃ الوحی، مطبع میگزین قادیان، ۱۹۰۷ء، ص: ۸۵
(۷۶) مفتی عزیز الرحمٰن، تذکرہ مشائخ دیوبند، دالتالیف بجنور، ۱۹۶۷ء
(۷۷) مولانا ابوالحسن ندوی، سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری، تنویر پریس لکھنؤ، ۱۳۸۳ھ
(۷۸) مولانا ابوالحسن ندوی، سیرت سید احمد شہید، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۸۷ء
(۷۹) مولانا ابوالحسن ندوی، قادیانیت مطالعہ و جائزہ، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۶۶ء
(۸۰) مولانا انظر شاہ، لالہ گل، شاہ اکیڈمی دیوبند، ۲۰۰۰ء
(۸۱) مولانا تقی الدین ندوی، صحبت با اولیاء، جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء
(۸۲) مولانا حسین احمد مدنی، نقش حیات، مکتبہ دینیہ دیوبند، ۱۹۵۴ء ج: ۲
(۸۳) مولانا عظمت اللہ ملیح آبادی، حیات آزاد، انصاری پریس دہلی، ۱۹۴۰ء
(۸۴) مولانا محمد میاں، علماء حق، الجمعیۃ بکڈپو دہلی، ۱۳۶۵ھ، ج: ۲
(۸۵) مولانا طیب لدھیانوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مخطوطہ
(۸۶) مولانا محمد میاں، علماء حق، پرنٹنگ ورکس دہلی، ۱۹۴۶ء، ج: ۱
(۸۷) نور احمد میرٹھی، شخصیات میرٹھ، ادارہ فکر نو کراچی، ۲۰۰۳ء
(۸۸) ویلفر ڈیسنٹ ویل اسمتھ، موڈرن اسلام ان انڈیا، اوشا پبلیکیشنز نئی دہلی، ۱۹۷۹ء
(۸۹) ہوم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ، نیشنل آرکائیوز دہلی، فائل ۹/ ۱۹۴۱ء
(۹۰) ہوم پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ، نیشنل آرکائیوز دہلی، فائل ۱۹۳۲ء

اخبار و رسائل

(۱) پندرہ روزہ الحبیب لدھیانہ، مئی ۱۹۶۲ء
(۲) ماہنامہ الرشید لاہور، دارالعلوم دیوبند نمبر،
(۳) ماہنامہ برہان، نئی دہلی، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء
(۴) ماہنامہ ترجمان دارالعلوم، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء
(۵) ماہنامہ فاران، جنوری ۱۹۵۷ء
(۶) ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء

(۷) پندرہ روزہ الاحرار، ۱۵/اپریل ۲۰۰۴ء
(۸) روزنامہ اسٹیسمین بنگال، ۴/مئی ۱۹۳۲ء
(۹) روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۴/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۱۰) روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۲۲/فروری ۱۹۳۲ء
(۱۱) روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۵، فروری ۱۹۳۲ء
(۱۲) روزنامہ انقلا لاہور ۱۲/دسمبر ۱۹۳۱ء
(۱۳) روزنامہ انقلاب بمبئی، ۴/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۱۴) روزنامہ انقلاب لاہور، ۸/جون ۱۹۳۵ء
(۱۵) روزنامہ پرتاپ دہلی، ۵/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۱۶) روزنامہ پیام وطن، ۳/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۱۷) روزنامہ خدمت منٹگمری، ۵/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۱۸) روزنامہ سماج لدھیانہ، ۶/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۱۹) روزنامہ سنسار دہلی، ۴/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۲۰) روزنامہ ملاپ دہلی، ۵/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۲۱) روزنامہ نوائے پاکستان، ۶ستمبر ۱۹۵۶ء
(۲۲) روزنامہ نئی دنیا دہلی، ۴/ستمبر ۱۹۵۶ء
(۲۳) ویکلی تیج دہلی، ۴/ستمبر ۱۹۵۶ء